

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

# جماعہ اسلامی

جماعت اسلامی

## پہچانتے

مُرتَّبِ

حکیم محمد اسلم خان



حقوق طبع و حق مؤلف محفوظ

سال اشاعت	۱۹۸۶ء
تعداد	ایک ہزار
مطبع	لکشمی پرنٹنگ ورکس دہلی
قیمت	۲۵ روپے

شائع کردہ

دارالکتاب

۱۴۸۸ پیٹودی ہاوس، دریا گنج نئی دہلی۔



# ترتیب

افتتاحیہ

مرتب

حدیث نبوی پر شکوک و شبہات

حضرت مولانا ابوفانار اللہ امرتسری<sup>۲</sup>

مسجد اہل حدیث کی امامت کا معاملہ

مولانا ابوالکلام آزاد<sup>۲</sup>

مولانا محی الدین احمد قصوری<sup>۲</sup>

مولانا مودودی کی تعبیرات قرآن و حدیث کی روشنی میں

حضرت مولانا حافظ محمد صاحب گوندھلوی<sup>۲</sup>

مودودی کا مسلک

حضرت مولانا عبداللہ محدث روپڑی<sup>۲</sup>

جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب گوجرانوالہ

عقائد و افکار مودودی

مولانا محمد داؤد راز مرحوم

جماعت اسلامی کے دین کا خلاصہ

صوفی نذیر احمد کاشمیری<sup>۲</sup>

جماعت اسلامی اور اس کے بانی

مولانا حکیم عبید اللہ رحمانی

جماعت اسلامی اور بانی جماعت اسلامی

حکیم اجل خاں

# افْتِحَیَّہ

مجلہ اہل حدیث کے اجرا کے بعد میں نے اس کی توسیع و اشاعت نیز اہل جماعت سے براہ راست ربط قائم کرنے کے لئے جو ملک گیر سفر کئے ان میں مجھے اس بات کا مشن سے احساس ہوا کہ حاکمین مسلک عمل بالحدیث کی بڑی تعداد جماعت اسلامی سے متاثر ہے اور وہ جماعت اسلامی و بانی جماعت اسلامی کے افکار و خیالات کے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ کہ اہل حدیث اور جماعت اسلامی میں کوئی فرق نہیں اور اس کے ساتھ اشتراک و تعاون میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتی ہے، کہیں کہیں تو عملاً اس کی اشاعت و تبلیغ میں بھی لگی ہوئی ہے۔ اور کارپردازان جماعت اسلامی بھی ایسا تاثر قائم کر رہے ہیں، کہ جماعت اسلامی اور اہل حدیث میں کوئی فرق نہیں ہے۔

بعض جگہ ایسی شکایات بھی ہیں۔ کہ اہل حدیث مساجد کے امام جماعت اسلامی سے متاثر ہو گئے ہیں۔ اور وہاں انھوں نے جماعت اسلامی کے مشن کا پرچار شروع کر دیا۔ یا اس کے کوئی رکن و مہم درد ہوشیاری سے اہل حدیث مسجد کے امام بن گئے اور اس نے مسجد کے منبر کو قرآن و حدیث کی دعوت پیش کرنے کے بجائے جماعت اسلامی کی دعوت کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا، جس سے بعض مساجد میں، اہل جماعت انتشار اور فتنوں کا شکار ہوئے، ہندوستان میں اس نوعیت کا پہلا واقعہ مالیر کوٹلہ پنچائیں پیش آیا تھا جہاں اہل حدیث مسجد کی امامت کا قضیہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے سپرد ہوا جس پر مولانا مرحوم نے بڑا اصولی فیصلہ دیا۔ کہ مساجد صرف قرآن و حدیث کی دعوت و اشاعت کے لئے مخصوص ہیں، ان میں کسی جماعت یا کسی شخص کے خود ساختہ نظریات و افکار کی اشاعت نہیں ہونی چاہئے۔ اور اہل حدیث مسجد میں صرف ایسا امام ہو جو اس کے منبر پر قرآن و حدیث کی دعوت پیش کرے۔



واقعہ تو یہ ہے کہ دنیا کی ساری مساجد کی امامت کے لئے ہی اصول ہوا اور کسی بھی مسجد کو کسی خاص نظریے کی تعلیم و تبلیغ کا ذریعہ نہ بننے دیا جائے اس صورت میں سارے مسلمان ساری مسجدوں میں نماز ادا کر سکیں گے اور کوئی مسجد بھی کسی خاص فرقے کے ساتھ منسوب نہیں رہے گی مگر خود ساختہ مذاہب کا تعصب، تشدد، ضد، ہٹ دھرمی ہمیشہ ہی اس میں مانع رہی ہے اور آئندہ بھی ایسے آثار نہیں دکھائی دیتے۔ کہ مسلمان اس اصول پر عمل کریں؟

مالیر کوٹہ کے اس واقعے کے بعد بھی، جماعت اسلامی سے متفق حضرات کہیں کہیں اہل حدیث مساجد و مدارس کی امامت، مدرسے اور ان کی انتظامی کمیٹیوں میں گھس کر اپنے مشن کو پھیلاتے رہے جس سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ جماعت اسلامی حاملین مسلک اہل حدیث پر خاص نظر رکھے ہوئے ہے، وہ اس جاندار اور متحرک گروہ کو اپنے اندر ضم کر کے اپنے آپ کو فعال بنانا چاہتی ہے اور سلف صالحین کے صحیح منہج و دینی مشن سے انھیں ہٹا دے رہی ہے، اس تسلسل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جماعت اہل حدیث کے فعال اور متحرک افراد اپنے مسلک اور مشن کو خیر باد کہہ کر جماعت اسلامی کی صفوں میں جا بیٹھنے لگے۔ حاملین مسلک قرآن و سنت کی صفیں سونی ہوئے لگیں، اور متحد دین کی صفوں کی رونق بڑھنے لگی، جو دین حق کے لئے کسی طرح بھی مفید بات نہیں ہو سکتی اس احساس نے پہلے تو ہمیں اس حقیقت کے آشکارا کرنے پر آمادہ کیا کہ ہم اہل جماعت کو یہ بتائیں کہ مسلک اعتصام بالکتاب والسنن ہی حق ہے، اور اہل حدیث افراد کو کہیں بھی ادھر ادھر حجاب نکلنے کی ضرورت نہیں ہے بانی جماعت اسلامی کے افکار و نظریات اور دینی تفہیم و تشریح علمائے سلف صالحین سے قطعاً مختلف ہے، ان میں تجدد، اعتزال، تحفیف حدیث، اعانت صحابہ، مصلحت پرستی، تشیع پسندی کے جراثیم بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اقامت دین اور حکومت الہیہ محض نعرے ہیں۔ دین کے فطری تقاضوں، صحت عقیدہ و عمل، اصلاح معاشرہ، اور طریق علی منہاج النبوت کی تکمیل کے بغیر صحیح دینی اسلامی حکومت کا قیام ممکن نہیں! مولانا مودودی صاحب سیاسی جماعتوں اور تحریکوں کے طرز پر جماعت بندی کر کے جو حکومت الہیہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کی خوش فہمی ہے۔



ہمارے اس اظہارِ حقیقت کا بڑا فائدہ یہ ہوا، کہ اہل جماعت بالخصوص نوجوان افراد نے یہ بات سمجھنے کی کوشش کی، کہ کیا واقعی طور پر وہ غلط راستے پر تو نہیں جا رہے ہیں؟ اس کے بعد ہی اس بات کی طلب محسوس ہوئی، کہ کچھ ایسی کتابیں اور لٹریچر بھی ہونا چاہئے، جس میں جماعت اسلامی اور بانی جماعت اسلامی کے افکار کا سنجیدگی سے جائزہ لیا گیا ہو۔ تاکہ وہ وقت ضرورت کام آ سکے اور قارئین صحیح طور پر یہ اندازہ کر سکیں، کہ فی الواقع جماعت اسلامی اور بانی جماعت اسلامی کے افکار و خیالات اور دینی تفہیم و تشریح مسلک سلف صالحین سے مختلف اور متضاد ہے۔

اس ضرورت نے راقم الحروف کو اس بات پر آمادہ کیا، کہ اس موضوع پر ایک ایسی کتاب مرتب کرے جو اپنی جماعت کے اکابر علمائے کرام کی تحریرات پر مشتمل ہو، جب اس قسم کی کتاب مضامین، اور مقالات کی تلاش شروع ہوئی، تو الحمد للہ کافی مواد مل گیا، جسے دیکھ کر یہ اندازہ بھی ہوا کہ اپنی جماعت کے اکابرین ہی اس سجدہ پسندی کی قلعی کھولنے میں پیش رو رہے ہیں، اور حضرت مولانا شہر اللہ امرتسریؒ، حضرت مولانا حافظ محمد صاحب گوندھلویؒ، حضرت مولانا عبداللہ صاحب محدث روپڑیؒ، حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب گوجرانوالہ چاروں بزرگ تو بہت پہلے اور سیر حاصل لکھ چکے ہیں۔

حضرت العلامة حافظ محمد گوندھلویؒ کی تنقید المسائل دیکھنے کے بعد یہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی۔ وہ کہ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ”نامی کتاب کی نشاندہی پہلے دوسرے حضرات نے فرمائی ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے، کہ حافظ صاحب مرحوم و مغفور بعض مصنفین سے بہت پہلے مودودی صاحب کی چار بنیادی اصطلاحات کی غلط تفہیم و تشریح کا جائزہ اور اس کا مسکرت رد لکھ چکے ہیں۔ ان تمام نگارشات کو جمع کرنے میں بڑی دشواری اور تاخیر بھی ہوئی۔ تاہم یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام پایا۔ ان تمام تحریرات کو موضوع کے حساب سے ترتیب دیا، تاکہ تکرار کم ہو جائے اور قارئین کو سارے عنوانات پر تحقیق و تجزیہ بخوبی مل جائے۔

حضرت مولانا شہر اللہ امرتسریؒ، حضرت مولانا عبداللہ محدث روپڑیؒ اور حضرت



مولانا اسماعیل صاحب گوہر انوار کے مضامین میں مولانا مودودی صاحب کے نظریہ تخفیف حدیث کا رد کیا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت حافظ محمد صاحب گوہر مصلوی مرحوم کے مضمون میں قریب قریب تمام ہی غلط نظریات کا جائزہ لے لیا گیا ہے۔ صوفی نذیر احمد کاشمیری مرحوم نے قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں کے معنی و مفہوم کی دھجیاں بکھیر دی ہیں، اسی طرح مولانا محمد اؤدراز صاحب مرحوم نے بعض احادیث کے سلسلے میں مودودی کی غلط تاویلات کا رد فرمایا ہے۔

غرض اس کتاب کی مدد سے اہل تحقیق مودودی صاحب کے غلط عقائد و خیالات سے بخوبی واقف ہو سکتے ہیں، اور وہ حضرات جو جماعت اسلامی کی سیاست پسندی، تجدد وغیرہ سے متاثر ہیں۔ علماء اہل حدیث کی گراں قدر تحقیقی سے بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔

نئی نئی تنظیموں اور اسلام کے جدت پسند داعیوں نے 'اسلامی عقائد و احکام پر اپنی من پسند تفہیم و تشریح کی جو کلبھاڑی چلائی ہے۔ اور چلا رہے ہیں، وقت آ گیا ہے۔ کہ یہ کلبھاڑی ان کے ہاتھوں سے چھین لی جائے۔ حالین کتاب و سنت کا فرض ہے۔ کہ جس طرح وہ ہر عہد و دور میں اسلام کو خالص رکھنے کے لئے سر و سر کی بازی لگاتے رہے ہیں۔ آج بھی اُسے ہر قسم کی آویزشوں سے بچائیں اور اس پر کسی قسم کی کوئی آنچ نہ آنے دیں۔ اور اپنے آپ کو ان کی زد سے بچائیں۔ بس اس کتاب کی ترتیب و اشاعت کا یہی مقصد و اولین ہے۔

مجھے امید ہے کہ میری یہ حقیر کاوش دین و مسلک کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوگی۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ

حکیم حبل خان

حضرت مولانا ابوالوفائنا اللہ امرتسریؒ

بِسْمِہِ تَعَالٰی

## حدیث نبویؐ پر شکوک اور شبہات مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے خطاب

”اخبار اہل حدیث مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۵ء سے مولانا مودودی سے خطاب شروع ہوا تھا جو ۳ نومبر ۱۹۴۵ء تک جاری رہا۔ ناظرین اہل حدیث نے اس سلسلے کو پسند کر کے فرمائش کی کہ اس کو کتابی شکل میں متشکل کیا جائے چنانچہ اس مضمون کو رسالہ ہذا کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا مودودی کی نسبت ہمارا گمان غالب ہے کہ آپ سرسید احمد خاں یا مولوی عبد اللہ حکیم الہوی کی طرح حدیث نبویؐ کے منکر نہیں ہیں۔ البتہ حدیث کے متعلق تحقیق کرتے ہوئے آپ محدثین کا مسلک اور طریقہ تنقید چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کا ثبوت ناظرین ان اوراق میں ملاحظہ کریں گے۔

ابوالوفائنا اللہ

صفر المظفر ۱۳۶۵ھ - جنوری ۱۹۴۶ء

مسلمانوں کا اجتماعی عقیدہ ابتداء سے یہی چلا آیا ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ حدیث نبویؐ بھی حجت شرعی ہے۔ خلافتِ اولیٰ کا انعقاد حدیثِ الائمة من القریش ہی کی بنا پر ہوا تھا۔ خلافت منعقد ہونے کے بعد سب سے پہلے اہم مسئلہ وراثتِ نبی علیہ السلام کا پیش ہوا تھا جس میں مدعیہ خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا تھیں اور خلافتِ راشدہ مدعا علیہا تھی۔ اس مسئلہ کا فیصلہ بھی ایک حدیث ہی سے ہوا تھا جس کے الفاظ ہیں:۔ نحن معاشر الانبیاء النورث ما ترکنا صدقة (بخاری اصول کلینی معنی) اس کے بعد میرا اہم مسئلہ خلیفۃ المسلمین کے سامنے پیش آیا تھا یہ بھی حدیث ہی کے ماتحت فیصل ہوا تھا۔



اس کے بعد ہر زمانہ میں حدیث کی حیثیت مسلم رہی۔ فرق اتنا رہا کہ کسی گروہ میں روایات غالب رہیں کسی میں استنباط غالب رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُمتِ مسلمہ میں دو گروہ پیدا ہو گئے محدثین اور فقہاء رحمہم اللہ۔ اس کے بعد بھی اُمتِ مسلمہ میں حدیث کی حیثیت متواتر چلی آئی۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے شہر علی گڑھ میں سرسید احمد خاں مرحوم پیدا ہوئے۔ انھوں نے حدیث کے متعلق انکاری آواز اُٹھائی یعنی یہ کہا کہ حیثیتِ حجتِ شرعی کے قرآن مجید کافی ہے۔ حدیث کی ضرورت نہیں۔ ساتھ ہی اس کے یہ بھی تسلیم کیا کہ روایت کی حیثیت سے صحیح بخاری سب سے اعلیٰ اور مستند ہے۔ اس کے بعد یہ آواز لاہور پہنچی۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی نے اس کو قبول کیا اور اس خیال کی اشاعت میں بہت کوشش کی۔ لاہور کے بعد یہ آواز امرت سر میں پہنچی۔ یہاں بھی چند آدمیوں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔ جنھوں نے اپنا نام اُمتِ مسلمہ رکھا اور کفایتِ قرآن اپنا نصب العین قرار دیا۔ ان سب جماعتوں میں وجوہات عدمِ حجتِ حدیث میں بہت سا اختلاف ہے۔ ان اختلافوں کے متعلق آج ہمارے سُننے نہیں ہے کیونکہ اس کے متعلق ہمارے کئی ایک رسالے راتباع الرسول ذیل الفرقان حدیث نبوی اور تقلیدِ شخصی برہان الحدیث وغیرہ شائع شدہ ہیں۔

آخری دور میں مولانا مودودی صاحب نے قلم اُٹھایا جو پہلی جماعتوں سے تخفیفِ حدیث میں حجتِ استدلال کسی قدر زیادہ قوی ہیں۔ آپ نے بڑی سچائی سے کام لیتے ہوئے ایک موقع پر علمِ حدیث کو واجب العمل تسلیم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ”تفہیمات“ ص ۳۱۷، مگر ساتھ ہی اس کے جب سیدانِ حقیقتیں آئے تو حدیث کے متعلق آپ نے دو شبہات ایسے پیدا کئے جن کو خیالِ خود لا نخل سمجھ کر شائع کیا ہے میں نے ان شبہات کو ان کے خیال میں ”لا نخل“ اس لئے کہا ہے کہ انھوں نے ان شبہات کا جواب نہیں دیا۔ پہلا شبہہ انھوں نے اسماء الرجال کی حیثیت سے کیا۔ آپ کے الفاظ اس بارے میں یہ ہیں۔ (مسلب اعتدال ص ۳۱۷ و قرآن اور سنت رسول ص ۳۷ و ترجمان القرآن)

”محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلم۔ یہ بھی مسلم کہ نقدِ حدیث کے لئے جو مواد انھوں نے فراہم کیا ہے وہ صدرِ اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کارآمد ہے۔ کلامِ اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے وہ بہر حال تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کے لئے جو حدیں فطرۃ اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جاسکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے

اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔“ (تفہیمات ص ۳۱۹)

مولانا مودودی صاحب نے اس اقتباس میں محدثین کی نسبت جو خیال ظاہر کیا ہے۔ اسی

کو مولانا حاکمی مرحوم نے اپنی مسدس میں یوں ادا کیا ہے۔

گروہ ایک جو یا تھا علم نبی کا      لگا پاتہ جس نے ہر مفتری کا  
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا      کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا  
کئے برج و تعدیل کے وضع قائلو      نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

موصوف کے شبہ کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی راوی کی نسبت یقین نہیں ہو سکتا کہ وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی محدث نے اس کو کہا ہے۔ کیونکہ کئی ایک راوی ایسے ہیں کہ ان کو بعض محدثین نے ضعیف کہا ہے اور بعض نے ان کو ثقہ کہا ہے اسی طرح بعض نے ان راویوں کے حق میں اچھے الفاظ کہے اور بعضوں نے بُرے کہے۔ اس لئے کسی راوی کے متعلق کسی جانب یقین نہیں ہو سکتا کہ وہ ایسا ہی تھا جیسا کہ ہم اس کو سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کو اس امر کے فیصلے کے لئے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس کے فیصلہ کے لئے میرا اور آپ کا وجود ہی مثال کے لئے کافی ہے۔ ہم دونوں کو اچھا کہنے والے بھی ہیں اور بُرا کہنے والے بھی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اُستاد غالب مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے !      ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

تو کیا ایسی صورت میں ثالث بالخیر ہمارے حق میں فیصلہ کر کے صحیح رائے قائم کر سکتا ہے یا نہیں کہ ہم کون ہیں۔ ذرا اور اوپر چلئے۔ مولانا اسماعیل شہید اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی نسبت آئے علماء میں بکثرت اختلاف ہے۔ کیا ان آراء کو سامنے رکھ کر آج تک آپ نے کوئی فیصلہ کیا ہے یا نہیں ذرا اور اوپر چلئے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق اُمت میں جو اختلاف ہے وہ بھی آپ سے مخفی نہیں کہ وہ افضل الامۃ تھے یا ر خاک بدین قائل (فرعون اور ہامان) تھے۔ دحیات القلوب شیعہ) کیا اتنے بڑے اختلاف کا فیصلہ بھی آپ نے کبھی کیا ہے یا نہیں ضرور کیا ہو گا۔ اس فیصلہ کی وجوہات کیا ہیں۔ انھیں وجوہات سے راویان حدیث کا فیصلہ بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ محدثین نے اس کے متعلق اصول مقرر کئے ہوئے ہیں۔ اسی لئے محدثین کی بات مولانا حاکمی کا یہ کہنا صحیح ہے۔



رجالہ انسانید کے جو ہیں دفتر! گواہ ان کی آزادگی کے میں یکسر  
 نہ تھا ان کا احساں فقط اہل دین پر وہ تھے اس میں ہر قوم و ملت کے بہر  
 لبرٹی میں جو آج فائق ہیں سب سے یہ بتلائیں لبرل بنے ہیں وہ کب سے

(اہل حدیث ۱۴ ستمبر ۱۳۵۷ء)

مولانا مودودی صاحب نے اس قسط کو بڑے فخر و مباہات سے لکھا ہے یہ سمجھ کر کہ یہ طریق  
 تنقیح گویا ان کی قابلیت کا خاص طرہ امتیاز ہے حقیقت یہ ہے کہ اس طرح سے حدیث کے فن پر  
 سر سید احمد خاں مرحوم علی گڑھ نے بھی حملہ نہیں کیا تھا میں موصوف کی اصلی عبارت نقل کر کے  
 اپنے ناظرین کو عموماً اور ممدوح کے ان احباب کو خصوصاً توجہ دلاؤں گا جو حدیث کے متعلق  
 یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ واجب العمل ہے۔ وہ ذرا غور سے ان عبارتوں کو پڑھیں اور سوچیں  
 کہ ع

ساقی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں

موصوف نے اسماء الرجال جس کا ذکر پہلے آچکا ہے کی بحث کے بعد لکھا ہے  
 ”دوسری اہم چیز سلسلہ اسناد ہے محدثین نے ایک ایک حدیث کے متعلق تحقیق  
 کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے آیا وہ اس کا ہم سر  
 تھا تو اس سے ملا بھی یا نہیں اور ملا تھا تو آیا اس نے یہ خاص حدیث خود سنی یا کسی  
 اور سے سُن لی اور اس کا حوالہ نہیں دیا۔ ان سب چیزوں کی تحقیق انھوں نے اسی  
 حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے۔ مگر لازم نہیں کہ ہر راویت کی  
 تحقیق میں یہ سب اُمور ان کو ٹھیک ٹھیک ہی معلوم ہو گئے ہوں بہت ممکن ہے  
 کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں وہ درحقیقت منقطع ہو اور  
 انھیں یہ معلوم نہ ہو سکا ہو کہ بیچ میں کوئی ایسا مجہول الحال راوی پھوٹ گیا ہے  
 جو ثقہ نہ تھا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جو روایتیں مُرسل یا منقطع یا منقطع  
 ہیں اور اس بناء پر پایہ اعتبار سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہیں ان میں سے بعض  
 ثقہ راویوں سے آئی ہوں اور بالکل صحیح ہوں۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن کی بناء پر اسناد اور جرح و تعدیل کے علم

کو کلیتہً صحیح نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابل اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبویؐ اور آثارِ صحابہ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔ (تفہیمات ص ۳۲)

مولانا مودودی صاحب افاضی کبیر (رشن جج) کسی خون کے مقدمہ میں دو تین آدمیوں کی شہادت سے جس کو اس نے جانچ لیا ہو قاتل سے قصاص کا حکم دے یا چور کی چوری پر نصاب شہادت پا کر ہاتھ کاٹنے کی سزا دے تو کیا آپ کے پیدا کردہ احتمالات ان مقدمات اور ان جیسے اور خطرناک مقدمات پر حاوی ہوں گے یا نہیں؟ آپ بذات خود قاضی کبیر کے عہدہ پر فائز ہو جائیں تو کسی چور یا کسی زانی یا کسی قاتل کو شرعی سزا دیں گے یا ہر شہادت پر یہی احتمال پیدا کریں گے میرا گمان ہے اگر ہر شہادت پر آپ یہی گمان پیدا کریں گے تو حکومت اعلیٰ کی طرف سے آپ جلد اس عہدہ سے سبکدوش کر دیئے جائیں گے۔

مولانا ابیں نے جو مثالیں پیش کی ہیں۔ یہ شرعی مقدمات کی ہیں۔ ان میں شہادتوں کا نصاب بھی قرآن شریف نے مقرر کیا ہے اور اس پر عمل کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ انھیں خصوصاً قرآنیمہ کی بنا پر محدثین رضی اللہ عنہم اجمعین نے اپنے قواعد روایت کو استنباط کیا ہے۔ آپ نے جو احتمالات پیدا کئے ہیں ایسے احتمالات شاعروں نے بھی بتائے ہیں جو کہتے ہیں

پیغامبرِ رقیب نے یہ خبر نہ تھی! دنیا کے کاروبار میں سب اعتبار پر

مگر آپ جانتے ہیں کلامِ شعری اور بے کلامِ خطابی اور بے محدثین نے معاصرین کی روایت کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ ان کی ملاقات ہو چکی ہو۔ اس کا ثبوت ان کو کسی روایت میں مل جائے تو وہ ساری روایتوں کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ثبوت ملاقات کے لئے ان کے اصطلاحی الفاظ اخبرنا کحدثنا ہوتے ہیں۔ اگر کسی ایک روایت میں یہ الفاظ مل جائیں تو باقی کے لئے کافی ہیں۔ اس کی مثال آپ کو علمِ معانی بیان میں یوں ملے گی۔ کوئی شاعر سارے قصیدے میں افعال کو زمانہ اور افلاک کی طرف منسوب کرتا ہے مثلاً ہے

اشاب الصغیر و افنی الكبير! کر الخداة و موال العشی

سارے قصیدے میں اس قسم کی نسبتیں زمانہ کی طرف کرتا ہے۔ مگر اخیر میں جا کر ایک مصرع یہ بھی ملتا ہے۔



یعنی خدا سورج کو چڑھنے کا حکم دیتا ہے اس پر صاحبِ مطول اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں اگر آخری مصرع یہ نہ ہوتا تو شاعر کو دہریہ کہا جاتا۔ اس ایک مصرع نے بلکہ ایک لفظ نے شاعر کو دہریت کے فتوے سے بچا لیا۔ اُردو میں بھی ایک مثال سناؤں تو مفید ہوگی۔ مولانا حالی مرحوم مسلمان تھے اور مؤرخ مسلمان۔ اس کے باوجود آپ افعال کی نسبت زمانہ کی طرف کر رہے ہیں جو دہریوں کا طریقہ ہے۔ فرماتے ہیں یہ

کیا گر حکومت نے تم سے کنارہ تو اس میں نہ تھا کچھ تمہارا اجارا  
زمانہ کی گردش سے ہے کس کو چارا کبھی یاں ہے بہن کبھی یاں ہے دارا  
ایسی نسبتیں کرنے والے کو کبھی دہریت سے محفوظ رکھ کر خدا کا قائل سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ اسی مسرے کے ایک مصرع میں خدا کا نام یوں لیتا ہے ۔

نہیں بادشاہی کچھ آخر خدائی جو ہے آج اپنی توکل ہے پرانی  
بس یہ ہے اصولِ کلام جو ہر قوم میں اور ہر ایک جماعت میں بلکہ ہر اہل علم کے نزدیک مسلم اور مقبول ہے۔ جسے آپ نے کمزور سمجھ کر ٹال دیا۔ آپ نے متصل اور منقطع حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے۔  
مولانا آپ کو کبھی دُنیاوی عداوتوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہوگا، یا واقعات آپ نے سنے ہوں گے کہ عدالتِ شرعی میں ایک شخص شہادت دے کہ زید نے عمر کو کچھ دیا ہے۔ عدالت پر ہچھے تمہیں یہ علم کیسے ہوا وہ کہے میرے سامنے رو بیہ دیا گیا۔ دوسرا گواہ یہ شہادت دے کہ میں نے کسی آدمی سے ایسا سنا تھا۔ آپ بحیثیت قاضی ہونے کے فیصلہ دیں کہ یہ شہادتیں شرعی صورت میں ایک سی ہیں یا کچھ فرق رکھتی ہیں۔ آپ کے جواب کا مجھے انتظار ہے، خدا جزائے خیر دے۔  
محدثین کو جنہوں نے قواعد و ضوابط روایات کو قرآن شریف ہی سے استنباط کیا ہے۔ اور پھر ایک ایک روایت کو ان قواعد سے جانچا ہے۔ مولانا حالی مرحوم نے محدثین کے حنی میں بالکل صحیح لکھا ہے۔  
اے اسی دُھن میں آساں کیا ہر سفر کو! اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو!  
سنا خازنِ علم و دین جس بشر کو! لیا اس سے جا کر خبر اور اثر کو!

پس آپ کا یہ کہنا کہ ”اسناد اور جرح و تعدیل کے علم کو کلیتہً صحیح نہیں سمجھا جاسکتا“ یہ معنی رکھتا ہے کہ دنیا کی عدالتیں چاہے طاغوتی ہوں یا شرعی بالکل ناقابل اعتبار ہیں۔ ان کے فیصلے صحیح سمجھے جانے کے لائق نہیں ہیں۔ پس آئندہ کو آپ ایک سلسلہ مضمون یہ بھی شروع کریں کہ دنیا کی کسی عدالت کا فیصلہ قابل اعتبار نہیں ہے۔ مگر صرف یہ کہہ دینا کافی نہ ہوگا۔ بلکہ قانون شہادت ایک نیا تجویز کرنا ہوگا جس پر یہ شعر صادق آئے گا۔

ہم پیروی قیس نہ مہاد کریں گے اک طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے  
اخیر میں آپ کا یہ کہنا استعجاب سے خالی نہیں ہے کہ

”اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے مگر اس پر بالکلیہ اعتماد نہ کیا جائے۔ وہ باقی حصہ جس کے نہ ہونے سے اس سلسلہ محدثین کو ناقابل اعتماد قرار دیا ہے۔ وہ کیا ہے؟ اگر وہ حصہ وہ ہے جس کو آپ نے مجتہدین کا خاصہ بتایا ہے تو اس کا ذکر مع جواب درج ذیل ہے۔ (اہل حدیث ۲۱ ستمبر ۱۹۷۵ء)

**اعتراف** مولانا مودودی کی تنقید کو ہم بغور پڑھتے ہیں تو بے ساختہ منہ سے نکل جاتا ہے کہ مولانا کا مسلک اعتدال نہیں بلکہ اعتزال ہے۔ اعتزال سے ہماری مراد وہ مصدر نہیں ہے جس معترضہ فرقہ مشتق کیا جاتا ہے۔ بلکہ اصلی معنی میں اعتزال مراد ہے۔ اس لفظ کے معنی علیحدگی کے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں موصوف اپنی تحریرات میں عموماً مرزا صاحب قادیانی کا تتبع کرتے ہیں یعنی جس طرح مرزا صاحب قادیانی اپنی تحریرات میں کسی فن کی اصطلاحات کے پابند نہیں رہتے اسی طرح ہمارے مخاطب مولانا مودودی صاحب بھی اصطلاحات سابقہ کے پابند نہیں رہتے۔ بلکہ بزبان حال کہتے ہیں۔

کوئے جاناں سے خاک لائیں گے اپنا صومعہ الگ بنائیں گے !  
آج ہم اس دعوے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں:-

”محدثین رحمہم اللہ کا خاص موضوع اخبار و آثار کی تحقیق بلحاظ روایت کرنا تھا اس لئے ان پر اخباری نقطہ نظر غالب ہو گیا تھا اور وہ روایات کو معتبر قرار دینے میں زیادہ تر



صرف اسی چیز کا لحاظ فرماتے تھے کہ اسناد اور رجال کے لحاظ سے وہ کیسی ہیں۔ رہا فقہانہ نقطہ نظر تو وہ ان کے موضوع خاص سے ایک حد تک غیر متعلق تھا اس لئے اکثر وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ اور وہ روایات پر اس حیثیت سے کم ہی نگاہ ڈالتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک روایت کو انھوں نے صحیح قرار دیا ہے۔ حالانکہ معنی کے لحاظ سے وہ زیادہ اعتبار کے قابل نہیں اور ایک دوسری روایت کو وہ قلیل الاعتبار قرار دے گئے ہیں، حالانکہ معنی وہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ مثال دے کر تفصیل کے ساتھ اس پہلو کی توضیح کی جائے مگر جو لوگ امور شریعت میں نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ محدثانہ نقطہ نظر بکثرت مواقع پر فقہانہ نقطہ نظر سے ٹکرا گیا ہے اور محدثین کرام صحیح احادیث سے بھی احکام و مسائل کے استنباط میں وہ توانہ اور اعتدال ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں جو فقہار مجتہدین نے رکھا ہے۔ ”فہیات ۲۳-۲۴“

یہ اقتباس ہم کو دو باتوں کی اطلاع دیتا ہے۔ ایک یہ کہ فقہ اور حدیث الگ الگ دو چیزیں ہیں اس کی فرع یہ ہے کہ فقہانہ نظر اور محدثانہ نظر بھی الگ الگ ہے۔ اس موقع پر مولانا موصوف کو چاہیے تھا کہ وہ اپنی منظور نظر فقہ کی جامع مانع تعریف کر دیتے۔ اگر ان کی نظر میں وہی تعریف صحیح ہے جو فقہار کرام نے خود کی ہوئی ہے تو اسے ہم محدثانہ روش کے خلاف نہیں پاتے وہ تعریف صاحب توضیح کے الفاظ میں یہ ہے۔

هو العلم بالاحکام الشرعية العلمية من ادلتها التفصيلة

یعنی جو مسائل قرآن و حدیث سے استنباط کئے جائیں۔ ان کو جاننا علم فقہ ہے۔ اس تعریف کے مطابق آئیے ہم صحیح بخاری کا مطالعہ کریں اور اس مطالعہ میں ہم مدرسہ دیوبند مدرسہ رحمانیہ دہلی مدرسہ لہریہ سرائے اور مدرسہ عمر آباد مدارس وغیرہ کے شیوخ حدیث کو یکجا جمع کر کے تکلیف دیں کہ وہ بعد غور و فکر ہمیں بتائیں کہ امام بخاریؒ نے احادیث کو محض اسناد کی رو سے جمع کیا ہے یا فقہانہ نظر سے بھی ان میں کام لیا ہے۔ امام ممدوح کی ”صحیح“ سے ہم ایک دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ آنحضرت علیہ السلام فوت ہوئے تو آپ کی زرہ گروی تھی۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ تقریباً بیس بائیس جگہ لائے ہیں اگر ان کی نظر صرف اسناد پر ہوتی تو ایک دفعہ روایت کر دینا کافی تھا۔ پھر یہ تعدد روایت فقہانہ نقطہ نظر سے پیدا ہوا۔ امام بخاریؒ کی روش بتاتی ہے کہ ممدوح

نہ صرف خود محدث اور فقیہ تھے بلکہ طالب علموں کے لئے فقیہہ کرتے تھے۔ جراح اللہ سادات سادات  
الطالبین ہاں اس میں شک نہیں کہ سند حدیث کی روح ہے بلکہ محدثین کی اصطلاح میں سند ہی  
حدیث ہے۔ صحیح مسلم کے مقدمہ میں ہے اگر سند حدیث کی ضروری نہ ہوتی تو جو کوئی چاہتا کہہ لیتا  
اس موقع پر مجھے حضرت ابوالاستاد مولانا ذوالفقار علی مرحوم (مترجم حماسہ) کا شعر یاد آ گیا جو انھوں  
نے علم حدیث کی تعریف میں کہا ہوا ہے۔

العلم ما كان فيه قال حدیثاً

وما سوى ذلك وسواس الشياطين

ترجمہ: پختہ علم وہی ہے جس میں حدیث کی سند ہو باقی مشکوک ہے۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ محدثین فقیہانہ نظر سے خالی تھے۔ یہ بات بھی طرّاً للساب رچلتے  
چلتے (ظاہر کردوں تو بے جا نہ ہو گا کہ فقہ اور فقیہانہ نظر دو قسم پر ہے۔ اس کو حضرت شاہ ولی اللہ  
قدس سرہ نے واضح طور پر لکھا ہے فرماتے ہیں :-

”ایک فقہ تو وہ تھی جو قرآن و حدیث سے استنباط کی جاتی تھی۔ دوسری وہ کہ متاخرین فقہاء  
نے سابقین فقہاء کے اقوال کو اصل قرار دے کر ان سے مسائل استخراج کرنے شروع کئے۔  
اس قسم کے مسائل کا مجموعہ فقہ قسم ثانی ہے“

جب میں صحیح بخاری کو پڑھتا ہوں تو مددِ روح کی اصل نظر قرآن و حدیث پر پاتا ہوں مگر  
گاہے بگاہے صحابہ و تابعین وغیرہ کے اقوال کو پیش کر کے بھی استخراج کر لیا کرتے ہیں۔ گوان  
کے اور سب محدثین کے نزدیک حجت شرعیہ فقہ قسم اول ہی ہے اور فقہ قسم ثانی مع اس کے  
ماخوذوں کے ان کے نزدیک حجت شرعیہ ملزمہ نہیں۔ بلکہ حجت اقناعیہ ہے۔ اس لئے کہ ان  
کا اصول ہے قول الصحابی لیس بحجة ہاں اعتدال کا مسلک چھوٹ نہ جائے اس لئے  
میں یہ کہنے سے نہیں رک سکتا کہ محدثین میں ایسے حضرات بھی ہیں جن کی اصل غرض روایات جمع  
کرنا ہی ہے۔ فقیہانہ استنباط ان کے مقصد کے علاوہ ہے مگر اجنبی اور غیر نہیں۔ اس کی مثال صحیح  
مسلم ہمارے سامنے موجود ہے۔ جو ایک ہی حدیث کو تحویلات کر کے مختلف سندوں کے ساتھ  
پیش کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ بعض اسناد میں اتنا باریک فرق ہوتا ہے جس کو داؤد اور فار کا فرق  
کہنا چاہیئے۔ تیسری کتاب ہمارے سامنے صحیح ترمذی ہے۔ اس کی روش ہی ترائی ہے وہ مثل



امام بخاریؒ کے استنباطی تراجم مقرر نہیں کرتے ہیں مگر عموماً ہر باب کے اخیر میں فقہاء اسلام کے اقوال نقل کر دیتے ہیں جس سے مقصد ان کا یہ ہے کہ ذخیرہ معلومات جمع کر کے طلباء کے سامنے رکھا جائے۔ (رحمہم اللہ عتاً) اسی طرح دیگر کتب احادیث میں ہم کو محدثانہ اور فقیہانہ نظریں ملتی ہیں یہ توفیقہ انہی تعریف کے مطابق ہے جس کو ہم نے کتاب "توضیح" سے نقل کیا ہے۔ اگر فقہ کی کوئی جدید تعریف مودودی صاحب کی نظر میں ہے تو ہم اس کو سننے کے متمنی ہیں۔ آپ نے اسی اقتباس میں یہ فقرہ بھی لکھ دیا ہے:-

ایک روایت کو انھوں (محدثین رحمہم اللہ) نے صحیح قرار دیا ہے حالانکہ معنی کے لحاظ سے وہ زیادہ اعتبار کے قابل نہیں (حوالہ مذکور)

ہم قصورِ علم کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ہم اس فقرہ کو نہیں سمجھتے کہ معنی سے آپ کی مراد کیا ہے۔ لفظی ترجمہ ہے یا کچھ اور۔ اور اس کی مثال کو کسی حدیث ہے جو سند کے لحاظ سے محدثین کے نزدیک صحیح ہو اور معنی کے لحاظ سے فقہاء کے نزدیک اعتبار کے قابل نہ ہو۔ آپ کی رفع تکلیف کے لئے میں خود ہی ایک حدیث پیش کئے دیتا ہوں جس کو بعض فقہاء نے خلاف قیاس کہہ کر نظر انداز کیا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ جو شخص گائے یا بھینس مصراۃ خریدے اس کا دودھ کم پائے اور اس کو واپس کرنا چاہے تو ایک صاع غلہ یا کھجور اس کے ساتھ دے کہتے ہیں کہ یہ حدیث قیاس کے خلاف ہے۔ محدث اس کے جواب میں کہتا ہے۔ یہ قیاس اصطلاحی نہیں ہے بلکہ آپ کی ذاتی رائے ہے جو ایک معنی سے حدیث کا مقابلہ ہے۔ اب میں مولانا مودودی اور ناظرین کو بالائی منزل میں لے جانا چاہتا ہوں پس ناظرین غور سے سنیں۔

محدثین سند حدیث کے ذریعہ سے متن حدیث کو لے کر گویا دربار رسالت میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ گویا رسالت کی زبان مبارک سے الفاظ حدیث سن لیتے ہیں۔ اس لئے ان کو کچھ پروا نہیں ہوتی کہ ہمارا فہم یا قیاس اس متن حدیث کے مخالف ہے یا موافق وہ زبان او دل کے اتفاق سے کہتے ہیں سمعنا و اطعنا۔ اس وقت ان کی زبان پر یہ ورد ہوتا ہے:-

ہوتے ہوئے مصطفیٰ کی گفتار مت دیکھ کسی کا قول و کردار  
(اہل حدیث ۲۲ ستمبر ۱۹۵۵ء)  
جب اصل ملے تو نقل کیا ہے یاں وہم و خطا کا دخل کیا ہے

لے وہ گائے یا بھینس جس کو فروخت کرنے کے لئے دودھ پہلے سے روکا جائے۔

ہم خوش ہیں کہ مولانا مودودی نے اپنا عقیدہ اور مسلک مندرجہ  
مولانا مودودی کا مسلک ذیل الفاظ میں صاف صاف بتا دیا ہے فرماتے ہیں:-

”اس بحث سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ جس طرح حدیث کو بالکل رد کر دینے والے غلطی پر ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی غلطی سے محفوظ نہیں ہیں جنہوں نے حدیث سے استفادہ کرنے میں صرف روایات ہی پر اعتماد کر لیا ہے۔ مسلک حق ان دونوں کے درمیان ہے اور یہ وہی مسلک ہے جو ائمہ مجتہدین نے اختیار کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھتے ہیں جو مرسل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں۔ یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ایک ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا گیا ہے۔ یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔ یہی حال امام مالکؒ کا ہے۔ باوجودیکہ اخباری نقطہ نظر ان پر زیادہ غالب ہے۔ مگر کچھ بھی ان کے تفقہ نے بہت سے مسائل میں ان کو ایسی احادیث کے خلاف فتویٰ دینے پر مجبور کیا جنہیں محدثین صحیح قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ لیت بن سعد نے ان کی فقہ سے تقریباً نہتر مسئلے اس نوعیت کے نکالے ہیں۔ امام شافعیؒ کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔“ (تفہیمات ص ۳۲۲ و ۳۲۳)

اصل بات پر مولانا مودودی نے غور نہیں کیا یا ان کو سہو ہو گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ مرسل حدیث کو ضعیف نہیں کہتے۔ دوسرے محدثین کی دلیل یہ ہے کہ حدیث مرسل میں صحابی کا نام متروک ہو جانے سے سلسلہ اسناد منقطع ہو گیا۔ اور شبہ پیدا ہو گیا کہ صحابی کے سوا کوئی اور راوی بھی نہ چھوٹ گیا ہو۔ اس لئے یہ سند کالعدم سمجھی جائے۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے متبعین کہتے ہیں کہ تابعی نے جو صحابی کو چھوڑ کر آنحضرت علیہ السلام کے نام سے روایت کیا ہے۔ یہ اس

لہ ہندوستان کے قائلین حدیث خصوصاً اصحاب اہل حدیث مولانا مودودی صاحب کے اس فقرہ کو غور سے پڑھیں اور ہمیشہ کے لئے ملحوظ رکھیں تاکہ گفتگو کرتے وقت ان کو یہ فقرہ کام آئے۔  
 لہ جناب کے علم و دیانت کا تقاضا کیا کہتا ہے؟ ہم اپنے علم و دیانت کا تقاضا اس مصرع میں ظاہر کر دیتے ہیں۔ ع

عام ہمت یک طرفہ آن شوخ تنہا یک طرفہ لہ رسول علیہ السلام



کا مال اعتماد ہے۔ اس لئے سند میں خلل نہیں سمجھنا چاہیے۔ مولانا مودودی کے قابل غور ایک کتبہ ہے اگر غور کریں گے تو اس کا فیصلہ وہ خود ہی فرمائیں گے۔ وہ پہلے کہہ چکے ہیں کہ محدثین نے جن راویوں کی نسبت اچھی یا بُری رائیں لکھی ہیں۔ ان کی محنت قابلِ شکر یہ ہے لیکن بشریت سے وہ بھی خالی نہ تھے۔ ممکن ہے ان راویوں میں ان سے غلطی ہو گئی ہو، اس بنا پر میں آپ کو توجہ دلاتا ہوں کہ ہر صورت میں آپ محدثین کی کھلی رائے کے متعلق غلطی کا امکان بتاتے ہیں۔ اگر وہ محدث کسی راوی کا نام ہی نہ لے جیسے مُرسل کی صورت میں ہوتا ہے تو اس صورت میں یہ امکانِ ڈبل امکان ہو جاتا۔ یا نہیں یہی وجہ ہے کہ محدثین مُرسل کو صحیح نہیں مانتے مگر امام ابو حنیفہؒ اس کو قابلِ استناد جانتے ہیں یہ اختلاف دراصل ایک اصولی اختلاف ہے۔ اس کی مثال میں آپ کو بتاؤں تو مفید ہوگی بعض علماء کے نزدیک مفہوم مخالفِ حجت ہے اور بعض کے نزدیک نہیں۔ مفہوم مخالف کسے کہتے ہیں؟ کسی اسم یا فعل کو مقید بالوصف کر کے حکم لگایا جائے۔ تو بعض علماء عدم وصف کے وقت اس پر حکم نہیں لگاتے بعض پھر بھی لگا دیتے ہیں مثلاً آیت کریمہ **وَرَبَّانِیْکُمْ اَللّٰہُ فِیْ حُجُوْرٍ** یعنی تمہاری ربیبہ لڑکیاں جو تمہاری گودوں میں پرورش پاتی ہیں وہ تم پر حرام ہیں بعض اکابر نے اس کے مفہوم مخالف کو سند لے کر جو ان ربیبہ سے نکاح کا فتویٰ دیدیا۔ ملاحظہ ہو تفسیر معالم وغیرہ مگر جمہور علماء عدم جواز کے قائل ہیں کیونکہ مفہوم مخالف ان کے ہاں حجت نہیں پس یہ ایک اصولی اختلاف ہے۔ اسی طرح مُرسل کا حجت ہونا یا نہ ہونا اصولی اختلاف ہے۔ یہ نہیں ہے کہ امام ابو حنیفہؒ حدیث کی صحت میں سند کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے، نہ یہ ہے کہ سند کو کافی نہیں جانتے تھے۔ اسی طرح امام شافعیؒ اور امام مالک رحمہما اللہ بھی کسی حدیث کو بلا سند صحیح نہیں کہتے تھے۔ مولانا مودودی صاحب کو اگر اس پر اصرار ہے تو وہ چند حدیثیں بطور مثال ہم کو بتائیں جن کو ان حضرات نے سند کے لحاظ سے نہیں بلکہ فقیہانہ نظر سے صحیح مانا ہو۔

اولئک ابائی فجئنی بمثلہم اذا جمعنا یا جریر المعامع

لیث بن سعد کے جن ستر مسائل کا آپ نے ذکر کیا ہے آپ ان کو پیش کریں گے تو ہم بھی غور کریں گے۔ ان کو حدیث سے ماخوذ بتائیں گے یا متروک ٹھہرائیں گے۔ لیکن یہ سب کچھ مسائل مذکورہ پیش ہونے پر ہو گا۔ سُنی سنائی بات پر نہیں۔ امام مالکؒ کا موطا ہمارے اور آپ کے ہاں ہے کھول کر ان مسائل کا حوالہ دے دیجئے۔

اپنا تو یہ ہے قول آئے ہیں آئیے دعویٰ اگر کیا ہے تو کچھ کر دکھائیے

(اہل حدیث ۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء)

مولانا مودودی نے کھلے لفظوں میں مجتہد حدیث سے انکار نہیں کیا۔ نہ ہم ان کو کھلے منکر حدیث سمجھتے ہیں اور نہ کہتے ہیں۔ اسی لئے سلسلہ ہذا کی پہلی قسط میں ہم نے ان کی بابت تبصرہ لکھ دیا تھا کہ۔  
”مولانا مودودی صاحب نے بڑی سچائی سے کام لیتے ہوئے ایک موقع پر علم حدیث کو واجب العمل تسلیم کیا ہے۔ تفہیمات ص ۳۱۶ (اہل حدیث ۱۲ ستمبر ۱۹۷۷ء)

چونکہ ان کے شبہات سے منکرین حدیث کو قوت پہنچتی ہے اور یہ قوت شدید انکار کا موجب ہوتی ہے۔ لہذا یہ نسبت مجازی اسی قسم سے ہے جس قسم سے آیت کریمہ کے الفاظ ہیں:-

كَمَا اَخْرَجَ اَبُو يَكْرُمٍ مِنَ الْجَنَّةِ فَانْدَفَعَ مَا اور دوما کا دبر د مولانا مودودی کے شبہات کو ہم نے موجب قوت منکرین حدیث کہا ہے۔ اس کا ثبوت ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ موصوف فرماتے ہیں:-

”معاذ اللہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ لوگ کسی حدیث کو حدیث صحیح جان کر اس سے انحراف

کرتے تھے۔ نہیں بلکہ اصل معاملہ یہ تھا کہ ان کے نزدیک صحت حدیث کا درجہ صرف اسناد پر نہ تھا۔

بلکہ اسناد کے علاوہ ایک کسوٹی بھی تھی جس پر وہ احادیث کو پرکھتے تھے اور جس حدیث کے متعلق

ان کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ یہ حقیقت سے اقرب ہے اسی کو قبول کر لیتے تھے خواہ وہ مخالف

محدثانہ نقطہ نظر سے مرجوح ہی کیوں نہ ہو۔ (تفہیمات ص ۳۲)

اس اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ محدثین اور مجتہدین کے مسلک الگ الگ ہیں بعض احادیث

محدثین کے نزدیک بنظر سند ضعیف ہوتی ہیں۔ مگر مجتہدین بنظر فقہانیت انہی کو راجح قرار دے کر ان پر

عمل کرتے اور کرتے ہیں۔ اسی کا عکس القضیہ یہ ہے کہ محدثین بعض احادیث کو بنظر سند صحیح

سمجھتے ہوں گے اور مجتہدین بنظر فقہانیت ان کو غلط قرار دے کر رد کر دیتے ہوں گے۔ اسی کی

مزید تشریح مندرجہ ذیل اقتباس میں ملتی ہے۔

”یہ دوسری کسوٹی کون سی ہے؟ ہم اس سے پہلے بھی اشارہ اس کا ذکر کئی مرتبہ

کر چکے ہیں جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔ اس کے اندر

قرآن اور سیرت رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے اور ایسی

بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جو اہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک پر کھلتی ہے۔



اس کی نظر بحیثیت مجموعی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتی ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسب نہ تھی ہے اور کون سی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذاتِ نبویؐ کا مزاج ہے جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب و سنت رسول اللہؐ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کونسا قول یا کونسا فعل میری سرکار کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنتِ نبویؐ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی روح رُوحِ محمدیؐ میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبویؐ کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اسی طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرورتاً ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، قطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر میرے کی غوت دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معطل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے اس لئے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنی، بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی۔

(تفہیمات صفحہ ۳۲۵ و ۳۲۶)

اس اقتباس میں الفاظ کی بھرمار سے مرزا غالب کا یہ شعر بے ساختہ منہ سے نکل جاتا ہے۔  
 ملے تو حشر میں لے لوں زبانِ ناصح کی : عجیب چیز ہے یہ طولِ مدعا کے لئے  
 ان دونوں اقتباسوں کو ملحوظ رکھ کر ہم قائلین حدیث سے عموماً اور اعیانِ اہل حدیث سے خصوصاً پوچھتے ہیں کہ اصول حدیث کی کتابوں میں کوئی اصل اور قاعدہ ان معنی کا بھی ملتا ہے۔ اگر

المیہ سے کہہ جائیں۔ زہد اب تو مولانا مودودی سے بول چال میں گم ہو چکا ہے یہاں آپ نے کہا کہ اس سے پہلے  
 مولانا مودودی کے اس قسم کا مجموعہ سادہ و سنجیدہ جو مجتہدین کے اختلاف و مسلک کی وجہ سے الگ  
 نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کتاب خانہ راہپور کی مطبعہ کتبوں میں ہے یہاں انکی پوری فہمی  
 کتابوں میں اس کے علاوہ ہیں۔ اگر تہہ چل جائے کہ عنقہ کے گھرنے میں ہے تو ہم وہاں بولیں  
 کی کوشش کریں گے کیونکہ ہمارا شوق وہی ہے جو مولانا مودودی نے محدثین کا بتایا ہے۔  
 سنا خازن علم دین جس بشر کو لیا اس سے جا کر خبر اور اثر کو

مولانا مودودی کا جولان قلم بلا سطر کھینچے کہ مذکورہ بالا ہر دو اقتباسوں کا  
**ائمہ اربعہ کا اختلاف** گویا آپ خود ہی فرماتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کے الفاظ یہ ہیں۔

”یہ چیز چونکہ مرامزدقی ہے اور کسی ضابطہ کے تحت نہیں آؤ گئی ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس میں  
 اختلاف کی گنجائش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی ہے کی چنانچہ اسی وجہ سے ائمہ  
 مجتہدین کے درمیان جزئیات میں بکثرت اختلافات ہوتے ہیں پھر یہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ ایک شخص  
 کا ذوق لامحالہ دوسرے شخص کے ذوق سے کلیتہً مطابقت میں ہو۔ وہ ہے کہ ایک ہی مسئلہ کے لئے  
 نے بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے۔ امام بو حنیفہ اور ان کے اصحاب  
 کے اقوال میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ اس کی ایک روشن مثال ہیں۔“ رقم بیات نکلتے  
 ہم نے جو کہا ہے کہ یہ اقتباس پہلے دو اقتباسوں کا رد ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے معلوم  
 ہوتا ہے کہ مجتہدین کے اختلاف فرامہمب کا فیصلہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ ان کے اپنے اختلاف  
 ذوق پر مبنی ہے۔ اس لئے نہ کوئی حنفی شافعی کو اور نہ شافعی حنفی کو کہہ سکتا ہے کہ تمہارا افکار  
 مسئلہ غلط ہے کیونکہ وہ جواب میں کہہ دے گا میرے امام کا ذوق سلیم ہی کہتا ہے۔ جو میں نے  
 اختیار کیا ہوا ہے۔ یہ ذوقی اختلاف گویا اس شعر کا مصداق ہوا ہے

مجھے تو ہے منظور مجنوں کو لیلے نظر اپنی اپنی پسند راہی اپنی  
 مولانا مودودی کے ان اقتباسوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب ہدایہ کا بہت سے مسائل  
 میں روایات کے متعلق یہ کہنا ہو حجت علی الشافعی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں مجتہدوں کا ذوق  
 الگ الگ ہے۔ پھر ایک کی روایت دوسرے پر حجت کیسی۔ بلکہ اس شعر کی مصداق ہوئی ہے۔  
 نہ وہ میری رائے نہ میں نا صحوں کی نہیں مانتا کوئی کہتا کسی کا ! (اہل حدیث و ائمہ)



اور ذکر یہ ہے کہ بقول مولانا مودودی ہر امام اور فقیہ کا فوق امام الگ  
مناصب و انوار رضی اللہ عنہم کا ذوق بالکل جدا تھا۔ ہر امام اپنے ذوق کے مطابق فتویٰ دے  
تا۔ اس کے آگے مولانا فرماتے ہیں :

”ہر ایک ضروری بات میں کہ ہر مجتہد کا ذوق ہر مسئلہ میں صوابی کو پہنچ جلتے۔ ان کے ہر حال  
کو روایوں کا نمونہ ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کا مجتہد بھی غلطی کر سکتا ہے اور کر جاتا ہے۔ اتنا بڑا  
پر ائمہ مجتہدین ہمیشہ اترتے رہے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ اپنے متبعین کو ہدایت کی ہے کہ تم پر  
الکاح اعتبار نہ کرو۔ خود بھی تحقیق کرتے رہو اور جب کوئی سنت ہمارے قول کے خلاف ثابت  
ہو جائے تو ہمارے قول کو رد کر کے سنت کی پیروی کرو۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں۔ لا یجحد  
احدا ان یقول مقالنا حتی یعلم من این قلنا امام زفر کا قول ہے انما نأخذ بالشرائی  
والہ یجد الاثر فان جاء الاثر تركنا الراي واخذنا بالاشرا امام مالک کا ارشاد ہے۔  
انما اننا بشر اخطی واصیب فانظر وافی راہی فکلما وافق الکتاب والسنة فخذ ولا و  
کلما لم یوافق الکتاب والسنة فاتركوه۔ امام شافعی کا بیان ہے کہ اذا صح احاد کذبوا  
بما نزلوا بقول العامة لا قول لاحد مع سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم۔  
غور یہ کہ تمام ائمہ بالاجماع کہتے ہیں کہ جس شخص پر کسی مسئلہ میں سنت رسول روشن ہو جائے  
اس کے لئے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے خواہ وہ کیسے ہی اثر سے رقعہ کا  
شخص ہو۔“ (تفہیمات ص ۳۲ و ط ۳۲)

اس اقتباس کو میں نے غور سے پڑھا تو میں اپنی سمجھ ناقص کے مطابق اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ  
مقبول لکھتے ہوئے کتاب ”معیار الحق“ مصنفہ حضرت مولانا شمس العلماء نذیر حسین المعروف مبارک  
صاحب مرحوم مغفور مولانا مودودی کے زیر نظر ہوگی کیونکہ یہ مضمون معیار الحق کا گویا خلاصہ ہے  
اور اس اقتباس کا خلاصہ یہ اشعار ہیں۔

کیا تجھ سے کہوں حدیث کیا ہے      دُر داتہ دُر ج مصطفیٰ ہے  
صوفی و عالم و حکیم دینی !!      کرتے رہے اسی کی خوشحینی  
بابا کے ہاں سے کون لایا !      جس نے پایا یہیں سے پایا  
گو غوث و قطب و مقتدا ہے      وہ بھی اسی در کا اک گدا ہے

جب اصل ملے تو نقل کیا ہے یاں وہم و خطا کا دخل کیا ہے  
 ہوتے ہوئے مصطفیٰ کی گفتار مت دیکھ کسی کا قول و کردار  
 یہی مسلک ہے جس کو لے کر خالص اہل حدیث اٹھے تھے اور اب تک بفضل خدا اسی  
 پر قائم ہیں۔ اس لئے اس اقتباس کی روشنی میں اہل حدیث آپ سے مؤانفہ کرتے ہوئے یہ شعر  
 پڑھتے ہیں۔

رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت صلح کیجئے بس لڑائی ہو چکی  
 مولانا اجازت دیں تو چلتے چلتے ایک بات دریافت کریں ہم آپ کے پہلے اقتباسوں میں یہ  
 پڑھ چکے ہیں کہ فقہاء اور محدثین میں مسلک کا اختلاف تھا۔ بعض روایتوں کو محدث اسناد کی نظر سے  
 ضعیف یا موضوع کہہ دیتے تھے۔ مگر فقہانہ نظر سے ان کو صحیح سمجھ کر ان پر عمل کر لیتے تھے  
 اس موقع پر میں اپنے قصور علم کا اعتراف کر کے یہ پوچھتا ہوں کہ چاروں مجتہدین کا ذوق تو آپ نے  
 فرمادیا کہ الگ الگ تھا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ ان کے ہر ایک مسئلہ کا صحیح ہونا ضروری نہیں تھا اس لئے  
 کہ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے مسائل کو سنتِ مطہرہ پر جانچ کر قبول کر لیا کرو۔ حسنا اللہ  
 ع۔ اے وقت تو خوش باد کہ وقت ماخوش کر دی

پس میں پوچھتا ہوں کہ مولانا وہ سنتِ مطہرہ کی کسوٹی ہمارے پاس کس طریقے سے پہنچے گی۔  
 اسناد کے ذریعے یا مجتہدوں کے ذوقِ سلیم کے ذریعے سے۔ مجتہدین کے ذوقِ سلیم کو تو آپ سنتِ  
 مطہرہ کا محتاج مانتے ہیں لیکن سنتِ مطہرہ کیا چیز ہے اور ہمارے پاس اس کے آنے کا ذریعہ  
 کیا ہے؟ پس یہ عقدہ جس طرح ہو جلدی حل کر دیجئے۔ ع

بس اس جواب پر پھیرا ہے فیصلہ دل کا

مختصر یہ ہے کہ آپ کا اور ہمارا اس امر پر اتفاق ثابت ہو گیا کہ آپ مسائلِ فقہ کو محتاج  
 الی القرآن والسنتہ مانتے ہیں۔ مگر اس میں اختلاف ہے خدا کرے یہ بھی نہ رہے کہ احادیث  
 کا ذریعہ علم ہمارے نزدیک صرف اسناد ہے۔ اور آپ کے نزدیک مجتہدانہ ذوق بھی ذریعہ علم ہے  
 بس اس منزیت کا ثبوت آپ کے ذمہ ہے۔ اگر میں کہوں کہ آپ خود ہی اپنے سابقہ دعوے  
 کی تردید اس اقتباس میں فرما چکے ہیں تو غالباً غلط نہ ہوگا۔

آپ کا اور ہمارا دوسرا اختلاف اس امر میں ہے کہ آپ ایک طرف احادیث پر عمل کرنے



کی تاکید کرتے ہیں (جزاک اللہ) مگر دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ ان پر پورا اعتماد نہیں۔ پس آپ کا ہمارا اختلاف۔ منطقی اصطلاح میں یہ ہے کہ ہم قضیہ ضروریہ مطلقہ موجبہ کے قائل ہیں اور آپ اس کے ساتھ ممکنہ عامہ سالبہ کو بھی ملتے ہیں۔ اس بارے میں مدارس عربیہ کے علماء اور طلباء جو فیصلہ کر سکتے ہیں۔ جو حضرات مولانا مودودی سے حسن ظن رکھتے ہیں وہ اپنا حسن ظن بحال رکھ کر ہمارے اس اختلاف میں انصاف سے فیصلہ فرمائیں گے تو ہم سُن کر خوش ہوں گے۔

تمہیں تقصیر اس بُت کی جو ہے میری خطا لگتی مسلمانو! ذرا انصاف سے کہیو خدا لگتی!

(۱۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء)

ساتویں قسط علماء اہل حدیث کے لئے خاص طور پر قابلِ توجہ

**مولانا کا مخصوص عقیدہ** ہے کیونکہ اس میں مولانا مودودی کا عقیدہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیث کو تفسیرِ قرآن مانتے ہیں جزاء اللہ خیر الجزاء۔ باوجود اس کے ہم نے اس نمبر کا اضافہ کیوں کیا؟ اس نمبر میں اس کا جواب دینا ہمارا مقصود ہے۔ پہلے مولانا موصوف کا عقیدہ ان کے الفاظ میں سنیں۔

”قرآن مجید ہدایت کے لئے کافی ہے۔ اس میں وہ صحیح علم موجود ہے جس کی روشنی میں انسان صراطِ مستقیم پر چل سکتا ہے اور اس میں وہ تمام اصول بیان کر دیئے گئے ہیں جن پر اللہ کا پسندیدہ دین قائم ہے، مگر اس علم سے فائدہ اٹھانے کے لئے چیزوں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ طالب علم استفادہ کی خاص نیت رکھتا ہو اور اُن مبادی سے وقف ہو جو قرآن کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک ماہر فن استاد موجود ہو جو کتاب اللہ کے نکات سمجھائے، آیات کا صحیح معنی و مفہوم بتائے، احکام پر خود عمل کر کے دکھائے اور قوانین کو عملی زندگی میں نافذ کر کے ان کا تفصیلی ضابطہ مقرر کر دے پہلی چیز کا تعلق ہر شخص کی اپنی ذات سے ہے۔ دوسری چیز تو اس کا انتظام اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ کتاب کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی غرض سے بھیجا گیا تھا کہ آپ اس ماہر فن کی ضرورت کو پورا کریں۔ آپ نے اُستاد کی حیثیت سے جو کچھ بتایا اور سکھایا ہے وہ بھی اسی طرح خدا کی طرف سے ہے۔ اس کو ”غیر از قرآن“ کہنا صحیح نہیں ہے۔ جو شخص اس کی ضرورت کا مُنکر ہے اور قرآن کو اس معنی میں



کافی کہتا ہے کہ اس کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی علیٰ وعمل ہدایت کی حاجت نہیں ہے۔ وہ دراصل یہ کہتا ہے کہ صرف قرآن کی تشریح کافی تھی خدا تعالیٰ نے نعوذ باللہ یہ فعلِ عبث کیا کہ اس کے ساتھ رسول کو بھی مبعوث کیا، (تفہیمات) ناظرین کرام! بالفاظ مولانا مودودی منکرینِ حدیث کے اس فقرہ کو حیرت کی نظر سے دیکھیں گے اور تعجب کے کانوں سے سنیں گے کہ موصوف نے یہ کیا فرمایا ہے کہ

خدا نے نعوذ باللہ یہ فعلِ عبث کیا کہ اس کے ساتھ رسول کو بھی مبعوث کیا۔

منکرینِ حدیث اس کے جواب میں کہیں گے کہ رسول کے معنی ہی ہیں پیغام پہنچانے والا رسول کی ولادت قرآن پر دلالتِ تضمینی ہے۔ ایک کا مفہوم دوسرے سے الگ کیسے متصور ہو سکتا ہے یہ کیونکر ممکن تھا کہ پیغام پہنچے اور پیغام رسال نہ پہنچے خیر یہ تو آپ کا اور اہل قرآن کا باہمی مکالمہ ہوگا ہم نے جو آپ کا مطلب سمجھا ہے اس کے متعلق اپنا رافضی الضمیر عرض کرتے ہیں۔ آپ کے اس اقتباس کا مطلب یہ سمجھا اور یہی ہے کہ قرآن مشن ہے مثل کافیہ کے اور احادیث نبویہ اس کی تفسیر ہیں مثل شرح جامی کے۔ اس لئے دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ بالکل سچ ہے۔ جزاک اللہ! آپ نے خوب کہا مگر قد بقی الخ یا فی الزوایا ابھی بہت کچھ مخفی ہے۔

اول۔ قرآن مجید کی یہ آیت ہے۔

وَإِخْوَانُكُمْ مِنَ الرِّضَاعَةِ (تمہاری دودھ پینے والے تم پر حرام ہیں)۔

اس آیت کی یہ تفسیر تو بالکل صاف ہے کہ ایک لڑکے نے کسی عورت کی لڑکی کے ساتھ دودھ پیا وہ اس کی ہم شیر ہوئے کی وجہ سے حرام ہے مگر اس لڑکی کی حقیقی خالہ اس لڑکے پر اس رضاعت کی وجہ سے حسب تفسیرِ آیت کے حرام نہ ہونی چاہیے۔ حالانکہ حدیث کی رو سے حرام ہے۔

علیٰ ہذا القیاس کسی لڑکی نے کسی لڑکے کے ساتھ مل کر دودھ پیا تو وہ لڑکی اس رضیع کے حق میں اس آیت کی تفسیر میں آجائے گی۔ مگر اس لڑکے کے والد، چچا اور ماموں کا رشتہ اس لڑکی کے ساتھ کیوں حرام ہوگا؟ کیونکہ تفسیر میں وہ چیز داخل ہوتی ہے جس کو متن کا لفظ متحمل ہو۔ مثال کے طور پر ”کافیہ“ کی عبارت پیش کرتا ہوں۔ یعنی لفظ و مضع معنی مفرد شارح جامی نے اس عبارت میں ”مفرد“ کو مرفوع و مجرور بنا کر بلا لکھ کا تشریح کر دی۔ لیکن مفرد (منسوب) کی حالت نصب میں جب تشریح کرنی چاہی تو لکھ کا ہوا کہ اس پر نصب کی علامت نہیں ہے۔ اس لئے اس



تیسری ترکیب کو معذرت کر کے داخل کیا۔ مجرور اور مرفوع کے لئے کوئی معذرت نہیں کی کیونکہ ان دونوں ترکیبوں کے لئے مفرد متحمل تھا۔

مختصر یہ کہ متن متحمل ہو تو شرح اس کو کھول سکتی ہے۔ غیر جنس کو شرح داخل نہیں کر سکتی فافہم لعلہ دقیق۔

مذکورہ بالا رشتے ایک مرفوع حدیث کے ماتحت حرام ہیں چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے بحرام من الرضاۃ ما یحرم من النسب ردودہ سے مثل نسب کے حرمت ثابت ہوتی ہے (فرانک) یہ حدیث آیت مذکورہ کی تفسیر ہے یا حکم جدید؟ بیتوا لتجروا۔

دوم آیت کریمہ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاَخْتَيْنِ یعنی دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام ہے صدق اللہ۔ آپ کے قابل غور سوال یہ ہے کہ اخت کا لفظ پھوپھی اور خالہ کو شامل نہیں۔ حدیث میں جو آیا ہے کہ کسی منکوحہ لڑکی کو اس کی پھوپھی کے ساتھ جمع کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح کسی منکوحہ کو اس کی خالہ کے ساتھ جمع کرنا جائز نہیں۔ کیا یہ اس آیت کی تفسیر ہے یا حکم جدید۔

سوم۔ آیت کریمہ۔ الزانیۃ والزانی رُورہ نورا اس آیت میں زانی مرد عورت کی سزا تو درے (بید شدید) آتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے جس مرد اور عورت نے ایک دفعہ نکاح کر لیا ہو پھر ان سے زنا کا فعل صادر ہو۔ تو ان کی سزا رجم (تھپڑ مارا) ہے کیا یہ اس آیت کی تفسیر ہے یا حکم جدید؟ چہارم۔ السارق والسارقة فاقطعوا ايديہما یعنی جو مرد ہو یا عورت اس کے ہاتھ کاٹ دو۔ اس چوری کا نصاب جو حدیثوں میں آیا ہے وہ ربع دینار یا دس درہم کی چیز ہے۔ یہ قید اس آیت کی تفسیر میں کیسے داخل ہو سکتی ہے کیونکہ آیت تو عام ہے چاہے پیسے کی چوری ہو یا روپے کی۔ ایک دینار کی ہو یا تھو دینار کی۔

یہ چند مثالیں ہم نے بیان کی ہیں۔ اگر بالاستیعاب سب مثالیں لکھی جائیں تو ابھی خاصی ایک ضخیم کتاب بن جاتے۔ مگر ہم حکیم خیر الکلام مآقل ددئی چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہوئے بقول مزا غالب مرحوم۔

نہ دے نامے کو اتنا طویل غالب مختصر لکھ دے

کہ حسرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جبرائی کا

آپ نے منکرین حدیث سائل کے جواب میں جو حدیث کو قرآن مجید کی تفسیر بنا کر اس کو



ساکت کیا ہے بہت اچھا کیا۔ ہماری ان مثالوں کے جواب میں حدیث کو مثبت حکم شرعی مان کر خود پسند فرمائیں۔ تاکہ ہمیں بھی کہنے کا موقع ملے۔

کون کہتا ہے کہ ہم تم میں جدائی ہوگی یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی

(اہل حدیث ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء)

**سُنّت پر عمل سے انحراف** اب ہم وہ اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا موصوف کا مسلک کیا ہے۔ اس اقتباس

کا مفہوم یہ ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فعل کو واجب العمل سُنّت نہیں جانتے اور یہ بھی جو اصطلاحات علماء اہل حدیث کی متعلقہ سُنّت و بدعت رائج ہیں، مولانا موصوف ان کے بھی پابند نہیں۔ لطفِ اپنی طرف سے بھی کوئی اصطلاح مقرر نہیں کرتے چنانچہ رسالہ ”ترجمان القرآن“ کا مندرجہ ذیل اقتباس قابلِ ملاحظہ ہو۔ ناظرین بغور پڑھیں۔ موصوف فرماتے ہیں:-

”میں اُسوہ اور سُنّت اور بدعت وغیرہ اصطلاحات کے ان مفہومات کو غلط دین میں تحریف کا موجب سمجھتا ہوں۔ جو بالعموم آپ حضرات (فقہاء اور محدثین) کے ہاں رائج ہیں۔ آپ کا یہ خیال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بڑی داڑھی رکھتے تھے۔ اتنی ہی بڑی داڑھی رکھنا سُنّتِ رسول یا اُسوہِ رسول ہے یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عاداتِ رسول کو بعینہ وہ سُنّت سمجھتے ہیں جس کے جاری اور قائم کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء علیہم السلام مبعوث کئے جاتے رہے ہیں۔ مگر میرے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ سُنّت کی صحیح تعریف نہیں ہے بلکہ میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سُنّت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔“

(ترجمان القرآن جلد ۲۶ عدد ۴۰۳، ۴۰۴ صفحہ ۲۴۲ بابت مئی، جون ۱۹۷۵ء)

علماء حدیث ان اصطلاحات کے متعلق جو الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ کتبِ اصول میں موجود ہیں

اسوہ سے مراد ان کی فعلِ نبوی ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

لہ ناظرین ان الفاظ کو یاد رکھیں۔ کیونکہ یہی امور زیر بحث اور مابہ النزاع ہیں۔



لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۱۹۷)

اسی بنا پر صحابہ کرام ازواج مطہرات سے پوچھا کرتے تھے کہ آنحضرت علیہ السلام گھر میں رہ کر کیا کام کیا کرتے ہیں؟ ازواج فرمائیں کہ ان فی مہنتہ اہلہ دجاری حضور گھر والوں کی خدمت میں مشغول رہتے صحابہ کی غرض اس سوال سے یہی ہوتی تھی کہ ہم بھی اپنے گھروں میں وہی کام کریں جو آنحضرت علیہ السلام کیا کرتے ہیں تاکہ اسوہ حسنہ کی تعمیل مکمل ہو جائے۔ بدعت کی تعریف بھی علماء حدیث کے نزدیک وہی ہے جو حدیث میں لائی ہے۔

من احدث فی امرنا ہذا ما لیس منہ فہو ہاد (مشکوۃ شریف)

”جو شخص دین اسلام میں کوئی نئی بات نکالے وہ مردود ہے پس یہی بدعت ہے۔ اسوہ اور سنت دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ ان دونوں کا ملخص یہ ہے۔

ما فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا مودودی کو چاہیے تھا کہ ان اصطلاحات پر ناراضگی کا اظہار کر کے اپنی اصطلاحات پیش کرتے۔ مگر انھوں نے وہی کیا ہے جو کسی شاعر نے کیا تھا۔ اس نے ایک مولوی صاحب کے حق میں جن سے اس کو کچھ چپقلش تھی۔ یہ شعر کہا تھا ہے

واعظ شہر کہ مردم لکش می خوانند قول مانیز ہمیں است کہ او مردم نیست

یعنی شاعر کہتا ہے کہ لوگ مولوی صاحب کو فرشتہ کہتے ہیں۔ ہم بھی ان کے حق میں یہی کہتے ہیں کہ وہ آدمی نہیں ہیں بقی رہی یہ بات کہ وہ ہیں کیا یہ درلین شاعر۔

اسی طرح جناب مودودی صاحب نے کمال کیا کہ ان اصطلاحات کے متعلق اپنا بحث یہ ظاہر نہیں کیا۔ اگر ظاہر کر دیتے تو ہم بھی اس پر غور کرتے۔ اب تو آپ اس مصرع کے تحت خیریت ہے۔

نگفتہ ندارد کسے با تو کار!

آپ نے بڑی خفگی کے لہجہ میں ان اصطلاحات کے ماتحت ہمیں بُرے نتائج سے ڈرایا ہے ہم اس کے جواب میں بجز اس کے کیا کہیں۔

ناصر انا تو دل میں تو سمجھ اپنے کہ ہم لاکھ نادان ہیں کیا تجھ سے بھی نادان ہونگے

مولانا مودودی صاحب جب ان اصطلاحات کی خرابیوں کا اظہار کریں گے جو ان کے ذہن میں ہیں تو ہم بھی ان کا جواب دیں گے یا قبول کر لیں گے۔ سیر دست تو ہم ان خرابیوں کو بچتوں کا ہونا



تھے ہیں۔

کئی سال ہوئے اگر وہیں ایک جلسہ اسلامیہ ہوا تھا جس میں مختلف مذاہب کے واعظ جمع تھے۔ سنی بھی تھے، شیعہ بھی تھے۔ میرے جیسے اہل حدیث بھی تھے۔ میں نے اپنی تقریر میں بڑی نرمی کے ساتھ اُتباعِ سنت کا شوق دلانے کو کہا۔ جو کام حضور علیہ السلام نے کیا وہ بلا کھٹکا کرو۔ جو نہیں کیا وہ مت کرو۔ میرے دل میں چونکہ بدعاتِ مروجہ سے نفرت تھی۔ اس لئے میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ حضور علیہ السلام نے اگر تعزیر بنایا تھا تو بنا لو۔ اگر نہیں کیا تھا تو چھوڑ دو۔ شیعہ جماعت بھی اس جلسہ میں شریک تھی۔ ان کے ایک زبردست واعظ بھی موجود تھے۔ وہ بھلا اس اصول کو سن کر کیسے خاموش رہتے۔ میرے بعد وہ اُشیخ پر آئے۔ آنحضرت علیہ السلام کی بڑی تعریف کی آپ کو بہت بڑھایا۔ نتیجہ کے طور پر بتایا کہ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایسے نبی نے جو کچھ کیا تھا وہی ہم کریں“ مطلب یہ تھا کہ اُتباعِ سنت کی پابندی ہم سے اُٹھا دی جائے۔ بلکہ ہمیں آزاد چھوڑ دیا جائے جس رسم کو چاہیں داخلِ مذہب کر لیں۔ میں نے یُن کہہا سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يَتْرُكَ سُدًى

اب میں بتاتا ہوں کہ مولانا مودودی صاحب نے مذکورہ اقتباس میں اپنا جو خیال بتایا ہے۔ دراصل یہ حقیقی مسلک ہے۔ کتبِ اُصول ”نور الانوار“ وغیرہ میں لکھا ہے کہ افعالِ نبوی دُو قسم کے ہوتے ہیں۔ سُننِ ہدیٰ اور سُننِ زوائد۔ سُننِ ہدیٰ ان افعال کو کہتے ہیں جو از قسم عبادت ہوں اور ان پر ثواب مرتب ہو۔ اور سُننِ زوائد وہ ہیں جو بہ نیت عبادت نہیں بلکہ بطور عادت کے کئے ہوں۔ چنانچہ وہ انہی میں مندرجہ ذیل افعالِ نبویہ کو شمار کرتے ہیں۔ صبح کی سُننیں پڑھ کر دائیں کروٹ ذرا سالیٹ جانا۔ دوسری اور چوتھی رکعت کو اُٹھتے وقت ذرا بیٹھ جانا۔ جس کو ”جلسہ استراحت“ کہتے ہیں۔ عید الفطر کی نماز کو کچھ کھا کر جانا۔ اور عیدِ اضحیٰ کی نماز کو بغیر کھلے جانا۔ اس قسم کے بہت سے افعالِ نبویہ حنفیہ کے نزدیک سُننِ زوائد میں داخل ہیں۔ محدثین کے نزدیک یہ سب سُننِ ہدیٰ ہیں۔ صحابہ کرام کی روش سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حتیٰ الامکان کسی فعل کو نہیں چھوڑتے تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی نسبت روایت ہے کہ وہ مکہ مدینہ کے درمیان ایک مقام پر پہنچ کر ضرور اونٹ سے اُتر آتے اور پیشاب کرنے بیٹھ جاتے۔ پوچھنے پر فرمایا کہ میں نے آنحضرت علیہ السلام کو یہاں پر بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔



مجھے تو ہے منظور مجنوں کو لیلیٰ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی  
 ہمیں مولانا مودودی کے اس مسلک پر اعتراض نہیں بلکہ ہم خوش ہیں کہ انھوں نے اپنا  
 مسلک صاف لفظوں میں بتا دیا۔ گو انھوں نے یہ حوالہ نہیں دیا کہ یہ کس گروہ کا مسلک ہے۔ شاید  
 یاد نہ ہو گا۔ قرآن مجید غور سے پڑھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آیت کریمہ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ  
 فَأَتَّبِعُونِي اپنے معنی میں بہت وسیع ہونے کی وجہ سے ہر قسم کے افعال نبویہ کو شامل ہے سین  
 ہدیٰ اور زوائد کا امتیاز باقی نہیں رہنے دیتی۔ بلکہ آواز بلند کہتی ہے۔  
 بندہ عشق شدی ترک نسب کن جانی کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست  
 (اہل حدیث ۲ نومبر ۱۳۸۷ء)

کچھ شک نہیں کہ لفظ تقلید بمعنی معروف نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں  
تقلید و عدم تقلید بلکہ علماء اصول کا ایک اصطلاحی لفظ ہے جب سے ہندوستان میں  
 بحث تقلید کا چرچا ہوا ہے۔ اس لفظ کی تعریف و تشریح کافی سے زیادہ شائع ہو چکی ہے۔ ان ساری  
 تشریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ تقلید ہے اخذ قول غیر النبی من غیر معرفۃ دلیلہ مسلم الثبوت  
 وغیرہ کتب اصول اس تعریف کی حامل ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ کسی غیر نبی کے مسئلہ شرعی کو مان لینا اس کی دلیل جاننے کے بغیر یہ  
 اس کی تقلید ہے۔ مثلاً دو شخص بغرض سوال ایک عالم کے پاس جائیں اور پوچھیں کہ فاتحہ خلف اللہ  
 پڑھنے کا حکم کیا ہے؟ واجب ہے یا حرام؟ وہ مولوی صاحب فرمادیں کہ واجب ہے یا  
 حرام۔ صرف اس کے اتنے قول پر یقین کرنے والا اس مفتی کا مقلد ہے۔ اور اگر پوچھے کہ  
 آپ کے فتویٰ کی دلیل کیا ہے اور وہ مفتی صاحب اپنے فتوے کی دلیل میں آیت یا حدیث پیش  
 کریں تو وہ غیر مقلد ہے۔ فتویٰ چاہے وجوب فاتحہ کا ہو یا حرمت کا۔ اس سے بحث نہیں۔  
 چونکہ خدا اور رسول کا حکم خود اپنے اندر دلیل رکھتا ہے۔ اس لئے صاحب ”مسلم الثبوت“  
 نے کھلے لفظوں میں کہہ دیا۔

فالرجوع الی الرسول لیس بتقلید (رسول کی طرف رجوع کرنا تقلید نہیں ہے)  
 کیونکہ رسول کا قول کسی دوسرے قول کا محتاج نہیں بلکہ وہ اس مثال کا مصداق۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب



اس تہید کے بعد مولانا مودودی کا فتویٰ سننے کے قابل ہے آپ فرماتے ہیں۔  
 اسلام میں دراصل تقلید سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کی نہیں ہے اور رسول  
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید بھی اس بنا پر ہے کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ اللہ کے اذن اور فرمان  
 کی بنا پر ہے۔ ورنہ اصل میں تو مطاع اور آمر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔ ائمہ کی پیروی کی حقیقت  
 صرف یہ ہے کہ ان ائمہ نے اللہ اور رسول کے احکام کی چھان بین کی۔ آیات قرآنی اور سنت  
 رسول سے معلوم کیا کہ مسلمان کو عبادات اور معاملات میں کس طریقہ پر چلنا چاہیے۔ اور اصول  
 شریعت سے جزئی احکام کا استنباط کیا۔ لہذا وہ بجائے خود آمر و ناہی نہیں ہیں۔ نہ بذات خود  
 مطاع اور متبوع ہیں۔ بلکہ علم نہ رکھنے والے کے لئے علم کا ایک معتبر ذریعہ ہو سکتے ہیں۔  
 جو شخص خود احکام الہی اور سنن نبویؐ میں نظر بالغ نہ رکھتا ہو اور خود اصول سے فردع کا استنباط  
 کرنے کا اہل نہ ہو۔ اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ علماء اور ائمہ میں سے جس پر  
 بھی اسے اعتماد ہو اس کے بتائے ہوئے طریقہ کی پیروی کرے۔ اگر کوئی شخص اس حیثیت  
 سے ان کی پیروی کرتا ہے تو اس پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں لیکن اگر کوئی شخص ان کو  
 بطور خود آمر و ناہی سمجھے یا ان کی اطاعت اس انداز سے کرے جو اصل آمر و ناہی کی اطاعت  
 ہی میں اختیار کیا جاسکتا ہو یعنی ائمہ میں سے کسی کے مقرر کردہ طریقہ سے ہٹنے کو اصل  
 دین سے ہٹ جانے کا ہم معنی سمجھے اور اگر کسی ثابت شدہ حدیث یا صریح آیت قرآنی  
 کے خلاف ان کا کوئی مسئلہ پایا جائے تب بھی وہ اپنے امام کی پیروی پر اصرار کرے تو یہ  
 بلاشبہ شرک ہوگا۔“ (ترجمان القرآن ماہ رمضان و شوال ۱۳۷۷ھ ص ۸۷)

اس اقتباس میں مولانا موصوف سے اگر غلطی نہیں تو سہو و نسیان ضرور ہو رہا ہے کہ تقلید کے  
 جو معنی علمائے اصول کی اصطلاح میں ہیں۔ انھوں نے چھوڑ دیئے ہیں۔ یا اس سے ان کو بھول ہو گئی  
 ان معنی سے کوئی رسول کا مقلد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ تقلید دل سے بے علمی کا نام ہے۔ چنانچہ  
 حجت الاسلام حضرت امام غزالیؒ کتاب ”المستصفیٰ“ میں لکھتے ہیں کہ التقليد لیس فی شیئ من  
 العلم و تقلید علم کا درجہ نہیں (تو جو شخص رسول علیہ السلام کی بات سن کر مانے اس کو اصل دلیل کا  
 علم حاصل ہو چکا۔ وہ مقلد کیسے ہوا؟ مولانا موصوف کو سہو ہو گیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے خیال نہیں  
 فرمایا کہ تقلید علماء اصول کے نزدیک تو بے علمی کا درجہ ہے اور علماء فلسفہ کی اصطلاح میں عدم



ملکہ کا درجہ ہے۔ فافہم فائدہ دقیق۔

مختصر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع فرض و واجب ہے تقلید منہ فرض واجب نہیں، بلکہ ان کی اتباع کو تقلید کہنا جائز ہی نہیں۔ ورنہ لازم آئے گا کہ خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سب مقلد تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو مولانا روم جیسے صوفی بزرگ مقلد کی شان میں یہ شعر کیوں لکھتے۔

اے مقلد بہت چوں طفل علیل! گرچہ دارد بحث باریک و دلیل!

(مقلد ہمارے بچے کی طرح ہے چاہے جتیں اور باتیں بہت بنائے۔) (مثنوی)

چند سال گذرے ہیں کہ میرا مکالمہ دربارہ تقلید میرے مکرم دوست مولوی مرتضیٰ حسن صاحب دیوبندی سے ہوا تھا۔ جو اخبار ”اہل حدیث“ اور ”العدل“ کو جرئوالہ میں شائع ہوتا رہا۔ موصوف نے اس میں ایک نئی بات پیدا کی تھی کہ سب سے پہلا غیر مقلد شیطان تھا جس نے خدا سے سجدہ آدم کے لئے دلیل طلب کی تھی۔ میں اس وقت بھی سن کر حیران ہوا تھا کہ ہمارے مخاطب اپنی کتب اصول سے جن پر ان کو ناز ہے کیوں ایسے بے خبر ہو گئے ہیں کہ وہ شیطان کو خدا سے طالب دلیل کہہ کر غیر مقلد بناتے ہیں وہ نہیں سوچتے کہ خدا کے حکم سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ امرتسر کے ایک جلسہ دیوبندیہ میں مولوی خیر محمد صاحب جالندھری نے بھی یہی مضمون میرے جواب میں کہا تھا جس سے مجھے مزید تعجب ہوا۔ آخر مجھے امام غزالیؒ کے قول سے تسلی ہوئی کہ تقلید علم کا درجہ نہیں۔

مولانا مودودی نے علماء مجتہدین کا جو منصب بتایا ہے وہ ٹھیک ہے کہ وہ موجد حکم نہیں، بلکہ مبلغ حکم ہیں۔ مگر عامی لایعلم کو ان (مجتہدین) کے بتائے ہوئے مسئلے کا مقلد بنانا قابل غور بات ہے۔

کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہوئے یا نتیجہ یہ ہوا کہ سائل ان ائمہ سے ایک امام کو اپنا واجب الاتباع ضرور قرار دے لے حالانکہ یہ کوئی دینی مسئلہ نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ عامی آدمی کو اپنے

لے یہ مضمون بعد میں بصورت رسالہ موسومہ ”تنقید تقلید“ طبع ہوا

الہیہ قام لرنہا چاہتے ہیں۔ وہ ان کی خوش فہمی ہے۔



ہر مخاطب عالم سے مسئلہ پوچھ لینا چاہیے۔ چنانچہ ”ردالمحتار شامی“ میں شیخ ابن ہمام کا قول درج ہے کہ  
 ”زمانہ سلف میں یہی دستور تھا کہ نام آدمی اپنے شہر کے جس مفتی سے چاہتا فتویٰ پوچھ لیتا۔“  
 ہمارے خیال میں ان دو سوالوں میں فرق ہے۔ ایک سوال کے الفاظ یہ ہیں کہ سائل کہتا  
 ہے مولوی صاحب! فلاں مسئلے میں خدا اور رسول کا کیا حکم ہے؟ دوسرے سوال کے الفاظ یہ  
 ہیں کہ مولوی صاحب! فلاں مسئلے میں حنفی مذہب کا کیا فتویٰ ہے؟

مولانا موصوف بتائیں کہ دونوں سوالوں میں سے کس سوال کے الفاظ ان کے نزدیک صحیح ہیں  
 اور کس کے غلط۔ ہم پچھلے سوال کے الفاظ کو غلط سمجھتے ہیں کیونکہ اس سائل نے پہلے ہی حنفی فقہ کو  
 واجب الاتباع مذہب مان رکھا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں بلکہ اصل واجب الاتباع مذہب  
 خدا اور رسول کا حکم ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ اَتَّبِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ  
 دُونِهِ اَوْ لِيَاءِ رَعِیَّةٍ (پ)

ہم مولانا مودودی کو دوستانہ مشورہ دیں تو غالباً کوئی شکایت نہ ہوگی کہ وہ مسئلہ تقلید  
 کے متعلق کتاب ”معیار الحق“ مصنفہ مولانا ندیر حسین صاحب دہلوی اور ”الارشاد“ مصنفہ  
 مولوی ابوبکی صاحب شاہجہانپوری ملاحظہ فرمائیں تو ان پر مسئلہ تقلید اور عدم تقلید خوب واضح  
 ہو جائے گا۔ میر دست میں اس بارے میں اس پر اکتفا کرتا ہوں۔ ع

کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہے داستاں میری



# مسجد اہل حدیث مالیر کوٹلہ کی امامت کا معاملہ

## اور حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کا اصولی فیصلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جماعت اہل حدیث مالیر کوٹلہ میں کچھ عرصہ سے ایک سخت نزاع پیدا ہو گیا ہے۔ نزاع نے اس قدر طول کھینچی کہ پولس کو حفظ امن کے لئے مداخلت کرنی پڑی۔ اور بالآخر اصلاح حال اور رفع نزاع کے لئے معاملہ تین ثالثوں کے سپرد کیا گیا جو حضرات ثالث مقرر ہوئے ہیں انھوں نے معاملہ کی تفصیلات سے مجھے مطلع کیا اور لکھا کہ جماعت کے دونوں فریق چاہتے ہیں کہ معاملہ آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ آپ جو فیصلہ کر دیں گے اس کی بلا چون و چرا تعمیل کی جائے گی۔ میں نے انھیں لکھا کہ دونوں فریق اپنا ایک ایک معتمد نمائندہ دہلی بھیجیں تاکہ دونوں فریقوں کا نقطہ متخیال مجھے معلوم ہو جائے اس کے بعد جس نتیجہ پر پہنچوں گا لکھ کر بھیج دوں گا۔

چند دنوں کے بعد ثالثوں نے مجھے اطلاع دی کہ دونوں فریقوں نے اپنی اپنی انجمنوں کا باقاعدہ جلسہ کر کے دو نمائندے چن لئے ہیں۔ ایک فریق نے بابو محمد شفیع صاحب کو چنا ہے دوسرے فریق نے ماسٹر کفایت اللہ کو۔

۲۲ اگست ۱۹۵۲ء کو دونوں صاحب دہلی آئے اور مجھ سے ملے۔ دونوں صاحب اپنا تحریری بیان لائے تھے جو میں نے لے لیا۔ انھوں نے تفصیل کے ساتھ زبانی تقریریں کیں۔ جو میں نے سن لیں۔ معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں قلم بند کر کے بھیجے دیتا ہوں۔

نزاع جس معاملہ میں ہوا وہ یہ ہے کہ مسجد اہل حدیث کا امام اور خطیب بنائے نزاع کیا ہونا چاہیے؟ اور موجودہ امام مولوی محمد امین صاحب مبارکپوری اس منصب پر قائم رہیں یا انھیں سبک دوش کر دیا جائے۔



مالیر کوٹہ میں جماعت اہل حدیث کی ایک مسجد ہے جس کا انتظام انجمن اہل حدیث کی نگرانی میں ہے۔ مسجد کی امامت و خطابت کے لئے انجمن نے یہ طے کیا تھا کہ اس منصب پر ایک ایسے اہل حدیث عالم کو مقرر کیا جائے جو قرآن و حدیث کا درس دے سکے۔ اور توحید و سنت کا مبلغ ہو۔ دو سال ہوئے مولوی محمد امین صاحب مالیر کوٹہ آئے اور اس منصب پر مقرر کئے گئے۔ مولوی صاحب ممدوح جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس منصب کو جماعت اسلامی کے افکار و عقائد کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ بنالیا۔ اور یہ صورت حال بتدریج یہاں تک بڑھی کہ ان کے وعظ و ہدایت اور عملی جدوجہد کا تمام تر مرکز جماعت اسلامی کی دعوت و تبلیغ ہو گئی۔ جماعت اسلامی کا مرکز قائم کیا گیا اور بیت المال بھی کھول دیا گیا۔

اس صورت حال کی وجہ سے جماعت اہل حدیث میں اختلاف رونما ہوا۔ ایک گروہ نے اُسے پسند نہیں کیا کہ مسجد کی امامت جماعت اسلامی کی دعوت و تبلیغ کا آلہ کار بنادی جائے اس کی رائے یہ ہوئی کہ امام مسجد کو صرف مسلک اہل حدیث کے افکار و مقاصد کا مبلغ ہونا چاہیئے۔ وہ چاہتا ہے کہ مولوی محمد امین صاحب اس خدمت سے سبک دوش کر دیئے جائیں۔ دوسرا گروہ مولوی صاحب کا حامی ہے اُسے اس پر اصرار ہے کہ مولوی صاحب ممدوح امام رہیں۔ بالآخر یہ تفرقہ یہاں تک بڑھا کہ مسجد میں دو جماعتیں ہو گئیں۔ ایک جماعت مولوی محمد امین صاحب کے پیچھے نماز پڑھتی ہے دوسری ایک دوسرے صاحب (مولوی عبداللہ صاحب) کے پیچھے۔ گزشتہ رمضان میں ایک نیا جھگڑا پیدا ہو گیا۔ یعنی یہ کہ مسجد میں پہلی جماعت کس فرقہ کی ہو؟ اس پر جذبات اس قدر تنز ہو گئے کہ تصادم اور نقص امن کا اندیشہ پیدا ہو گیا اور پولیس کو مداخلت کرنا پڑی۔ پولیس نے فریقین سے پینتیس افراد کو زبردفعہ ۱۵۶ گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا۔ عدالت نے ابتدائی پیشی کے بعد کارروائی ملتوی کر دی اور ثالث مقرر ہوئے تاکہ اصلاح حال کی کوشش کی جائے۔

جو فرقہ موجودہ امام صاحب کا مخالف ہے۔ اس کی جانب سے محمد شفیع صاحب آئے تھے جو فرقہ ان کا حامی ہے اس کی جانب سے ماسٹر کفایت اللہ صاحب آئے تھے۔

اس نزاع نے ایک اصولی سوال پیدا کر دیا ہے جس کا ہمیں فیصلہ کرنا چاہیئے

**فیصلہ**

سوال یہ ہے کہ مسجد اہل حدیث کی امامت و خطابت کے منصب کو کسی دوسری



مذہبی یا سیاسی تحریک کی دعوت و تبلیغ کا ذریعہ بنانا مناسب ہے یا نہیں؟ اور جماعت اہل حدیث کے مقاصد کے پیش نظر ایسا کرنا درست ہو گا یا نہیں؟ معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ایسا کرنا درست نہیں ہو گا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس بات کا دروازہ فوراً بند نہیں کر دیا گیا تو یہ بات جماعت اہل حدیث کے لئے آئندہ طرح طرح کے مشکلات و مقاصد کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ آج جماعت اسلامی کا سوال پیدا ہوا ہے۔ کل کوئی دوسرے امام صاحب آئیں گے اور مسجد کے منبر کو دوسری سیاسی یا مذہبی تحریک کی دعوت و تبلیغ کا پلیٹ فارم بنادیں گے نتیجہ یہ نکلے گا کہ مسجد کی امامت وقت کی سیاسی یا مذہبی تحریکوں کا ایک بازو بن کر رہ جائے گی۔ اور جماعت اہل حدیث اپنے مسلک اور اصول کو محفوظ نہیں رکھ سکے گی۔

ملک میں جو سیاسی اور مذہبی تحریکیں چل رہی ہیں لوگوں کو اختیار ہے کہ اگر چاہیں تو اس میں دلچسپی لیں لیکن مسجد کی امامت و خطابت کو اس کا آلہ کار بنانا کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا۔ مسجد کا منبر صرف کتاب و سنت کی تبلیغ و تلقین کے لئے ہے۔ اسے دوسری تحریکوں کے دعائیہ (پروپیگنڈا) کا پلیٹ فارم نہیں بنانا چاہیئے۔ اگر ایسا کیا گیا تو یہ جماعت کے لئے ایک خطرناک اقدام ہو گا۔

بابو محمد شفیع صاحب نے اپنے بیان میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ جماعت اسلامی کے بعض افکار و آراء قابل اعتراض ہیں اور علماء نے ان کا رد کیا ہے۔ میں اس معاملہ میں جانا ضروری نہیں سمجھتا۔ میرے سامنے معاملہ صرف اس شکل میں آیا ہے کہ کیا اصولاً یہ بات مناسب ہو گی کہ مسجد کی امامت کے منصب کو کسی سیاسی یا مذہبی تحریک کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا جائے؟ اگر ایسا کرنا اصولاً درست نہیں ہے تو پھر اس بحث میں پڑنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ جس تحریک کا سربراہ پیدا ہوا ہے وہ کیسی ہے؟ اور اس کے افکار و آراء کیا ہیں؟ خواہ کچھ بھی ہوں لیکن امامت کے منصب کو ان کا ذریعہ تبلیغ نہیں بنانا چاہیئے۔

ماسٹر کفایت اللہ صاحب نے اپنے بیان میں اس بات پر زور دیا ہے کہ بابو محمد شفیع صاحب کی مخالفت محض جماعت اسلامی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ بعض شخصی وجوہ کی بنا پر ہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے بعض واقعات بیان کئے ہیں۔

میں نے ان واقعات کی تحقیقات ضروری نہیں سمجھی کیونکہ سوال افراد کی مخالفت اور عدم مخالفت کا نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ کا ہے۔ فرض کر لیا جائے کہ محمد شفیع صاحب کسی ذاتی



مخالفت کی بنا پر موجودہ امام صاحب کی مخالفت کر رہے ہیں لیکن پھر بھی اصلی سوال بدستور باقی ہے کہ مسجد کی امامت کو وقت کی تحریکات کا ذریعہ تبلیغ بنانا چاہیے یا نہیں؟

میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مولوی محمد امین صاحب کو اس خدمت سے سبکدوش کرنا چاہیے اور ان کی جگہ ایک ایسے اہل حدیث عالم دین کو مقرر کرنا چاہیے جو اہل حدیث کے مسلک کے مطابق قرآن و حدیث کی تعلیم دے تو حید و سنت کی تبلیغ کرے اور وقت کی سیاسی اور مذہبی تحریکوں سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو۔ اگر فوراً کسی ایسے صاحب کا تقرر نہیں ہو سکتا تو سر دست مولوی عبداللہ صاحب امامت کی خدمات انجام دیں جب تک کہ کسی زیادہ اہل شخص کی خدمات حاصل ہو جائیں۔

آخر میں میں دونوں فریقوں سے درخواست کر دوں گا کہ جو کچھ ہو چکا ہے اب اسے ایک قلم فراموش کر دیں اور بحکم **إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ** باہم دگر بخل گیر ہو کر از سر نو رشتہ اخوت کو تازہ و استوار کریں۔

ابوالکلام احمد آزاد

از اخبار اہل حدیث دہلی مجریہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء



# مسجد اہل حدیث مالیر کوٹلہ کی امامت

## مولانا محی الدین احمد قصوری صنا کے تاثرات

مالیر کوٹلہ میں مسجد اہل حدیث کے متعلق ایک تنازعہ کے سلسلے میں پچھلے دنوں مولانا ابوالکلام آزاد اعلیٰ الشیخہ وزیر ادا شرفیوضہ کا ایک فیصلہ ”الاعتصام“ میں شائع ہوا تھا۔ قصہ مختصر یہ تھا کہ مسجد جماعت اہل حدیث کی تھی۔ اس کے امام مولوی محمد امین صاحب جماعت اسلامی کے مرن تھے اہل موصوف نے مسجد کی امامت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی جماعت کا دعایتہ (پروپیگنڈہ) شروع کر دیا۔ لوگوں کو جماعت مذکور کی رکینیت، اس کے بیت المال کے قیام کی ترغیب دینا شروع کی، بعض اہل حدیث بھائیوں نے اس پر اعتراض کیا۔ اس سے جماعت میں تفرقہ پیدا ہو کر جماعت دو حصوں میں بٹ گئی اور رفاق و شقاق یہاں تک بڑھا کہ مقامی عدالت اور پولس کو دخل اندازی کی ضرورت پیش آئی۔ مقامی حکام نے معاملہ کو دینی اور مذہبی سمجھ کر فریقین کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اس نزاع میں حضرت مولانا کی طرف رجوع کریں۔ چنانچہ ایسا کیا گیا حضرت مولانا نے ایک باخبر اور معاملہ فہم شخص کی طرح فریقین سے تحریریں لیں کہ انھیں مولانا کا فیصلہ منظور ہوگا۔

حضرت مولانا کا فیصلہ ”الاعتصام“ کے شمارہ ۱۵ اکتوبر میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ یہ فیصلہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں ایک طرف حکم کی انتہائی انصاف پسندی، صراحت، معاملہ فہمی، صحت فکر اور سلامت طبع کی نہایت ہی مبرہن اور روشن دلیل ہے، وہاں اپنے امد وقت کی عدالتوں کے لئے ایسے تمام نزاعات اور فیصلہ طلب قضیوں میں بہت بڑی روشنی اور راہنمائی پوشیدہ رکھتا ہے اور جماعت اہل حدیث کے لئے یہ درس موعظت ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کی جگہوں پر کسی ایسے آدمی کو مقرر نہ کرے جو اس کے تصورات سے متفق نہ ہو۔



اور ان سے کامل طور پر تعاون نہ کر سکتا ہو جس شخص کی دلچسپی ہی کسی دوسری جماعت کے ساتھ ہو وہ ہماری مساجد میں امانت کا منصب اور ہمارے اداروں میں نظامت کا منصب اور ہمارے مدارس اور درس گاہوں میں مدرسہ کے منصب پر فائز رہ کر کس طرح دل جمعی سے کام کر سکتا ہے؟

جن دنوں میں کلکتہ میں تھا اور اخباراً قائم نکالا کرتا تھا۔ مولانا آزاد ایک قابل تقلید مثال افورٹ دہلیم کے میدان میں عیدین کی نمازیں پڑھایا کرتے تھے یہاں احتیاط کے ساتھ بھی هجوم کی تعداد بیان کروں تو ایک لاکھ ہو کر قی تھی، انھیں دنوں میں فتنہ انگیزوں نے جن میں زیادہ تعداد اہل بدع و سحر کی تھی، کچھ ہنگامہ پیدا کرنا چاہا تھا۔ حالانکہ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھی لیکن مولانا نے خود عیدین کی نمازیں پڑھانا چھوڑ دیں۔ جبکہ مولانا کے پاس بیسیوں وفد آئے جن میں کلکتہ کے بعض بڑے بڑے لوگ بھی شامل تھے لیکن انھوں نے معذرت کر دی۔

اب آپ مولانا کے فیصلے پر غور و انصاف سے نظر کریں تو انھوں نے قضیہ مولانا کا فیصلہ زیر تصفیہ میں بھی بنیادی مسئلہ کو لیا ہے۔ اور تمام جزوی مسائل کو جو دراصل اسی بڑے پیر کی شاخیں ہیں، چھوڑ دیا ہے، یعنی مسجد کی تولیت، اور یہ بدیہی چیز ہے کہ وہ جماعت اہل حدیث کا حق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ فریق مخالف میں بعض اہل حدیث بھی شامل ہوں لیکن اگر وہ اپنی جماعت کو چھوڑ کر کسی دوسرے گروہ میں شامل ہو گئے ہیں، چاہے اس شمولیت میں ان کی نیت کیسی ہی نیک اور خیر ہو تو وہ ”انہم منہم“ کا مصداق ٹھہرتے ہیں اور یقیناً وہ قابل اعتنا نہیں رہتے۔

پس حضرت مولانا منظر کا فیصلہ ان اللہ یا امرکم ان تو دو الاہنت حق بقدر اسید الی اہلہا ربیعنی مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو جس کی امانت ہو، وہ اس کے حوالے کر دیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی حقدار اور اہل کے حق سے انکار کرو، کے ماتحت نہایت صحیح، نہایت درست اور مبنی بر عدل و انصاف ہے۔ انھوں نے مسجد کی تولیت کی بنا پر امانت کے تقرر کا حق جماعت اہل حدیث مالیر کو ٹلہ کو دیا ہے اور اسی کو دینا بھی چاہیے تھا۔

معاملہ زیر غور میں عدل کی راہ تھوڑی دیر کے لئے آپ غور کریں کہ معاملہ میں عدل کی راہ کیا ہوئی چاہیے تھی؟ کیا مولانا نے اپنا فیصلہ صادر فرماتے



وقت عدل کی راہ سے انحراف کیا ہے؟ یا کیا اس فیصلے پر پہنچنے میں اُن سے کوئی اصولی بے قاعدگی یا بے ضابطگی سرزد ہوئی ہے؟

معاملہ معلومہ میں اصل سوال مسجد کی تولیت کا تھا۔ ظاہر ہے **اصل مسئلہ تولیت کا ہے** کہ مسجد اہل حدیث کی تھی جماعت اہل حدیث ہی اس کی متولی تھی۔ اس لئے امام کے تعین و عزل کا حق بھی اسی جماعت کو حاصل تھا۔ فرض کرو مقامی عجمت اہل حدیث نے کسی حُسنِ ظن کی بنا پر مولانا محمد امین صاحب کو منصبِ امامت پر مقرر کر دیا لیکن بعد میں بعض حالات کے رُومنا ہونے پر جماعت کو اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اس نے ان کو منصب سے علیحدہ کر دیا تو اس میں قباحت کی کونسی چیز تھی اور اس پر اتنا شور و غوغا کیوں مچایا گیا؟ بلکہ حق تو یہ ہے کہ مولانا محمد امین کو جب اس امر کا احساس ہوا کہ ان کے مقتدی ان کی اقتدار میں نماز ادا کرنے میں کراہت محسوس کرتے ہیں تو انھیں خود ہی اس بار کو اٹھا پھینکنا چاہیے تھا اور اگر اس روایت میں کوئی صداقت ہے کہ مولوی صاحب موصوف اس قضیہ میں پہلے ہی فریضۂ امامت سے سبکدوش ہو گئے تھے تو یقیناً انھوں نے ایک مستحسن فعل کیا اور وہ اللہ کے رسول ﷺ کی فرمائی ہوئی وعید سے بچ گئے۔ (کافی الحدیث الصحیح) اس صورت میں ہمیں جماعت اسلامی کے اراکین کی غوغا آرائی اور ہنگامہ خیزی پر اور بھی زیادہ تعجب اور افسوس ہوتا ہے۔

(الاغتصام لاہور ۳۱ دسمبر ۱۹۵۴ء)



# مولانا مودودی کی تعبیرات قرآن و حدیث کی روشنی میں

حضرت مولانا حافظ محمد گوندہ دہلوی

یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ دین (جو عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات کے مجموعہ کا نام ہے) کا ماخذ چار چیزیں ہیں۔ (۱) کتاب اللہ (۲) حدیث شریف (۳) اجماع امت جس کی سند کتاب و سنت میں موجود ہو۔ (۴) صحیح قیاس۔ ان میں اصل کتاب و سنت ہے۔ اجماع و قیاس انہی دو پر مقرر ہیں۔ کتاب اللہ متن اور حدیث اس کی تفسیر اور بیان ہے۔ اجماع حقیقت میں طریقِ عمل کا نام ہے۔ قیاس عام طور پر استدلالِ خفی کو کہتے ہیں حدیث کے ضبط اور اس سے استنباط کرنے میں محدثینِ یدِ طولیٰ رکھتے ہیں مسائلِ ضروریہ کے استقصار اور احکام کے مراتب کی تدقیق میں اہل تخریج کا پلہ بھاری ہے۔

فقہاء حدیث میں سب مجتہدین اور اکابر محدثین داخل ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اہل تخریج اور ایک اہل حدیث۔

جو فریق اختلافی مسائل کے لینے اور سمجھنے میں یہ روش رکھتا ہے (کہ پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنا پھر حدیث کی طرف۔ کیونکہ اجماع کی سند بھی دو چیزیں ہیں) پھر اقوالِ صحابہ کی طرف توجہ کی جائے۔ اگر ان کا اتفاق ہو تو فیہما ورنہ ان کا وہ قول لیا جائے جو کتاب و سنت کے زیادہ قریب ہو۔ اس پر بھی جواب نہ ملے تو وہ قول لیا جائے جہاں اصل و فرع میں فرق نہ ہو، یہی مسلک اہل حدیث ہے۔

اور جو فریق مسائل کے سلسلے میں کسی مجتہد کی طرف رجوع کرے اور اس کے طریق پر مسائل اختلافیہ کا جواب تلاش کرے وہ اہل تخریج کہلاتا ہے۔ یہ فریق رفتہ رفتہ سابق مجتہدین میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔

اہل حدیث چونکہ طریق استدلال کئی رکھتے ہیں یعنی استنباط کی بنا پر کسی خاص مجتہد کی روش کو درست قرار نہیں دیتے۔ بلکہ حقیقت حال کی جستجو میں اسی ماخذ کو لیتے ہیں جو مجتہد کا طریق کار ہو۔



اس لئے جزئیات کا استقصار دائمی شریعت سمجھ کر نہیں کرتے۔

ہاں اہل تخریج کے طریق سے ظن غالب کی بنا پر ضرورت کے وقت مستفید ہوتے ہیں حقیقت میں دونوں گروہ ایک ہی مقصد کے خواہش مند ہیں یعنی شارع کی مرضی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ جس طرح طریق استدلال میں امت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اہل حدیث اور ایک اہل تخریج عقائد کے اعتبار سے بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک اہل حق اور ایک اہل ہوا۔ اہل حق وہ ہیں جن کے عقائد کی بنیاد کتاب و سنت و اجماع پر ہو۔ اہل ہوا وہ ہیں جن کے عقائد میں کشف و رائے اور فلاسفہ کے اختیار کردہ امور کو دخل ہو اور جو آیت و حدیث ان کے خیال میں عقل و کشف و فلسفہ کے خلاف ہوں ان کی تاویل کرتے ہیں۔

سیاست کے اعتبار سے بھی دو گروہ ہیں۔ ایک اہل حق جو اس معاملہ میں کتاب و سنت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو بجائے کتاب و سنت کے یورپ و روس کے نظام کی نقل و اتارنے کی کوشش کرتے ہیں یہ سیاست میں اہل باطل ہیں۔ اہل حدیث اور حنفی وغیرہ عقائد اور سیاست میں کتاب و سنت کو مدار قرار دیتے ہیں صرف طریق استدلال میں اختلاف ہے۔ دونوں گروہوں میں مسلک کے پابند کم ہیں، بدعمل زیادہ ہیں۔ قلت و کثرت میں تفاوت ہے۔

**مسلمانوں میں فرقہ بندی** | اسلام نے سوائے اسلام کے کسی اور چیز کو مسلمان کہلانے یا بننے کے لئے مرکزی چیز قرار نہیں دیا۔ کسی نسل، نسب، رنگ، وطن،

اور زبان کا اعتبار نہیں کیا یہاں تک کہ ہجرت و نصرت (جس کی وجہ سے مہاجر و انصار کے نام سے ایک رسمی امتیاز پیدا ہو گیا تھا) کی بنا پر بھی ایسی جماعت نہیں بنائی جاسکی جو اسلام کی قائم مقام ہو۔ اسی طرح تقویٰ و پرہیزگاری کو بھی ایسی جماعت کی بنا قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اسلامی عقیدہ ہی مرکزی چیز قرار دیا جاسکتا ہے جو کتاب و سنت سے صاف طور پر ثابت ہو۔

عمل اگرچہ لازم ہے مگر اس کا لزوم عقیدہ کے لزوم کا ہم پلہ نہیں۔ اس لئے اس کو اسلامی جماعت کے لئے مرکز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ عمل سے مراد یہاں کام کرنا ہے نہ کہ التزام متابعت کیونکہ متابعت کا التزام ایمان و نجات کے لئے لازمی ہے۔



**اسلامی جماعت کا نام** | اب کوئی فرقہ اگر کسی خصوصیت کو لے کر اٹھتا ہے جو دوسرے فرقوں سے اس کو ممتاز کرے۔ تو اس صورت میں عام نام سوار نہیں معنے کے کچھ مفہوم نہیں رکھتا ہے۔ پس اس صورت میں کسی نئے فرقہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی جماعت کو اسلامی جماعت کے نام سے موسوم کرے۔ پس جو فرقہ اپنی جماعت کا نام اسلامی جماعت رکھتا ہے وہ دراصل اپنے سوا باقی فرقوں کو غیر مسلم قرار دیتا ہے۔ یعنی ان کی جماعتیں اسلامی جماعت نہیں۔ جیسے آج کل مودودی فرقہ اپنی جماعت کو جو ان کے خیال میں عین اسلام ہے، اسلامی جماعت کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

دوسرے فرقوں سے اسلامی جماعت کے نام کی نفی جو ان کے اختیار کردہ نام سے التزاماً سمجھی جاتی ہے۔ ان کے بعض عبارات میں اس کی تصریح بھی موجود ہے۔ جس سے ان کے نزدیک دوسرے فرقوں کی حیثیت اور مقام معلوم ہوتا ہے۔

ان کے خیال میں ہندوستان کے مسلمانوں پر حجت قائم ہو چکی ہے۔ اب ان کے لئے دو ہی راستے ہیں۔ یا اس تحریک کو قبول کر لیں یا یہودیوں کی طرح رد کر دیں۔ مثلاً رونداد جماعت اسلامی حصہ دوم صفحہ ۳ میں ہے۔

”اس موقع پر ایک بات نہایت صفائی کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس قسم کی ایک دعوت کا جیسی ہماری یہ دعوت ہے کسی مسلمان قوم کے اندر اٹھنا اس کو ایک بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ جب تک حق کے بعض منتشر اجزا باطل کی آمیزش کے ساتھ سامنے آتے رہیں۔ ایک مسلمان قوم کے لئے ان کو مقبول نہ کرنے اور ان کا ساتھ نہ دینے کا ایک معقول سبب موجود رہتا ہے، اور اس کا عذر مقبول ہوتا رہتا ہے۔ مگر جب پورا حق بالکل بے نقاب ہو کر اپنی خالص صورت میں سامنے رکھ دیا جائے، اور اس کی طرف اسلام کا دعویٰ رکھنے والی قوم کو دعوت دی جائے، تو اس کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا تو اس کا ساتھ دے۔ اور اس خدمت کو سرانجام دینے کیلئے اٹھ کھڑی ہو جو امت مسلمہ کی پیدائش کی اصل غرض ہے یا پھر اس کو رد کر کے ویسی پوزیشن اختیار کرے جو اس سے پہلے یہودی قوم اختیار کر چکی ہے۔ ایسی صورت میں ان دوراہوں کے سوا کسی تیسری راہ کی گنجائش اس قوم کیلئے باقی نہیں رہتی۔



مودودی صاحب نے اپنی تحریک کے رد و قبول کے متعلق اپنا نکتہ نگاہ پیش کر دیا ہے۔ اب ذیل میں اس تحریک کی خصوصیت اور اس کا مقصد انہی کے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے کہتے ہیں۔  
 ”مسلمانوں میں عموماً جو تحریکیں اٹھتی رہی ہیں اور جواب چل رہی ہیں پہلے ان کے اور اس تحریک کے اصولی فرق کو ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ اولاً ان میں یا تو اسلام کے کسی جز کو یا دنیوی مقاصد میں سے کسی مقصد کو لے کر بنائے تحریک بنایا گیا ہے لیکن ہم اسلام اور اصل اسلام کو لے کر اٹھ رہے ہیں۔ اور پورا کا پورا اسلام ہی ہماری تحریک ہے۔

ثانیاً ان میں جماعتی تنظیم دنیا کی مختلف انجمنوں اور پارٹیوں کے ڈھنگ پر کی گئی ہے مگر ہم وہی نظام جماعت اختیار کر رہے ہیں جو شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ جماعت کا تھا۔“ (رونداد جماعت اسلامی)

ان کی مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کی دعوت ان کے خیال میں جامع دعوت ہے۔ جیسے دوسرے مذاہب کی دعوت ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر مذہب اسلامی مذاہب سے خواہ سنی ہو یا غیر سنی، اہل حدیث ہو یا حنفی، اپنے مذہبی دستور میں ہر چیز کو داخل کرتا ہے مگر مودودی صاحب کے خیال میں اور کسی فرقہ کی دعوت جامع نہیں۔ شاید وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کی چونکہ تنظیم نہیں صرف وعظ ہی وعظ ہے۔ اس لئے ان کے پھلنے پھولنے اور حکومت الہیہ کے قیام میں ان کی جدوجہد کو دخل نہیں۔ اگر تنظیم ہے بھی تو اس کی غرض وغایت حکومت الہیہ کے قیام میں صرف دعوت و تبلیغ ہے۔ اس خدشہ کا جواب آئندہ ذکر ہوگا۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اسلامی عبادت کا نام دوسرے فرقوں کے لئے طعن ہے۔ کہ وہ اسلامی نہیں بلکہ ان کے یہودیوں کی طرح ہونے کی تلمیح ہے۔

اس مختصر رسمی بحث کے بعد اب ہم مودودی نظریہ پر کچھ لکھتے ہیں۔ تیرہ سو سال سے اہلسنت (اہل حدیث) یہی سمجھتے رہے ہیں کہ عبادت نماز روزہ حج ذکر تلاوت قرآن اور دیگر افعال تعظیمیہ کا نام ہے۔ مگر مودودی صاحب نے ان کا درجہ کم دیا ہے۔ اصل عبادت کسی اور چیز کو کہا ہے۔ اور ان افعال تعظیمیہ کو اس کے لئے تمرینات ٹریننگ کو رس قرار دیا ہے۔



# عبادت کے مفہوم میں غلطی کرنے سے متواتر غلطیاں

عبادت انسان کی پیدائش کا اصل مقصد ہے۔ جسے قرآن مجید نے ذکر کیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات)

میں نے جن اور انس کو صرف اپنی عبادت کے لئے بنایا ہے۔

اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت سے غرض و غایت اور سماوی کتب انبیادی مسئلہ ہے۔ اس لئے اس مسئلہ میں ٹھوکر کھانے سے ایمان و کفر و متضاد حقیقتوں کو سمجھنے میں غلطی واقع ہوتی ہے۔ اور یہی علمی غلطی عملی نظام میں بے راہ روی کا باعث بنتی ہے۔ جس کی وجہ سے شروع زمانہ سے خوارج معتزلہ نے ٹھوکر کھا کر تمام اہل کبار کو ابدی جہنمی قرار دیا ہے۔ اور بعض نے اتنا غلو کیا کہ جو یہ عقیدہ نہ رکھئے اس کے ساتھ جنگ کرنا فرض قرار دیا ہے۔ اور بعض نے اس سے ترقی کر کے یہ کہہ دیا ہے کہ جو ان سے جنگ نہ کرے وہ بھی کافر ہے۔

یہ غلطی اس نوع کی ہے کہ اس سے انسانی جدوجہد کا نظام بدل جاتا ہے۔ اس واسطے ہم نے ضروری سمجھا کہ اصل حقیقت کو واضح کر دیا جائے تاکہ عوام بلکہ خواص جو حقیقت میں عوام کی طرح ہیں غلطی میں نہ پڑ جائیں۔ اگرچہ بعض معاند اور ان کے جامد مقلدین سے تو اتنی توقع نہیں کہ وہ غور و فکر کی زحمت گوارا کریں مگر بعض اہل تحقیق جو ظاہر بینی کی بنا پر اس میں پھنس گئے ہیں اگر غور و فکر سے کام لیں گے تو اصل بات کے سمجھنے میں ان کی مدد ہوگی۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ

## حضرت مولانا تحریک کی پہلی فکری صورتیں کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

”اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کے لئے راہ راست وہی ہے جو اللہ کے رسولؐ نے اختیار کی۔ یعنی یہ کہ لوگوں کو الہدیٰ اور دین حق کی طرف دعوت دی جائے پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے اپنی بندگی اور اطاعت کو اللہ کے لئے خالص کر دیں دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک کرنا چھوڑ دیں۔ اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنائیں۔ ان کا ایک مضبوط جھنڈا بنایا جائے۔ پھر یہ جھنڈا عام احتلاقی اور مادی ذرائع سے جو اس کے امکان میں ہوں۔ دین حق کو قائم کرنے کیلئے جہاد کبیر کرے۔



یہاں تک کہ اللہ کے سوا دوسری اطاعتیں جن جن اطاعتوں کے بل پر قائم ہیں، ان سب کا زور ٹوٹ جائے، اور پورے نظام اطاعت پر وہی الہدیٰ اور دین حق غالب آجائیں۔  
(مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش ۱۱۶، ۱۱۷)

اس عبارت میں طریق اختیار کردہ کے راست ہونے پر یہ دلیل قائم کی ہے کہ یہ طریقہ اللہ کے رسول ﷺ نے اختیار کیا تھا۔ لہذا یہ حق ہے مگر اس پر غور نہیں کیا، یہ طریق کن لوگوں میں اور کن حالات میں اختیار کیا ہے۔ کیا اس کے علاوہ کوئی اور طریق کار بھی ہو سکتا ہے، جس پر عمل کیا جائے۔

اس لئے ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جو طریق آپ نے اختیار کیا تھا وہ ابتدائی دعوت کا ہے۔ جب کفار مخاطب ہوں مگر موجودہ حالات میں اصلاح حال کی دعوت ہے جس میں مخاطب مسلمان ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں دعوت کی نوعیت میں فرق ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت بنی اسرائیل کے لئے اصلاحی دعوت تھی۔ آپ نے قوم میں چھانٹ نہیں کی۔ بلکہ ہر ایک کو صالح ہو یا غیر صالح منظم کیا۔ اور ہر ایک قبیلہ پر انہی سے ایک نقیب مقرر کیا۔ ان نقباء کا یہ حال تھا کہ باڑے سے صرف دڈ ہی قائم رہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی۔

فَاَفَرَّقْ بَيْنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ (المائدہ) ہمارے اور فاسق قوم کے درمیان جدائی فرما۔  
اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا۔

فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ (المائدہ) فاسق قوم پر غم نہ کھا۔  
اور جماعت اسلامی میں ایسے لوگ بھی تھے، جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے ایک معبود بنانے کی درخواست کی۔

اجْعَلْ لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمُ آلِهَةٌ (الاعراف) ہمارے لئے ایک معبود بنا جیسے ان کے معبود ہیں۔  
اور بعض نے کہا۔

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ جَهْرَةً (البقرہ) تیری بات نہ مانیں گے جب تک ہم اللہ کو کھلم کھلا نہ دیکھیں۔

اور بہت سے لوگ پھڑے کی پرستش کرتے رہے۔ اور ہارون علیہ السلام کے قتل کے دیرے ہوئے۔  
فَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي۔ (الاعراف) قریب تھے کہ مجھے قتل کر ڈالتے۔  
اور موسیٰ علیہ السلام کو تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔



لَمْ تُوَدُّوْنِي وَقَدْ تَعْلَمُوْنَ اَنِّي رَسُوْلُ  
اللّٰهِ اِلَيْكُمْ۔ (الصف)

مجھے اللہ کا رسول مانتے ہوئے کیوں تکلیف  
پہنچاتے ہو۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی جماعت میں ہر طرح کے آدمی صالح و غیر صالح داخل تھے۔ آپ نے چھانٹ کر صرف بہترین کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کی اصلاح کا فرق ہوتا ہے۔ جب کوئی قوم مسلمان ہو تو سب کو بلا امتیاز جماعت میں شریک کرنا چاہیئے۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ کہ اگر کوئی غیر مسلم قوم غلام ہو تو اس کی آزادی کے لئے پہلے کوشش کرنی چاہیئے۔ اور آزادی کی جنگ میں سب افراد صالح و غیر صالح کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ تمام فسادات کی جڑ حقیقت میں غلامی ہے۔ اس لئے اس کو مقدم کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلے جو موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو کہا وہ یہی تھا۔

اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَءِیْلَ  
بھیج ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی گناہ گاروں کو جماعت میں شامل رکھا ہے۔ اگرچہ نجات اولیہ کا ان کو مستحق قرار نہیں دیا۔ ایک حدیث میں ہے۔

ثَلَاثٌ مِنْ اَصْلِ الْاِيْمَانِ الْكَفَّ عَمَّنْ قَالَ  
لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ لَا تَكْفُرْ بِذَنْبٍ وَلَا تَخْرُجْ  
عَنِ الْاِسْلَامِ بِعَمَلٍ وَالْجِهَادُ مَا حُضِرَ مِنْ  
بَعَثَنِ اللّٰهُ اِلَيْهِ اَنْ يَفْاْتِلَ اٰخِرُ هَذِهِ الْاُمَّةِ  
الدَّجَالُ لَا يَبْطُلُهُ جُورٌ جَائِرٌ وَلَا عَدْلٌ  
عَادِلٌ وَالْاِيْمَانُ بِالْقَدَمِ۔ (ابوداؤد)

تین چیزیں ایمان کی ہیں۔ (۱) جو لا الہ الا اللہ کا قائل ہو، اس سے رُک جانا۔ اس کو کسی (غیر مکفر) گناہ کی بنا پر کافر نہ کہو، اور نہ کسی عمل (غیر مخرج عن الاسلام) کی وجہ سے اسلام سے نکالو (۲) اور جہاد میری بعثت سے جاری ہے یہاں تک کہ اس امت کا آخری حصہ دجال سے لڑے گا۔

ظالم (امیر) کا ظلم اور عادل (امیر) کا عدل اس کو موقوف نہیں کر سکتا۔ (۳) تقدیر پر ایمان۔  
بلکہ شریعت کے ظاہری احکام میں منافق بھی داخل رہتا ہے۔ حالانکہ آخرت میں آگ کے نچلے طبقے میں ہوگا۔ مسلمان اس کا وارث ہے۔ اور وہ اس کا وارث ہے۔ ان کا نکاح نہیں ٹوٹتا۔ لڑائی میں مسلمانوں کے ساتھ شامل رہتا ہے۔ مودودی صاحب نے ان تمام امور کو نظر انداز کر دیا ہے۔



# تحریک کی بنیادی غلطی میں منطقی ربط کو دھسل

جو فلاسفہ کی اتباع میں آپ نے اختیار کیا ہے۔ احکام کی حکم و مصالح اصل علم (صلب علم) میں داخل نہیں صرف ایک قسم کی رنگینی جاذب طبع پیدا کرنے والی چیزوں میں سے ہے۔ ان کی جستجو اس حد تک جائز ہے کہ ان سے منصوص کی مخالفت لازم نہ آئے۔ ورنہ یہ زندگی و الحاد کا پیش خمیہ ثابت ہوتا ہے۔

کہتے ہیں اسلام محض منتشر خیالات اور منتشر طریقہ ہائے عمل کا مجموعہ | **منطقی ربط کی صورت** نہیں ہے جس طرح ادھر ادھر سے مختلف چیزیں لا کر جمع کر دی گئی ہوں۔ بلکہ باضابطہ نظام ہے جس کی بنیاد چند اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے ارکان سے لیکر چھوٹے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ دین دراصل حکومت کا نام ہے شریعت | **اسلام کا نظریہ سیاسی** اس حکومت کا قانون ہے۔ اور عبادت اس کے قانون اور ضابطہ کی پابندی ہے۔ (خطبات ص ۲۱۷)

اور نماز روزہ ذکر کے متعلق کہتے ہیں۔ یہ ہے اس عبادت کی حقیقت جس کے متعلق لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض نماز روزہ اور تسبیح و تہلیل کا نام ہے۔ اور دنیا کے معاملات سے اس کو کچھ سروکار نہیں۔ حالانکہ دراصل صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ اور ذکر و تسبیح انسان کو اس بڑی عبادت کے مستعد کرنے والے تمرینات ٹریننگ کورس ہیں۔ (تفہیمات ص ۵۷)

عبادت بالاسے مندرجہ ذیل امور کا پتہ چلتا ہے۔

- (۱) تمام امور اسلام میں منطقی ربط ہے۔ (۲) اگر منطقی ربط نہ ہو تو یہ امور منتشر خیالات ہوں گے۔
- (۳) ربط منطقی اس شکل مذکور میں منحصر ہے۔ (۴) نماز، روزہ، تسبیح و تہلیل، دنیوی معاملات کیلئے ٹریننگ کورس ہے۔ (۵) دنیوی معاملات میں احکام کی پابندی بڑی بات ہے۔ (۶) شریعت حکومت کے قانون کا نام ہے۔ (۷) عبادت اس کے ضابطہ اور قانون کی پابندی کا نام ہے۔ (۸) دین حکومت کا نام ہے۔

دین جو عقائد، عبادات، اخلاق و معاملات وغیرہ کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس کے اجزاء کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ یہ چیزیں دنیا اور آخرت کی اصلاح کے لئے مفید ہیں۔ ان کے بیان کردہ ربط منطقی سے مستغنی کر دیتا ہے اور ان تمام امور کی اصلاح آخرت و دنیا میں مفید ہونا ان میں ایک قسم کا منطقی ربط



پیدا کرنا ہے۔ منطقی ربط کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ان کو آپس میں بھی ایک دوسرے سے مخصوص صورت میں جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ مودودی صاحب کی غلطی سے یہ سمجھ لیا گیا کہ جو ربط ان کے دماغ میں آیا ہے۔ وہی صحیح ہے۔ اس کے سوا اور کوئی ربط نہیں۔ اور ربط کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ غلطی اس قسم کی ہے۔ جیسے آج کل بعض لوگ قرآن مجید کے ظاہری معنی کو پھیر کر ایسے بعید معنیٰ مراد لینا شروع کر دیتے ہیں جن کی تائید سلف کے بیان کردہ معانی سے نہیں ہوتی۔ بلکہ محض نئی نئی تاویلات اور اعتبارات کی ایک غیر بین صورت ہوتی ہے۔ اگرچہ بصورت اعتبار ایک حد تک ان کو برداشت کیا جاسکتا ہے۔ مگر قرآنی بیان میں تسلسل پیدا کرنے کے لئے ان کا ذکر ایک قسم کی تحریف ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن مجید کے واقعات میں ربط ہونے یا نہ ہونے میں جو اختلاف ہے ان میں صحیح قول یہی ہے کہ ربط ہے مگر ربط ثابت کرنے کے لئے قرآن مجید کے ظاہر معانی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ قرآن مجید کی تفسیر سلف سے ثابت ہے اور جو ربط بیان کرتے ہیں ان سے مروی نہیں ہے۔ پس ضروری ہے کہ ایک غیر ثابت شدہ امر کو اس طرح ذکر نہیں کرنا چاہیئے کہ ایک ثابت شدہ حقیقت میں تبدیل کرنے کی ضرورت پڑے۔ یہی حال منطقی ربط کا ہے۔ قرآن و سنت کے متعدد احکام میں ان کو اس طرح ثابت نہیں کرنا چاہیئے۔ جیسے اس بیان کردہ منطقی ربط میں ہوا ہے۔ کہ نماز، روزہ، ذکر، تسبیح و تحلیل کو غیر اصلی اور چھوٹی عبادت قرار دیا ہے۔ بڑی عبادت اور اصل کمی دوسری چیز کو قرار دیا ہے۔ چونکہ مودودی صاحب اسی عینک سے تمام مسائل کو دیکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی تمام تحریرات میں خواہ ان کا تعلق سیاست سے ہو، یا جماعت بندی سے، اس کا اثر ظاہر نظر آتا ہے۔

جب تجدید کا ذکر کرتے ہیں تو وہاں بھی چونکہ سابق مجددین نے اصل دین (حکومت) میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں کی، کوئی کامل مجدد نظر نہیں آتا۔ صرف مولانا اسماعیل شہیدؒ اور ان کے پیرو سید احمد بریلویؒ کی تحریک میں ان کو اس کا نمونہ ملتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے ایک نمونہ حکومت اسلامی کا قیام کیا تھا۔ اگرچہ آخر ناکام ہو گئے۔

(۲) کہتے ہیں اگر یہ منطقی ربط نہ ہو تو اسلامی احکام منتشر خیالات ہوں گے یعنی منطقی ربط کی صورت میں تو حقیقی اور نفس الامری امور ہوں گے۔ ورنہ خیالات میں داخل ہو جائیں گے۔ ایک امر اگر مودودی صاحب کے نظریہ پر دیکھا جائے تو حقیقت بن جاتا ہے۔ ورنہ خیال ٹھہرتا ہے۔ حالانکہ منطقی ربط نہ ہونے سے اس وقت ان میں انتشار پیدا ہوتا ہے جب ان میں کوئی امر جامع نہ ہو۔ پھر امر جامع کے عدم علم سے



ان کی نفی لازم نہیں آتی ہے۔

(۳) مودودی صاحب نے اپنے خیال میں اسلام کے اصول و ارکان اور چھوٹے چھوٹے جزئیات میں منطقی ربط اس طرح سمجھا ہے۔ (۱) اسلام ایک معاشی اور سیاسی نظام ہے۔ (۲) نماز روزہ، ذکر وغیرہ ٹریننگ کوئرس ہیں۔ (۳) عقیدہ میں اس امر کا ذکر ہے کہ حاکم اور قابل اطاعت صرف اللہ ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ”مختصر“ میں یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی دعوت توحید اور خدا پرستی محض اس معنی میں ایک مذہبی عقیدہ کی دعوت نہ تھی۔ جس طرح دوسرے مذہبی عقائد کی دعوت ہو کرتی ہے بلکہ حقیقت میں ایک اجتماعی انقلاب کی دعوت تھی۔ اس کی ضرب بلا واسطہ ان طبقوں پر پڑتی ہے جنہوں نے مذہبی رنگ میں پروہت بن کر یا سیاسی رنگ میں بادشاہ رئیس اور حکمران بن کر معاشی رنگ میں ساہوکار، مہاجن، زمین دار اور اجارہ دار بن کر عامۃ الناس کو اپنا بندہ بنا لیا تھا۔“ (تفہیمات ص ۶۸)

ایک جگہ لکھتے ہیں۔ البتہ اسلام کے حق میں اس رکاوٹ کو جس چیز نے شدید تر رکاوٹ بنا دیا ہے وہ ہماری یہ ہے۔۔۔۔۔ بے روح مذہبیت ہے جسے آج کل اسلام سمجھا جا رہا ہے۔ اس بے روح مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلام کے عقائد محض ایک دھرم کے موعومات بنا کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفہ اجتماع اور نظام تمدن کی منطقی بنیاد ہیں۔ اور اسی طرح اس کی عبادات محض پوجا اور تپسیا بنا کر رکھ دی گئی ہیں۔ حالانکہ وہ ان ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے وسائل ہیں۔ جن پر اسلام نے اپنا نظام اجتماعی تعمیر کیا ہے۔ اس عمل تحریف کا نتیجہ ہے۔ کہ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی، کہ آخر ایک سیاسی، معاشی، تمدنی لائحہ عمل کو چلانے کے لئے ان عقائد اور عبادات کی ضرورت ہی کیا ہے۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش ص ۱۲)

اس منطقی ربط کے سمجھنے کے بعد مودودی صاحب نے اس طرح اسلام کو سمجھا ہے پہلے اصل الاصول کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کو لیا ہے۔ (۱) اللہ کے معنی معبود کے (جو مشہور ہیں) کہے ہیں۔ (۲) اور عبادت کے معنی اطاعت کے لئے ہیں۔ (۳) اطاعت چونکہ حکم کی تعمیل کا نام ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حاکمیت اللہ کے ساتھ مختص ہے۔ (۴) انبیاء علیہم السلام نے جو زندگی کے لئے نظام مرتب کیا ہے۔ اس کا مرکز یہی عقیدہ ہے۔ اس سے یہ سمجھا کہ انبیاء علیہم السلام کی آمد کا اصل مقصد حکومت الہیہ کا قیام ہے۔ (۵) اور اس کے قیام میں کوشش کرنا یہی اصل عبادت ہے۔ ارکان اسلام جو پوجا پاٹ کی صورتیں ہیں

لے مودودی صاحب الہ کا مفہوم اقتدار کرتے ہیں۔ (مرتب)



وہ اصل عبادت نہیں بلکہ اصل عبادت کے لئے ٹریننگ کورس ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی غرض چونکہ حکومت الہیہ کا قیام ہے۔ اس واسطے مجدد کا اصلی کارنامہ بھی یہی ہونا چاہیے کہ جاہلیت کے هجوم سے اسلام کو از سر نو چمکا دینا، اس پر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ مجدد کا مقام خالی ہے۔ اس جگہ قابل تحقیق امر یہ ہے کہ عبادت کی حقیقت کیا ہے۔ کیا عبادت صرف طاعت ہے۔

عبادت حقیقت میں تعظیم مخصوص کا نام ہے۔ یعنی جو تعظیم اس خیال پر بجالائی جائے کہ معظم میرا مشکل کشایا حاجت روا ہے۔ حاجت روائی یا مشکل کشائی سے غیبی قوت یا قہری شفاء سے حاجت روائی یا مشکل کشائی مراد ہے۔

قرآن مجید میں ہے۔

وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ  
إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي  
سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ۝

تمہارے رب نے کہا مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ جہنم میں ذلیل و خوار ہوں گے۔

پہلے شروع آیت میں دعا کرنے یعنی مانگنے کا ذکر ہے۔ اور آخر آیت میں اس کو عبادت کہا ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ جس تعظیم سے غرض مشکل کشائی و حاجت روائی ہو۔ وہ عبادت ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔

الدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ

عبادت دراصل مانگنے کا نام ہے۔

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا۔

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنِ دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ ۝ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِينَ ۝ (الاحقاف)

اس شخص سے بڑا گواہ کون ہے جو ان سے مانگتا ہے جو اس کی مشکل حل نہیں کرتے بلکہ انکی طلب سے بے خبر ہیں اور جب لوگ جمع ہوں گے تو ان کے دشمن بن جائیں گے۔ اور ان کی عبادت سے انکار کریں گے۔

مگر

اس آیت میں پہلے مانگنے کا ذکر کیا اور بعد میں اس کو عبادت سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو تعظیم مانگنے کے لئے ہو وہ عبادت ہے۔ مگر مطلق مانگنا مراد نہیں بلکہ ایسی چیز مانگنا



مراد ہے۔ جو صرف اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ جیسے اس آیت میں ذکر ہے۔ کہ ان کے معبود اس کے  
 دینے سے عاجز ہیں یعنی وہ صرف اللہ ہی دے سکتا ہے۔ اور لغت میں عبادت انتہائی ذلت کو  
 کہتے ہیں جیسے زختری وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے۔ حافظ ابن قیم وغیرہ نے عبادت کے معنی  
 (غَايَةُ الْمَحَبَّةِ مَعَ غَايَةِ الدُّلَا) کیا ہے۔ انتہائی محبت کے ساتھ انتہائی تعظیم و عاجزی وستی ہے۔ مگر  
 انتہائی پستی کا تعلق دل سے ہے یعنی معبودیں غیبی قوت یا قبری شفاعت کا مقام سمجھ کر اس سے محبت  
 کرے پس جو تعظیم اس اعتقاد کی بنا پر ہو جس کا ذکر کیا ہے وہ عبادت ہوگی پس طاعت کو عبادت  
 کہنا درست نہیں۔ بلکہ اس کے معنی پوجا پاٹ کا ہی لینا چاہیے، یا تعظیم مخصوص جس کا ذکر ہو چکا ہے  
 طاعت اس لئے عبادت نہیں کہ عبادت اللہ کے ساتھ مختص ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے۔

وَسُئِلَ مَنْ أَمَرَ سَلَامًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ  
 نُرْسُلْنَا أَجْعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ إِلَهًا  
 يُعْبَدُونَ (ذخرف)

یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی معرفت یہ حکم نہیں دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت کی جائے۔ یعنی  
 اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت ہونی چاہیے۔ غیر کی عبادت نہ استقلالاً  
 جائز ہے نہ تبعاً۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔

وَمَا أَمَرَ سَلَامًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا  
 نُوْحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ  
 تیسری جگہ فرمایا۔

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا لِيَاۤءِ (یٰۤاٰرَٔیَاہُ) (یٰۤاٰرَٔیَاہُ) (یٰۤاٰرَٔیَاہُ)  
 چوتھی جگہ فرمایا۔

أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا لِيَاۤءِ (یٰۤاٰرَٔیَاہُ) (یٰۤاٰرَٔیَاہُ) (یٰۤاٰرَٔیَاہُ)  
 اس نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کی عبادت ہو۔

اور اطاعت غیر کی بھی جائز ہے۔ جیسے مندرجہ ذیل آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا  
 الرُّسُلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ رِئَاۤءِ  
 اے ایمان والو! اللہ کی اور رسول کی اطاعت کرو۔ اور امراء کی بھی اطاعت کرو۔

اس آیت میں اللہ کے سوا پیغمبر اور امیر کی بھی اطاعت کا حکم ہے۔ اگرچہ پیغمبر کی اطاعت



اس لئے ہے کہ وہ رسول ہے۔ اور امیر کی اطاعت ان امور میں ہے جو اس کے سپرد ہیں۔ اگر شریعت کے خلاف حکم دے۔ تو اس کی اطاعت منع ہے۔ بہر کیف اطاعت ایک طرح سے غیر کی بھی ہو سکتی ہے۔ مگر عبادت کسی طرح بھی غیر کی جائز نہیں۔ جیسے آیات بالا سے معلوم ہوتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے طاعت اور عبادت میں ماخوذ خاص کی نسبت ہے۔ یعنی طاعت عام ہے اور عبادت خاص تعظیم کا نام ہے ہر تعظیم عبادت نہیں۔ اسی طرح ہر اطاعت عبادت نہیں۔

**عبد اور عابد میں فرق** | عبد کے معنی غلام کے ہیں۔ یہ عبودیت بمعنی غلامی سے ماخوذ ہے۔ اور عابد کے معنی پرستش کرنے والا ہے۔ اور یہ عبادت سے ماخوذ ہے۔ اور عبادت پرستش، پوجا پاٹ، تعظیم مخصوص کے معنی ہیں۔ بعض لوگ آیت ذیل سے عبودیت اور عبادت کے ایک ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔

اَنْتُمْ مِّنْ لَّبِثَرِیْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ  
(فرعون اور اس کے سرداروں نے کہا) کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں کی بات مان لیں اور ان کی قوم ہماری

پرستار ہے۔

(مومنون ۲۱)

اس آیت میں قوم بنی اسرائیل کو عابد کہا ہے۔ حالانکہ وہ فرعون کی غلامی ہی کرتے تھے پس معلوم ہوا کہ غلامی کو ہی عبادت کہا ہے۔ پس عبودیت کا عبادت ہونا ثابت ہو گیا۔

**غلطی کی وجہ** | غلطی کی وجہ یہ ہے کہ عابد مطیع کا ہم معنی سمجھا گیا ہے۔ اور اس معنی کو حقیقی سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ اس آیت کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ بعض نے عابد کے معنی پرستش

کرنے کے لئے ہیں کیونکہ فرعون بنی اسرائیل سے اپنی پرستش کرتا تھا۔ جیسے قرآن مجید کی اس قرأت (وَ اِلٰهَهُمْ تِیْرٰی عِبَادَتُکُوْ (چھوڑتا ہے) سے معلوم ہوتا ہے۔ پس اس صورت میں استدلال درست نہیں۔ اور بعض نے اطاعت کو ہی عبادت کہا ہے۔ مگر اطاعت بمعنی مجازی کہا ہے۔ یعنی لغوی معنی عبادت کا طاعت نہیں۔ بلکہ مجازاً طاعت کو عبادت کہا ہے۔ پس اس صورت میں بھی استدلال درست نہیں۔ کیونکہ یہ اطلاق مجازی ہے حقیقی نہیں ہے۔ زمر خشری نے کشاف میں تصریح کی ہے۔ پس اس آیت سے استدلال کرنا حقیقت حال ناواقفی پر مبنی ہے۔

**عبادت اور طاعت میں فرق کی دوسری وجہ** | علماء اہل سنت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ گناہ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ



ہیں جو بدو تو یہ بھی معاف ہو سکتے ہیں۔ اگر ان کی سزا بصورت جہنم ملی تو محدود ہوگی۔ اس کے بعد رہائی ہوگی۔ اخیر جنت میں دخول ہوگا۔ اور بعض گناہ ایسے ہیں، جن کی سزائیں خلود ہمیشگی ہے۔ رہائی کی امید نہیں۔ نہ بدو تو یہ معافی کی گنجائش ہے۔ اس قسم کے گناہ کو کفر و شرک، نفاق حقیقی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور پہلے گناہ وہ ہیں۔ جو ان کے علاوہ ہیں۔ یعنی مؤمن کی عملی غلطیاں ہیں جو ایمان لانے کے بعد کفر و شرک کے سوا صادر ہوتی ہے۔ جیسے جھوٹ، چغلی، بدکاری، والدین کی ناشروانی، یتیموں پر ظلم، جھوٹی گواہی، جھوٹی قسم وغیرہ وغیرہ۔

مندرجہ ذیل قرآنی آیت سے وہ استدلال کرتے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (سبا)

اللہ تعالیٰ شرک معاف نہیں کرتا، اور اس کے علاوہ جس کو چاہے معاف کر دے۔

احادیث متواترہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ آخری رہائی کے لئے شرک و کفر اور نفاق سے پاک ہونا شرط ہے۔ اگر ادنیٰ درجہ کا ایمان بھی دل میں ہوگا تو دوزخ سے رہائی ہوگی۔

مگر طاعت کو عبادت کہنے سے یہ تفریق باطل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ہر گناہ میں چونکہ نفس وغیرہ کی طاعت ہی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ نفس وغیرہ کی عبادت ہوگی۔ اور غیر کی عبادت چونکہ شرک ہے۔ اس لئے ہر گناہ ہر گناہ شرک ہوگا۔ اور شرک کی سزا قابل معاف نہیں۔ بلکہ خلود ہمیشگی ہے۔ اور یہ مذہب اہل سنت کا نہیں۔ بلکہ خوارج و معتزلہ کا ہے۔ وہ کہتے ہیں متکب کبیرہ اگر بدو تو بمرجلے تو ابدی جہنمی ہوگا۔ کیونکہ خوارج کے نزدیک وہ کافر ہے۔ اور معتزلہ کے نزدیک مؤمن نہیں۔ حکم کا اطلاق مختلف معانی پر ہوتا ہے۔ (۱) تکوینی اس جہاں میں متصرف صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے تصرف کو حکم تکوینی کہتے ہیں۔ جیسے اس آیت میں ہے۔

إِنَّ الْحُكْمَ لِلَّهِ - (یوسف)

(۲) اخروی مصلحت یا مفسدت کی بنا پر کسی امر کو واجب یا حرام وغیرہ قرار دینا حکم شرعی کہلاتا ہے۔ حکم عقلی، عقلی طور پر کسی چیز میں خوبی کا ثابت کرنا یا خرابی ظاہر کرنا یا اس مصلحت دنیوی کی بنا پر لازم یا منع قرار دینا حکم عقلی ہے۔ حکم حسی، حکم تجربی، حکم حدی وغیرہ اس کے قریب قریب ہیں۔ پس جو شخص یہ خیال کرتا ہے، کہ عبادت اصل میں طاعت کا نام ہے۔ اور پرستش اس کی ایک تکمیلی صورت ہے۔ یا اس کے تمیزین ٹریننگ کو رس ہے۔ اور طاعت میں اجتماعی نظم کے متعلقہ احکام کی



پابندی کو اصلی عبادت قرار دیتا ہے۔ تو لامحالہ اس کی تمام جدوجہد قائم شدہ اسلامی حکومت کی قانونی حدود میں طاعت و فرمانبرداری بڑی عبادت ہوگی۔ اگر اسلامی حکومت قائم نہیں تو اس کے قیام کی کوشش کرنا اس کا اصل مقصد اور بڑی عبادت ہوگی۔ اور اس کے لئے وسائل جمع کرنا، حجرہ نشینوں کی تحقیر اور اسلامی عبادت کو صرف وسیلہ سمجھ کر بقدر ضرورت اختیار کرنا ہوگا۔ اور جو شخص نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، تلاوت قرآن وغیرہ میں لگا رہے، اور اسلامی حکومت کے قیام میں زیادہ منہمک نہ رہے، یا وقتی حالات کا جائزہ لے کر اس میں سرگرم عمل نہ ہو۔ اگر اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہو مگر اس کے قائد اچھے نہ ہوں۔ تو قیادت صالح کے لئے ان کی طرح اس منطقی ربط والے طریقہ پر کاربند نہ ہو تو ایسا شخص پہلے خیال والے اشخاص کے نزدیک اصلی عبادت سے غافل اور ہدف ملامت بننے کے لائق ٹھہرے گا۔

اور جس شخص نے یہ سمجھا کہ عبادت ان چند تعظیمی امور کا نام ہے۔ جن کو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ذکر و تلاوت قرآن کہتے ہیں۔ تو ایسا شخص حتی الامکان انہیں میں لگا رہے گا اور باقی فرائض سے بری الذمہ ہونے کی کوشش کرے گا۔ اگر اسلامی حکومت قائم ہے۔ تو اس میں بغاوت نہ پھیلے گا۔ اور حکام کے ساتھ نزاع و جھگڑا نہ کرے گا۔ اگر اسلامی حکومت قائم نہیں تو اصل مقصد جو اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ اس میں لگا رہنے کے باوجود وقتی فرض سے بھی غافل نہ رہے گا۔ یعنی اسلامی حکومت کے قیام کی کوئی ممکن صورت نظر آئے تو حتی الامکان اس کے لئے بھی کوشش کرے گا۔ مگر اصل مقصد اللہ کی عبادت ہی کو سمجھے گا۔ اگر امیر یا بادشاہ غلط راستہ پر ہو، تو حتی الامکان صحیح راستہ کی طرف راہنمائی کرے گا۔ تلاوت قرآن، ذکر، نماز، روزہ کو اپنا خاص شغل بنائے گا۔

قرآن مجید میں ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ  
مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ  
يُطِيعُونِ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ  
الْمَتِينِ (الذاریات)

میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے میں ان سے روزی کمانے کا مطالبہ نہیں کرتا، اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کھلائیں۔  
یقیناً اللہ ہی رازق طاقت والا مضبوط ہے۔

ان آیتوں میں انسانی مساعی کے دو حصے کئے ہیں۔ ایک عبادت اور ایک معیشت کے اسباب و ذرائع حرفت، تجارت، زراعت، ملازمت، مزدوری کا اختیار کرنا۔ آیت کا یہ مطلب ہوا کہ انسان



عبادت کے لئے بنا ہے۔ معاشی ذرائع میں لگا رہنے کے لئے نہیں بنا۔ اگرچہ ضرورت کے وقت انکا احتیاج کرنا لازمی ہو جاتا ہے مگر ان کو عبادت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ یعنی یہ چیزیں اصل وضع میں عبادت نہیں۔ اگرچہ طاعت کی صورت میں قیود مذکور بالا کے ساتھ ان میں عبادت بننے کی صلاحیت ہے۔  
دوسری جگہ فرمایا۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ  
وَقَبْلَ غُرُوبِهَا وَمِنْ أَنْ آيِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ  
وَاطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَى وَلَا تَمُدَّنَّ  
عَيْنَكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَاهُمْ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ  
زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْثَهُمْ فِيهِ وَ  
رَبُّكَ رَبُّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَى وَأَمَّا هَلَكُ  
يَا الصَّلَاةُ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا تَسْأَلُكَ  
رَبُّكَ أَنْ تَنْزِلَ نَزْرُكَ وَالْعَاقِبَةُ  
لِلتَّقْوَى ۝

(طه)

(طہ) گئے۔ اور پرہیزگاروں کا انجام بہتر ہے۔  
اس آیت میں بھی ذکر نماز کی طرف ترغیب دلائی اور معاشی ذرائع اختیار کرنے کو مفروض سے خارج

اسی طرح ایک جگہ فرمایا۔

وَأَصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ  
رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ  
وَجْهَهُ لَا تَلْتَمِذْ لَهُمْ تَبَرَّأْتُ  
بِرَبِّهِمُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تَطْعَمَنْ  
أَعْقَلْنَا قُلُوبَهُ عَنْ دُخْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ  
أَمْرُهُ فُرْطَاتٍ (کہف)

اس آیت میں بھی صبح وشام اپنے رب کو پکارنے والوں یعنی سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ



کہنے والوں کے ساتھ رہنے کا حکم دیا۔

ایک جگہ فرمایا۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ  
اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کر اور سجدہ  
کرنے والوں میں ہو اور موت تک اپنے رب کی

عبادت کر۔

(حجر)

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ حکم نہیں دیا۔ کہ  
مال جمع کروں اور تاجر بنوں۔ بلکہ مجھے یہی فرمایا ہے کہ اپنے رب کی حمد اور تسبیح بیان کر اور سجدہ کر اور  
موت تک عبادت میں لگا رہ۔

ان آیات مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل انسانی زندگی کا مقصد عبادت ہے۔ اور عبادت  
نماز، روزہ و ذکر کا نام ہے۔

حدیث شریف میں ہے۔

بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ شَهَادَةِ أَنْ لَا  
إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ  
وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْحَجَّ وَ  
صَوْمَ رَمَضَانَ۔  
اسلام کا سائبان یا پنج ستونوں پر قائم ہے۔ اس  
امر کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور  
محمدؐ اس کا بندہ اور اس کا رسول ہے نماز کا قائم  
کرنا، زکوٰۃ کا ادا کرنا، حج کرنا اور ماہ رمضان

کے روزے رکھنا۔

(بخاری و مسلم)

جبریلؑ نے آنحضرتؐ سے پوچھا۔ احسان (نیکی کرنا) کیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔

أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ عَيْنًا نَكَتَ ثَرَاهُ۔  
اللہ کی اس طرح عبادت کرے کہ تو اس کو دیکھ

رہا ہے۔

(بخاری و مسلم)

اس حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عبادت پرستش ہی کا نام ہے۔

اسلامی حکومت کا قیام بھی اس لئے ہے۔ کہ عبادت میں سہولت ہو۔ جیسا آیت استخلاف  
سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کے اخیر میں فرمایا۔ يَعْبُدُونَنِي (نوم) (اللہ تعالیٰ بحسب وعدہ ان کو خلیفہ بنائے گا)  
وہ میری عبادت کریں گے۔

اور دوسری جگہ فرمایا۔



الَّذِينَ اٰتٰنَا مِنْكَ هٰذَا وَنَبَاِ الْمَعْرُوفِ  
ان کو ہم نے اگر زمین میں جگہ دی تو نماز قائم کریں  
الصلوة واتوا الزكوة وامروا بالعرفه  
گے اور زکوٰۃ دیں گے اور نیکی کا حکم دیں گے  
ونهو عن المنكر (حجر)  
اور بُرائی سے روکیں گے۔

عبادت اور طاعت اپنے آخری اثر میں ایک لحاظ سے برابر ہیں یعنی دونوں کے عالانے سے  
فلاح اور دونوں کے چھوڑنے سے خسران ہے۔ اگرچہ خسران، خسران میں فرق ہے۔

اور دار دنیا کی عادات میں اکثر جگہ مقصد دنیا کی اصلاح ہے مگر عبادت سے اصل غرض اصلاح  
دنیا نہیں بلکہ اصلاح آخرت اور رضائے الہی ہے۔ ہاں یہ ضروری بات ہے کہ عبادت سے دنیا میں ایسے  
فوائد مرتب ہوتے ہیں جن سے دنیوی امور کی بھی کچھ نہ کچھ اصلاح ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ اصلاح مقصد نہیں۔

## عبادت کی اصلی غرض اور اس کے دوسرے فوائد

حقیقت میں عبادت اس فطری امر کے اظہار کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں پیدا نشی  
طور پر رکھا ہے۔ انسان کی بناوٹ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ اس کا کمال روحانی اس کی عبادت سے  
والبتہ کر دیا گیا ہے۔ عبادت کرنے سے جنت میں داخل ہونے کی استعداد اور اللہ کے دیدار کی قابلیت  
اور جہنم کا ایندھن بننے کے خلاف ایک صفت پیدا ہوتی ہے۔ جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے۔

عبادت کے ترک سے انسان میں روحانی اندھا پن اور جہنم کا ایندھن بننے کی استعداد اور  
جنت میں داخل ہونے کی قابلیت کا فقدان ظاہر ہوتا ہے۔ اس اصل غرض کے علاوہ عبادت پر جو  
فوائد مرتب ہوتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ نماز پڑھنے سے چونکہ دل اس رنگ سے صاف ہوتا ہے۔  
جو دل کو اندھا کرتا ہے۔ اس لئے ایک قسم کی روشنی دل کو عنایت ہوتی ہے۔ جس کی بنا پر انسان گناہوں  
سے متنفر ہوتا ہے اور شہوت میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ چیز تمدن کے لئے مفید ہے۔

نماز کا طبعی فائدہ | نماز میں نجاست (گندگی ظاہری) سے پرہیز لازمی قرار دی گئی۔ طہارت، وضو  
غسل پاکیزگی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے لازمی طور پر اس کا صحت پر اچھا

اثر پڑتا ہے۔ پانچ وقت کی پابندی سے کاہلی اور سستی کم ہو جاتی ہے۔ قیام میں ٹانگوں اور رکوع میں  
پیٹھ اور سجدہ میں سب اعضا اور بیٹھنے میں پاؤں اور رفع یدین کرنے اور ہاتھ باندھنے سے ہاتھوں کے  
فضلات تحلیل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا نماز کا مقصد قرآن میں الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر بیان کیا گیا ہے۔ ہر تہ



**اقتصادی فائدہ** نماز پڑھنے اور پابندی کرنے سے جب انسانی جذبات میں اعتدال آجاتا ہے تو خواہ مخواہ اس کی اقتصادی زندگی پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ اقتصادی زندگی پر جذبات کا کم و بیش اثر ضرور پڑتا ہے۔

**سیاسی فائدہ** نماز پڑھنے سے اللہ تعالیٰ کا شعور اور پابندی اوقات سے فرض شناسی اور ضبط نفس کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ قربانی کی عادت پڑتی ہے۔ یہ اکیس سیاست میں مفید اور کارآمد ہیں۔

**معاشرتی فائدہ** نماز باجماعت سے ایک دوسرے کی پہچان اور احتلاط کی بنا پر ایک دوسرے سے انس اور رحمت و شفقت کا پیدا ہو جانا ایک واقعی امر ہے۔ ایک دوسرے کی معرفت سے ایک دوسرے کی حاجت کا احساس لایہدی چیز ہے۔ یہ جینز معاشرے کو مضبوط کرتی ہیں۔

**مساوات کا سبق** ایک صف میں بلا امتیاز فقیر و غنی، خاندانی و غیر خاندانی کا کھڑا ہونا، امام بننے کے لئے صرف قرآن کا زیادہ جاننا، سنت سے زیادہ واقف ہونا، جو پہلے آئے اس کا پہلی صف میں جگہ پانا، یہ سب امور مساوات کا سبق دیتے ہیں۔

**دینی فائدہ** اللہ تعالیٰ کا شعور، نورانیت قلب، دل کی اصلاح، ملا و علی کے ساتھ تعلق، اللہ تعالیٰ کی محبت اس سے پیدا ہوتی ہے، روح میں وہ کمال پیدا ہوتا ہے۔ جس پر نجات اخروی موقوف ہے۔ عقائد میں یسگی پیدا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض افراد یقین کے بلند مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔

مگر ان فوائد میں فرق ہے عبادت کے لئے جو دنیوی فائدے ذکر کئے گئے ہیں، وہ نماز کی غرض و غایت قرار نہیں دیئے جاسکتے کیونکہ عبادت کی حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں بلکہ صورت سے ہے مثلاً نماز کا طبعی فائدہ بعض اعضاء کے فضائل کا تحلیل ہونا، عبادت یعنی تعظیم مخصوص یا ذات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ تعظیم کی ایک مخصوص صورت کے ساتھ ہے۔

یہی حال باقی فوائد مذکور کا ہے۔ سوائے اس دینی فائدہ کے جس کے متعلق ہم نے بار بار یہ لکھا ہے کہ وہ نماز کی غرض و غایت ہے۔ یعنی دنیا میں رضا الہی اور آخرت میں نجات و فلاح



ارکان اسلام کے متعلق مولانا کا نظریہ | فرماتے ہیں۔ عام طور پر لوگ کہتے رہے ہیں۔

کہ اسلام کے پانچ ارکان کلمہ توحید و رسالت نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ، لوگ یہ سمجھتے رہے ہیں اور ایک مدت سے یہ غلط فہمی رہی ہے کہ ان ہی چیزوں کا نام اسلام ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے۔ اس سے مسلمانوں کا طریقہ اور طرز عمل پوری طرح بگڑنا گیا ہے۔ (کوثر، فروری ۱۵، بیان مودودی)

مولانا صاحب کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں ارکان اسلام کے نام سے دیے ہی مشہور ہو گئی ہیں کتاب و سنت میں اس کی کوئی سند نہیں ملتی۔ محض غلطی کی بنا پر ایسا کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں کا طرز عمل بگڑنا گیا ہے۔ حالانکہ دینی علم سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والا بھی ان امور کے ارکان اسلام ہونے کو جانتا ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب الایمان کو اسی حدیث سے شروع کیا ہے۔ اور عبادات (نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ) کی ترتیب میں اسی حدیث کو بنیاد قرار دیا ہے۔

بُنیَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ (بخاری)

امور مذکورہ کے ارکان ہونے کا ثبوت

اسلام پانچ ارکان پر بنایا گیا ہے۔ اس حدیث میں صاف طور پر مذکور ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ توحید و رسالت کا دل سے اقرار، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ کا ادا کرنا، رمضان کے روزے، بیت اللہ کا حج کرنا (بخاری) فتح الباری میں ان کو ارکان کہا گیا ہے۔

ان ہی چیزوں کو اسلام یا اسلام کے ارکان کیوں قرار دیا گیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے کتاب الایمان میں اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے معنی انقیاد کے ہیں۔ حقوق دو قسم کے ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ حقوق اللہ دو قسم پر ہیں۔ فرض اور مستحب۔ فرض دو قسم ہیں۔ فرض عین اور فرض کفایہ۔ حقوق العباد چونکہ بندوں کے حقوق ہوتے ہیں۔ اس واسطے مطالبہ انکی طرف سے قائم ہوتا ہے۔ ان کا ادا کرنا انقیاد الہی کی بنا پر نہیں ہوتا صرف انقیاد حقوق اللہ میں ہی ہوتا ہے۔ جو فرض ہیں۔ وہ چونکہ دو قسم پر ہیں۔ ایک فرض عین اور ایک فرض کفایہ۔ فرض کفایہ چونکہ بعض کے ادا کرنے سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اس واسطے صحیح معنی میں صرف انہی حقوق اللہ میں جو فرض عین ہیں۔ انقیاد الہی محقق ہوتا ہے اور وہ صرف یہی امور ہیں۔

پس اسلام سے مراد وہ انقیاد الہی ہے۔ جو لازم ہو اور اس میں اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی ہو،



اور یہ باتیں صرف انہی امور میں پائی جاتی ہیں۔

جہاد اگرچہ سب سے اہم امر ہے مگر وہ مقاصد میں داخل نہیں۔ مقصد صرف اللہ کی عبادت ہی ہے۔ اور جہاد اگرچہ ایک معنی سے عبادت ہے۔ اور بعض وقت وہ افضل عبادات بن جاتا ہے مگر پھر بھی اصل میں فرض کفایہ اور وسیلہ ہے مقصد نہیں۔

مودودی صاحب نے امور مذکورہ کے ارکان اسلام ہونے سے کیوں انکار کیا ہے۔

ان کا خیال ہے کہ پوجا پاٹ کے طریقوں کو مذہب کہا جاتا ہے۔ اور اسلام اس معنی میں مذہب نہیں۔ بلکہ ایک انقلابی نظریہ ہے۔ معاشی اور سیاسی لائحہ عمل ہے۔ معاشی اور سیاسی لائحہ عمل کے ساتھ محض پوجا پاٹ کو کوئی نسبت نہیں۔ امور مذکورہ دراصل ٹریننگ کا کام دیتے ہیں۔ اور اصل عبادت کے لئے تیار کرتے ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ان امور کو ارکان اسلام نہ کہا جائے۔ کیونکہ ان کو اگر ارکان اسلام کہا جائے گا تو غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ سمجھنے لگیں گے کہ اصل مقصد یہی امور ہیں۔ اور اصل اسلام (جو سیاسی اور معاشی لائحہ عمل ہے) کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ لوگ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، توحید و رسالت کے دلی اقرار کو ہی اہم سمجھ کر ان میں لگے رہیں گے۔ اور باقی امور کو زندگی کے ضروریات سمجھ کر ان پر عمل کریں گے۔ مقصد زندگی نہیں سمجھیں گے۔ اصل میں علماء نے لوگوں کو اس غلطی میں ڈال کر دین کی تحریف کر دی ہے۔ یہ لوگ سارا دن قال اللہ قال الرسول کی گردان کرتے رہتے ہیں۔ مگر اصل حال سے بالکل بے خبر اور ناواقف ہیں۔ ان کو کچھ پتہ نہیں کہ اسلامی تحریک کیسے چلائی جاتی ہے۔ پس دراصل یہی وجہ ہے جس کی بنا پر مودودی صاحب نے امور مذکورہ کے ارکان اسلام ہونے کو پسند نہیں فرمایا۔ مودودی صاحب کے اس خیال کا ذکر اور رد مفصل طور پر گذر چکا ہے۔ اور یہ خیالات خود غلط ہیں مقصد زندگی عبادت ہے۔ اور عبادت کا اکثر حصہ دراصل یہی امور ہیں۔ باقی اکثر چیزیں خواہ معاشی ہوں یا سیاسی ضروریات زندگی سے ہیں نہ مقصد زندگی سے۔



اصل مقصد جس کیلئے انسان پیدا کیا گیا | اپنی اگلی نسلوں میں ہم پروردگار کی  
اسلام کے لئے اپنی ناکامی (معاذ اللہ) ہو  
ہو مگر ان میں سے ہے۔

وَلَمْ يَلِدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ (معاذ اللہ) (نساء)  
ہر ایک (معاذ اللہ) کے لئے کوئی برابر نہیں ہے۔

مگر جس وقت اصل مقصد یا اعلیٰ مقصد اللہ قرار دیا جائے تو ہر جگہ معاملہ کی نوعیت ہی قسم کی  
ہونی چاہیے۔ اسی واسطے مودودی صاحب نے سب سے پہلے تو سابق متمدنوں کے کسی کو کامل متمدن قرار  
نہیں دیا۔ کیونکہ ان سے پہلے اکثر متمدنوں نے حکومت الہیہ کے قیام کی کوشش نہیں کی بلکہ حکومت  
سے بھاگتے رہے۔ اور نہ ہی کوئی جماعت اسلام جماعت کی نوعیت کی بنائی۔ جیسے مودودی صاحب  
فرماتے ہیں۔

”چونکہ میرے پیش نظر تحریک اسلامی کا اہیار ہے اس لئے مجھے بھی اسی تہذیب کے  
ساتھ اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرنی پڑی ہے جس کی طرف دیر انداز کیا گیا ہے۔“  
(یہی کشش حضرت مودودی)

”مسلمانوں میں تو مابو تحریکیں اٹھتی رہی ہیں اور جو اب چل رہی ہیں پہلے ان کے اور  
اس تحریک میں اصولی فرق کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ اولاً ان میں یا تو اسلام کے کسی جزو  
کو یا دنیوی مقاصد میں سے کسی مقصد کو لے کر بنا کر تحریک بنایا گیا۔ لیکن ہم عین اسلام  
اور اصل اسلام کو لے کر اٹھ رہے ہیں۔ اور پورا کا پورا اسلام ہی ہماری تحریک ہے۔“  
(روداد جماعت اسلامی حصار اول ص ۵)

تجدید احیاء دین مودودی صاحب کی نظر میں | تجدید دراصل ناکام ہے جاہلیت  
کے جوہر سے اسلام کو نکال کر

از سر نو چمکا دینا۔ (تجدید احیاء دین)

”پھر جاہلیت کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک جاہلیت خالصہ۔ دوم جاہلیت مشرکانہ۔  
سوم جاہلیت راہبانہ۔ ان تینوں جاہلیتوں کا اثر جو نظام حکومت پر پڑتا ہے اس کو نمایاں  
کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر ان تینوں کے نتائج متحد کرنے کی لائحہ عمل کھینچا جاتی کی ہے



پھر اسلامی نظام حکومت کا ذکر کیا ہے۔ تاکہ ان نظامات کو جو ان جاہلیتوں نے کھڑے  
کے ہیں، اسلامی نظام کے مقابل پیش کر کے ایک امتیازی خط کھینچ دیا جائے۔ جاہلیت  
خالصہ کی بنیاد دہریت پر رکھی گئی ہے یعنی انکارِ خدا پر اس کے متعلق لکھا ہے کہ اس نظریہ  
کی عین فطرت یہ ہے کہ اس کی بنیاد پر ایک خالص مادہ پرستانہ نظام اخلاق بنتا ہے۔  
یہ ظلم ملک کی شکل اختیار کرتا ہے کہ طاقتور طبقے اپنے سے کمزور طبقوں کو کھاتے اور دباتے  
ہیں۔ اور ملک کے باہر اس کا ظہور قوم پرستی (ایمپیریلزم) اور ملک گیری اور اقوام کشی کی  
صورت میں ہوتا ہے۔ (تجدیدِ احیاء دین ص ۱۱)

جاہلیت مشرکانہ میں لکھا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے اثر سے جہاں لوگ اللہ و اللہ  
قہار کی خدائی کے قائل ہو گئے۔ وہاں سے خدائی کی دوسری صورتیں رخصت ہو گئیں۔ مگر  
انبیاء اولیاء، شہداء، صالحین، مجاذیب، اقطاب، ابدال، علماء و مشائخ اور ظل اللہ کی  
خدائی پھر بھی کسی نہ کسی طرح عقائد میں سر نکالتی رہی۔ (تجدیدِ احیاء دین ص ۱۱)  
آگے چل کر لکھتے ہیں۔

مشرک انسان لامحالہ خود ہی ایک اخلاقی نظریہ بناتا ہے۔ اور خود ہی اس نظریہ کی  
بنیاد پر ایک شریعت تصنیف کرتا ہے۔ اسی طرح وہ جاہلیت محض برسرِ کار آتی  
ہے۔ (تجدید ص ۱۱)

اس کے آگے لکھتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مشرکین کی قوتِ واہمہ صد سے زیادہ  
بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے افکار میں خیالِ آرائی کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے  
اور ملاحدہ ذرا اعلیٰ قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ (تجدید ص ۱۱)

جاہلیتِ راہبانہ کے متعلق کہتے ہیں۔ یہ نظریہ بجائے خود تمدنی نظریہ ہے۔ پھر کہتے ہیں۔  
پہلی دونوں قسموں کی جاہلیتوں کے ساتھ تیسری قسم کا تعاون عموماً تین صورتوں سے ہوتا ہے۔  
(۱) یہ راہبانہ جاہلیت کے نیک اور پاک بازا افراد کو دنیا کے کاروبار سے ہٹا کر گوشہ  
عزلیت میں لے جاتی ہے۔ اور بدترین قسم کے شریر افراد کے لئے میدان صاف ہو جاتا  
ہے۔ (تجدید ص ۱۲)

(۲) وہ ان کے اندر غلط قسم کا صبر و تحمل اور مایوسانہ نقطہ نظر پیدا کر کے انہیں ظالموں



[illegible]



ان مذکورہ بالا عبارات سے ہمارے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ مودودی صاحب نے جب قیام حکومت کو اصلی غرض قرار دیا ہے۔ تو سب جگہ اسی کو پیش نظر رکھا ہے۔ ہر جگہ حکومت کی صورت و قسم ملحوظ خاطر ہے۔ اور انہی امراض کی طرف زیادہ التفات کرتے ہیں جس کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت کے ساتھ ہے۔ اور ہر جاہلیت کو گھینچ تان کر حکومت میں بے اعتدالیوں کی علت ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔

مشرک نہ جاہلیت (جس کے متعلق یہ بھی مانا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے متبعین میں گھس کر اور طرح کے گل کھلاتی ہے) کو خواہ مخواہ جاہلیت خالصہ کے ساتھ ملانے کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں۔  
”مشرک انسان خود ہی ایک اخلاقی نظریہ بناتا ہے۔“ (تجدید ص ۱۲)

حالانکہ مشرک کے لئے ضروری نہیں۔ اللہ کا انکار کرے یا اس ضابطہ اخلاق کا انکار کرے۔ جو انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے۔

اسی طرح اس کے بعد لکھا ہے۔

”بہر حال علمی حیثیت سے مشرک اور جاہلیت خالصہ میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہوتا۔

اور اس کا روشن ثبوت یہ ہے کہ یورپ اپنے موجودہ نظریات میں قدیم یونان و روم سے

اس طرح سلسلہ جوڑتا ہے گویا یہ بیٹا اور وہ باپ۔ (تجدید ص ۱۳)

بالکل غلط ہے۔ اولاً اس لئے کہ آپ دماغ میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ مشرک کے لئے ضروری ہے۔

کہ وہ کسی روحانی ضابطہ حیات کا قائل نہ ہو۔ حالانکہ مشرک اللہ کے انکار یا انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے انکار کا نام نہیں۔

ہو سکتا ہے کہ ایک شخص باوجود اس کے کہ وہ خدا کو مانتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور

ضابطہ حیات روحانی کا قائل ہو۔ عبادت میں غیر کو شریک ٹھہراتا ہے۔

ثانیاً آپ نے یہ سمجھا ہے۔ کہ یورپ کی موجودہ خرابی کی علت ان کا مشرک نہ عقیدہ ہے۔ حالاں کہ

اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ضابطہ حیات میں سماوی آئین کی پابندی کے قائل نہیں رہے۔

اسی طرح تکلف کے ساتھ شاہی خاندان اور مذہبی عہدہ داروں کا تعلق مشرک کے ساتھ جوڑنے

کی کوشش کی ہے۔

حالانکہ یہ امراض غیر مشرکین میں بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور مشرکوں کے مشرک میں اس کے پچیدا



ہوئی قطعی ضرورت نہیں۔

اسی طرح جاہلیت خالصہ میں جو یہ لکھا ہے۔

”کہ اس کی بنیاد پر ایک خالص مادہ پرستانہ نظام اخلاق بنتا ہے۔“ (تجدید منہ)

ہر حالت میں درست نہیں۔ کیونکہ بعض دہریہ بھی ایسی چیز کو مانتے ہیں جس پر روحانی ضابطہ اخلاق تیار ہوتا ہے جیسے ہڈھ کے پیروان کے ہاں خدا کا نام نہیں مگر آگ و آگن (تناسخ) کے عقیدہ کی بنا پر وہ غیر مادہ پرستانہ ضابطہ اخلاق کے قائل ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جو شخص اعمال کی جزا و سزا کا قائل ہو، خدا کو ماننے یا نہ ماننے وہ ایک طرح کا ضابطہ حیات ضرور مانتا ہے۔

اسی طرح جو بعد میں راہبانہ جاہلیت کو پہلی دونوں قسم جاہلیت سے ملانے کی کوشش کی ہے، بالکل بے معنی ہے۔ نیز اس کو مابعد الطبعی نظریہ قرار دینا بھی ایک فضول امر ہے۔ کیونکہ اس نظریہ کا تعلق اللہ کے انکار یا شرک کے ساتھ نہیں۔

اصل میں اس نظریہ کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ دنیا کی قباحت اس کے دماغ میں حد سے زیادہ جاگزیں ہو گئی ہے۔ اس کی نفرت حد سے بڑھ گئی ہے۔ راہبانیت کی مذمت میں مودودی صاحب نے مبالغہ سے کام لیا ہے۔

دین کی حفاظت کے لئے لوگوں سے الگ ہونا بعض حالات کی بنا پر جائز ہے مگر اس کو مقاصد میں شمار کرنا اور بلا امتیاز ضرورت ہر حالت میں اس کے ساتھ لپٹے رہنا درست نہیں ہے۔

**دین کی اصلاح کا نام تجدید ہے** | پس دین کی حقیقت سمجھنے کے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ دین کس چیز سے عبارت ہے۔ اور اس میں کس طرح خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور ان کی اصلاح کس طرح ہوتی ہے۔

معنی التجدید اخباء ما درس من العمل بالکتاب والسنة والامر بمقتضاها۔  
تجدید کا یہ معنی ہے کہ کتاب و سنت پر عمل کرنے اور ان کے مقتضی پر حکم کرنے میں جو سستی بے توجہی اور جہالت پائی جاتی ہے، اسکو تعلیم اور عمل کے ذریعہ دور کرنا۔  
(شرح جامی صغیر ج ۲ ص ۲۸۱)

یعنی جو دین کی باتیں مٹ گئی ہیں، لوگوں نے ان پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے، ان کو دوبارہ رائج کرنا۔

فتح القدیر شرح جامع الصغیر میں ہے۔







کی گنجائش نہیں ہے۔ حالانکہ مفاد دنیا کے اعتبار سے رد و بدل کرنے میں چندال فرق نہیں پڑتا۔ یہی غی  
اصل اللہ تعالیٰ کے احکام کی تبلیغ کے لئے آئے ہیں۔ اور یہی ان کا نصب العین ہوتا ہے۔ اور اس میں  
وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر فضا ساز گار ہو تو حکومت بھی قائم کر لیتے ہیں۔ ورنہ ہر حالت میں کامیاب  
رخصت ہوتے ہیں۔ خواہ عہد ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

بسی جو حال تجد دین کا ہے۔ اگر خلافت راشدہ کے قیام کے لئے فضا ساز گار ہو تو حکومت کا  
کام بھی ان سے سرانجام پا جاتا ہے۔ ورنہ ہر حالت میں وہ کامیاب رخصت ہوتے ہیں۔

حکومت میں اسلامی نظام العمل بنانا تو انبیاء علیہم السلام کا کام ہے۔ لیکن حکومت میں اسلامی نظام العمل  
مقام میں اضافہ داخل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کی خواہش کرنا شریعت میں اصلاح کا نہیں بلکہ  
اللہ تعالیٰ نے اس امت کو حکومت عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ آخریت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ  
میری امت کا ملک مشرق و مغرب تک پہنچ جائے گا۔ اس کے کارندے بھی ہوں گے۔ مگر وہ جو اللہ  
سے ڈرتے اور امانت ادا کرتے۔ (ابن کثیر)

اس طرح مجدد کے فرائض میں بھی حکومت پر قابض ہونا نہیں بلکہ حکومت کے امور میں جو بھی  
پیدا ہوئی ہو۔ اس کے متعلق ملی اور ملی بند و بند کرنا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ حکومت پر قابض ہونا  
یا تجدید کے منافی ہے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ اللہ کے منصب کے لئے حکومت پر قبضہ لازمی چیز نہیں ہے۔  
بلکہ امانت و جماعت ان کے لئے کوئی ضروری چیز نہیں۔ اگرچہ بعض حالات میں امانت اور جماعت کو

شکل میں نہرت و تجدید کا ظہور ہوتا ہے۔  
**مجدد اور مبتدیان کا فرق**

میں جو عقائد اور اعمال کا نیا اور نیا ہونا اس بات پر موقوف نہیں کہ اس روایہ کا ہے  
پرانے ہوں۔ بلکہ جو عقائد اور اعمال کتاب و سنت سے ثابت ہوں، اگرچہ بعض میں بعض کے بالکل  
لوگوں نے ان پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہو وہ شریعت میں پرانے ہی ہو گئے ہیں۔ اور جو عقائد  
اور اعمال کتاب و سنت میں ثابت نہ ہوں۔ اگرچہ قرون ثلاثہ میں صحابہ، تابعین و مرجعین کے  
بعد مدت طویل سے ان پر رواج چلا آتا ہو وہ بھی نہیں۔

پس بدعت اس قول و فعل کا نام ہے جو قرآن میں یا حدیث میں یا روایت میں یا جماعہ میں  
نہ ملے۔



۳۔ وہ اس میں وہ رائج ہی ہوں پس مجدد کا کام تو یہ ہے کہ دین کا جو حصہ لوگوں نے چھوڑ دیا ہے اس کو ترقی و ترقیر اور اصل سے رائج کرنے کی کوشش کرے۔ اور مبتدع وہ شخص ہے جو دین میں اپنی طرف سے کسی ایسی مصلحت کی بنا پر جس کو شریعت نے غیر معتبر قرار دیا ہے۔ امتحان اور قیاس سے کوئی چیز نکالے۔ پس عقائد اخلاقی عبادات اور معاملات وغیرہ میں جو شخص دین سمجھ کر کوئی نئی چیز نکالے۔ وہ کبھی مجدد نہیں ہو سکتا۔

مجدد کا یہ کام ہے کہ جو کام دین میں زائد ہو یعنی بدعت ہو اس کو دین سے الگ کرے۔ اور جو کام دین سے

## مجدد اور امور دین کی اصلاح

کم ہو چکا ہے اس کو جاری کرے۔ یعنی سنت کا احیاء اور بدعت کا ازالہ مجدد کا کام ہے۔

مجدد کی اصلاح کا دائرہ بعض مصالح کی بنا پر کبھی تنگ اور کبھی فراخ ہوتا ہے۔

شریعت نے حکومت کے تین مراتب قائم کئے ہیں۔

## سیاست اور حکومت

(۱) ایک خلافت علیٰ منہاج النبوت یا خلافت راشدہ۔

(۲) دوسرا خلافت راشدہ نہ ہو مگر قابل برداشت ہو۔ یعنی امیر میں سیاسی صفات خلیفہ راشد کی نہ ہوں مگر مسلم ہو۔

(۳) تیسرا درجہ جو قابل برداشت نہیں جس میں کفر بواح کھلا ہو جس کی مخالفت ہمارے نزدیک شرعی برہان ہو۔

حکومت کا پہلا مرتبہ وہ ہے جس کی بنیاد انتخاب شرعی پر ہو۔ قرآن و حدیث آئین حکومت ہو۔ مال کا انتخاب ان کی قابلیت کی بنا پر ہو۔ اعمال دیانتداری کی بنا پر حکومت کریں۔

دوسرا مرتبہ وہ ہے جس میں انتخاب شرعی طریقہ پر نہ ہو۔ بلکہ حکومت کو خاندانی چیز سمجھ کر امیر کا انتخاب ہو۔ مگر آئین اسلامی ہو۔ اگرچہ اعمال زیادہ دیانت دار نہ ہو، مگر شریعت کا نفاذ ان کا نصب العین ہو۔ اس مرتبہ کی بہت سی قسمیں ہیں۔ آئین کا اسلامی ہونا سب میں مشترک چیز ہے۔ خلیفہ سے لے کر ادنیٰ ملازموں تک دیانت داری میں اختلاف ہوتا ہے۔ بعض وقت اس میں ایسے امیر بھی منتخب ہو کر آجاتے ہیں جو اوصاف کے لحاظ سے خلیفہ راشد بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جیسے عمر بن عبدالعزیز بنی امیہ میں اور بعض خلفاء بنی عباس سے۔ اگرچہ ان دونوں حکومتوں کی بنیاد خاندان پر تھی مگر حسن اتفاق سے بعض ایسے افراد دیکھنے میں آتے ہیں جو کہ دراصل خلافت کے اہل و مستحق تھے۔ انہوں نے دیانتداری سے



حکومت بدلانے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ میں امیر کا گناہ گار ہونا قابل برداشت ہے، مگر کافر ہونا قابل برداشت نہیں۔

## تیسرا درجہ کفر یواح کا ہے

جب حاکم کافر ہو، شریعت کا منکر ہو، آئین اسلامی کا قائل نہ ہو۔ اس قسم کی حکومت قابل برداشت نہیں۔

حکومت کی دوسری قسم (خلافت راشدہ کی صورت نہ ہو) کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ بعض اہل علم و فضل کا خیال ہے۔ ایسی حکومت بھی قابل برداشت نہیں۔ مگر جمہور اہل علم کے نزدیک قابل برداشت ہے۔ اس کی مخالفت انقلابی شکل میں نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ بصورت وعظ و تذکیر کرنی چاہیے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے اصلاح کرنی مناسب ہے۔ انقلابی کارروائی سے احتراز چاہیے۔ جس قدر آئین اور اعمال میں نقص ہوں، انکو بغیر انقلابی کارروائی کے دور کرنا چاہیے۔

تیسری صورت میں انقلابی کوشش کرنی جائز، بلکہ بعض حالات میں فرض ہے۔ انقلاب کے لئے قضا سازگار بنانی چاہیے۔

فساد کے اسباب جو ہم نے بیان کئے ہیں ان کو اٹھانے کی کوشش کا نام تجدید ہے۔ خواہ مجدد کامیاب ہو یا نہ ہو۔ مگر اپنے فرض کے ادا کرنے میں وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ کیونکہ کامیابی حقیقت میں اس فرض سے بری الذمہ ہونے کا ناپ ہے جو موجودہ وقت میں اس پر عائد ہوتا ہے۔

مگر مجدد کے دائرہ عمل کے بعض صیغے اس قسم کے ہوتے ہیں جن میں رکاوٹیں کم ہوتی ہیں۔ جیسے تعلیم و عطا، تصنیف، تالیف ان میں ضرورت زمانہ کے مطابق اس کو اپنی محنت کا ثمرہ دیکھنا یا اوقات نصیب ہوتا ہے۔ اس کے وعظ سے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔ اس کی تعلیم سے دلوں کو تسکین ہوتی ہے۔ اس کی تصنیف دنیا کے لئے مشعل راہ کا کام دیتی ہے۔ اس کی صحبت سے دلوں میں تقویٰ کے آثار طہر ہوتے ہیں۔

تیسری قسم کی حکومت کے خلاف جدوجہد کی دو صورتیں ہیں۔ ایک انفرادی بصورت وعظ و تعلیم لوگوں کو انقلاب کے لئے تیار کرنا۔ دوسری اجتماعی جس میں نظم و ضبط کی سخت ضرورت ہے۔ اور حالات حاضرہ کے مطابق اس جماعت کا لائحہ عمل سختی و نرمی، اظہار و اخفا میں مختلف ہوتا ہے۔ اس جماعت کی مخالفت منع ہے۔ اس کی اعانت حتی الامکان لازمی ہے۔ اور یہ جماعت انقلابی کہلاتی ہے۔







وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْكَافِرِ

حکم سوائے اللہ کے کسی اور کا نہیں ہے

اختیارات میں ہمارا بھی کچھ ہے

هَلْ لَنَا مِنْ الْأَمْرِ شَيْءٌ نَقُولُ

ان دونوں آیتوں میں حکم اور امر الیہ کے معنی ہیں۔ تعلیم دینا اور حکم دینا میں فرق ہے۔ حکم شرعی کی طرف اشارہ ہے۔ حکم شرعی کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا طریقہ بیان کر دیا ہے۔ جس پر عمل کرنے کا طریقہ دنیا میں اللہ کی رضامندی اور آخرت میں ثواب اور عذاب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کی ناراضگی اور آخرت میں عذاب (عقوبت) کی شکل و صورت میں ظاہر ہو گا۔ جو حق پرستوں کی عدالتی حکم کا ذکر ہے یعنی عدالت میں حکم شرعی کی مخالفت نہیں ہونی چاہیے۔ اگر حکم شرعی ہو تو اس صورت میں شرعی حکم کے خلاف فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

اگر شریعت میں حکم نہ ہو تو اس صورت میں اس کے پر عمل ہو سکتا ہے۔ قرآن و سنت میں حکم کا ذکر نہ ہو تو انسان اپنی رائے سے حکم دے سکتا ہے۔

مودودی صاحب کا خیال ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد حکومت الہیہ کا قیام ہے۔ اس کی بنا پر اس منطقی ربط پر ہے۔ جو

## حکومت الہیہ کا قیام

انہوں نے سمجھا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد حقیقت میں یہ ہے کہ لوگوں کو جنت میں داخل ہونے اور دوزخ سے بچنے اور دیار الہی سے مشرف ہونے کے اعمال و عقائد بتائے جائیں۔ ان اعمال کے روح میں حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ اور اسی کا نام دین ہے۔ حکومت کا قیام ان کے مقاصد میں داخل نہیں بلکہ جسے انسانی زندگی کے دیگر شعبوں میں ان کی وحی میں ہدایات ہوتی ہیں حکومت کے متعلق بھی وہ چند اصلاحی باتیں پیش کرتے ہیں۔

حکومت چونکہ انسانی معاشرے کے لئے لازمی چیز ہے۔ اس کو عملی اور روحانی کے حقوق کا ایک نظام اختیار کرنا چاہیے۔ اور ان کے اعلیٰ مرتبہ کے نظریے کو اس طریقہ تک لے کر ان کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی غرض دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور آخرت میں ثواب کا ہونا تھا۔



يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَهِيدًا وَمُبَشِّرًا  
وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِأَذْنِهِ وَبِرَاجَا  
مُنِيرًا (سورۃ احزاب)

اسے نبی ہم نے تجھے گواہی دینے والا خوش خبری  
سنانے والا اور ڈرانے والا اور اللہ کی طرف بلانے  
والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

اس آیت میں آنحضرت کی رسالت کے پانچ مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) گواہی دینا (۲) خوشخبری  
دینا (۳) ڈرانا (۴) اللہ کی طرف بلانا (۵) روشنی دینا۔  
دوسری جگہ فرمایا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ  
يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَ  
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا  
مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (سورۃ جمعہ)

اسی (اللہ) نے بھیجا امیوں میں رسول ان سے جو  
پڑھتا ہے ان پر اس کی آیات اور ان کو پاک کرتا  
ہے اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ یقیناً وہ  
لوگ اس سے پہلے ضلّی گمراہی میں تھے۔

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین وظیفے بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) تلاوت آیات  
(۲) تزکیہ و تطہیر (۳) تعلیم کتاب و حکمت۔

حکومت کا قیام اگرچہ آنحضرت کی بعثت کا اصل مقصد نہیں مگر اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔  
کہ اس دین کا ظہور حکومت کی صورت میں ہو۔ تاکہ تمام آباد متمدن دنیا میں آپ کی بعثت کی خبر جلد پہنچ  
جائے اور تمام دنیا پر حجت قائم کر دی جائے۔ اس واسطے آنحضرت کو ایسی قوم میں مبعوث فرمایا جس میں  
فطرتاً کچھ ایسے خصائل موجود تھے جو ملک گیری اور ملک داری کے لئے موزوں تھے۔ اور بعض موانع  
تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اٹھ گئے۔ اور غیبی مدد بھی شامل حال ہوئی۔

اس لئے ایمان اور عمل صالح (جو اصل میں حالات موجودہ کی بنا پر حکومت کی علت کے لئے بمنزلہ  
اس جزو اخیر کے تھے جس سے علت پوری ہو جاتی ہے) پر خلافت کا وعدہ دیا۔ فرمایا۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا  
الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ  
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ (سورۃ نوب)

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو وعدہ دیا ہے جو ایمان لائے  
اور عمل نیک کئے ان کو زمین میں خلیفہ بنایا جائے ان لوگوں  
کو بت یا جو ان سے پہلے گذرے ہیں۔

ملک گیری کے لئے چند اسباب بیان کئے ہیں۔ (جن کے نہ ہونے سے مسلمانوں کو غزوۂ اُحد میں  
تکلیف پہنچی) کچھ مادی اور کچھ روحانی۔



(۱) اتفاق واتحاد:-

## مادی اسباب

وَأَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (آل عمران)

اللہ کی رسی (قرآن) سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور دھڑے بندی مت کرو۔

(۲) نزاع سے پرہیز:-

وَلَا تَنَازَعُوا (انفال)

نہ نزاع کرو یعنی آپس میں جھگڑانہ کرو۔

(۳) سست نہ بنو۔ وَلَا تَهِنُوا (آل عمران) سست نہ بنو۔

(۴) جم کر لڑنا۔ فَانْشُرُوا (انفال) جم کر لڑو۔

(۵) امیر کی اطاعت۔ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (نساء) اپنے امرا کی اطاعت کرو۔

(۶) مادی اسباب میں پوری تیاری کرو۔

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ (انفال)

ان (دشمنوں) کے لئے طاقت کے مطابق گھوڑے باندھنے اور دیگر امور (جہزی آلات) کو تیار کرو۔

یہ اور اس قسم کے دیگر مادی اسباب اور ذرائع جن کی طرف قرآن نے توجہ دلائی ہے۔ قدرتی طور پر جیسے میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ عرب بلحاظ استعداد علم و عمل کے اس وقت کی سب قوموں سے بہترین استعداد رکھتے تھے۔ کیونکہ علم کی بنیاد زبان کی وسعت، حافظہ اور ذہن پر ہوتی ہے۔ اور عمل کی بنیاد اندرونی خوبیوں پر ہوتی ہے۔ جن کو شجاعت، شرافت، سخاوت، اعفت وغیرہ کہتے ہیں۔ ان سب امور میں اس وقت کے عرب دیگر قوموں سے فائق تھے۔ جیسے حافظ ابن تیمیہ نے بیان کیا ہے۔

تقویٰ، صبر و استقامت کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔ فرمایا۔

## روحانی اسباب

إِنْ تَصِيرُوا (انتم صبر کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو اور یہ لوگ

وَتَقْوُوا وَيَأْتُواكُمْ مِنْ قُوَرِهِمْ هَذَا يُمْرِكُمْ (انہیں اس جوش و خروش سے آئیں تو تمہارا رب پانچ

سربلکم یخمسہ الآلوف من المملکة مسوئین) ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مادی اور روحانی اسباب کا اسلام کی ترقی کے موافق ہونا

ان سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) عربوں میں کامیاب قوموں کے صفات کا ہونا۔

(۲) ان کی خامیوں (بد اخلاقی، بے ایمانی، افتراق) کا بذریعہ اسلام بندوبست کر کے متحد و متفق



ایک دوسرے کا خیر خواہ بنا دینا۔

(۱۳) اس وقت کی بڑی بڑی متمدن قوموں کا اپنے مخصوص نظام سے اکتا جانا اور اپنے مخصوص

صفات کو کھو دینا۔

یہ اور اس قسم کے دیگر اجباب ظاہری اور باطنی اس وقت اس اُمت کے حق میں جمع ہو گئے تھے جو نایدغیبی کے ساتھ مل کر اسلامی حکومت کے قیام کا سبب بنے۔

**مودودی صاحب کی دعوت میں تبدیلی**

معروض وجود میں آگیا۔ تو مودودی صاحب بھی دارالسلام کو جیلو سے نکل کر پاکستان میں پناہ لے کر نئے پرچم ہو گئے تو پہلی دعوت میں یہ ایک تبدیلی ہو گئی۔ وہ مسابغہ طریقیہ، مسابغہ طریقیہ میں تبدیل ہو گیا۔ اور سیاسی کشمکش میں جو کچھ کہا تھا۔ اور اس طریقہ جاری کردہ غیر طریقہ انبیاء علیہم السلام کا قرار دیا تھا۔ وہ کلب حرب غلطی کی طرح مل میں مبتلا گیا۔ اور کل کی طرح اس طریقہ پر ڈال جس پر ان مسابغہ طریقیہ کے نام لگا چکے تھے۔ جن انتخاب کو شجرہ ممنوعہ قرار دے چکے تھے۔ اسی کے پھل سے۔ اے مسابغہ طریقیہ کی حیات کو

اب ان کے طریق کار میں دوسری پارٹیوں کے حربے ہی کارگر ہیں۔ یعنی دوسری پارٹیوں کے قیل و ملکہ اور کلیاب ہونے کے لئے ان کے عیوب اور اپنے فضائل بیان کرنا اور اپنے کمالات دکھانا۔ مگر عیوب اور فضائل نمایاں کرنے میں زیادہ تر شریعت اور دین سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے سادہ لوح جو حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے پرانے گڑھے سے متاثر ہو کر ان کے دم زور میں آگئے ہیں۔

مگر مودودی صاحب ابھی تک دو طریقوں کے درمیان پرکھڑے ہیں۔ جس طریق کو بادل خواستہ اختیار کر چکے ہیں۔ اس سے بھی مطمئن نہیں۔ چنانچہ ترجمان میں فرماتے ہیں۔ واضح طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ کیا اسلامی نظام کا قیام دو طریقوں سے ممکن ہے۔

الذکر ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت نظام کا رہے وہ اسلام سے معاذ اللہ اپنے مخصوص اور اپنے ان دعوؤں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کئے تھے۔ اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مقصود ہے۔ ان کے خود جسوں میں ہیں۔ یہ بات لیجئے کہ مودودی صاحب کے







## مودودی مسلک

امت مسلمہ اور جماعت اسلامی یہ دونوں کیسے پیارے نام ہیں۔ مگر ان کے تحت جو ہو رہا ہے وہ دشمنی اسلام ہے۔ پہلا فرقہ تو منکر حدیث ہے۔ کلام الہی کے ساتھ اپنی رائے سے کھیل رہا ہے اور حدیث جو قرآن کی تفسیر ہے۔ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ ظاہر اقرار اور اندر سے انکار۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے صحت حدیث کی یہ شرط کی تھی کہ میری وحی کے موافق ہو اور مودودی نے یہ شرط کی ہے کہ میرے نزدیک وہ صحیح ہے جو میرے ذوق کے موافق ہو، گمراہ فرقے اسی طرح اچھا لیل لگا کر گمراہی پھیلاتے ہیں۔ رافضی شیطان علی کہلاتے ہیں۔ معتزلہ۔ اہل العدل والتوحید۔ مرزائی احمدی، منکرین حدیث امت مسلمہ اور مودودی جماعت اسلامی وغیرہ جن فرقوں کے ظہور کو کافی عرصہ گزر گیا ہے، ان کی گمراہی کا پردہ تو چاک ہو چکا ہے۔ مگر مودودیت نے ابھی ابھی جنم لیا ہے اس سے وہ پردہ اخفا میں ہے عوام تو کجا کئی خواص بلکہ کئی مولوی بھی اس کو سراہتے ہیں جس سے یقینہ دن بدن زور پکڑ رہا ہے۔ یہاں تک کہ کئی مولوی اس میں شمل ہو گئے ہیں۔ اس وقت علمائے حقانی کا فریضہ ہے کہ وہ اس کا استیصال کریں اور لوگوں کو اس گمراہی سے بچائیں۔

۱۔ روایت و درایت اہل سنت کے کسی فرقے کا یہ مذہب نہیں ہے، کہ روایت اور درایت کا درجہ مساوی ہے، بلکہ حنفیہ تو ضعیف حدیث کو بھی قیاس پر ترجیح دیتے ہیں۔ جیسے حنفیہ کے نزدیک قہقہہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ حالانکہ قیاس چاہتا ہے کہ وضو نہ ٹوٹے، کیونکہ ان کے نزدیک نجس شے کے نکلنے سے وضو ٹوٹتا ہے۔ جیسے نکسیر پھوٹتا ہے ہونا وغیرہ اور قہقہہ تو کوئی نجس شے نہیں اس سے وضو ٹوٹنا قیاس کے خلاف ہے۔ دلیل اس کی ایک ضعیف حدیث پیش کرتے ہیں۔ ”کہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے ایک نابینا گڑھے میں گر پڑا صحابہ دیکھ کر ہنسے آپ نے ان کو



وضو ٹانے کا حکم دیا۔

اسی طرح حنفیہ کا مذہب ہے کہ کھجوروں کے شربت سے وضو جائز ہے۔ اور دلیل اس کی ایک ضعیف حدیث سے پیش کرتے ہیں۔ ”کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوروں کے شربت سے وضو کیا۔“ حالانکہ یہ بھی قیاس کے خلاف ہے۔ ایسی طہارتوں کے لئے خدائے تعالیٰ نے پانی مقرر کیا ہے۔ اور شربتوں کا حکم پانی کا نہیں۔ ورنہ دوسرے شربتوں شربت بنفثہ وغیرہ سے بھی وضو جائز ہوتا غرض ایسے بہت مقامات ہیں جہاں حنفیہ نے ضعیف حدیث کی وجہ سے قیاس کو ترک کر دیا ہے۔ اس لئے حنفیہ درایت کو روایت کا درجہ نہیں دیتے جیسا کہ فقہیہ اور نبیہ تفر (کھجوروں کا شربت) سے وضو کی مثلاً گزر چکی ہے۔ اور محدثین تو مودودی کے نظریے سے کوسوں دور ہیں۔ کیونکہ اہل الرائے سے ان کو نفرت ہے، تو درایت (جو رائے کی قسم سے ہے) کو روایت پر کیسے مقدم کر سکتے ہیں:-

مودودی صاحب کی درایت فلسفیانہ عقل ہے، فلسفیانہ عقل کا ایمان بالغیب بہت کمزور ہوتا ہے، وہ اسی کو مانتی ہے، جو اس میں سما سکے۔ جو اس سے بالاتر نہو اس میں اس کا رجحان دو چیزوں کی طرف ہوتا ہے۔ یا سرے سے انکار یا تاویل و تحریف۔

پھر اس میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ زیادہ غلو کرتے ہیں۔ جیسے سید احمد نیچری نے تفسیر لکھی تو قرآن کریم کے تمام معجزات اور خرق عادات کی تاویل کر ڈالی مثلاً موسیٰ علیہ السلام کا عصا کے ساتھ پتھر کو مارنا اور اس سے بارہ چشتے پھوٹ پڑنے کا مطلب یہ بیان کیا کہ عصا ٹیک کر پہاڑوں میں چلے، کہیں اتفاقاً بارہ چشتے مل گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو خواب میں میر کرانی گئی، ملائکہ و مشیائین سمرانیک اخلاق و بد اخلاق ہیں، یہاں تک کہ جنت و دوزخ بھی روحانی مقام ہے۔ روحوں کی خوشی اور تکلیف ہی جنت و دوزخ ہے۔

دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو اتنے غلو میں تو نہیں گئے۔ لیکن وہ آدھا تیرا آدھا بیٹر بنے رہتے ہیں جیسے مرزائی وغیرہ مثلاً عیسیٰ علیہ السلام کا جسم سمیت اٹھائے جانا اس کو نہیں مانتے ان سب باتوں سے فلسفیانہ عقل والے منکر ہیں۔







مودودی صاحب کی مثال اندھوں میں کانارا جی کی ہے ان کی جماعت خدا جانے علمی میدان میں ان کو کتنا بڑا انسان سمجھتی ہے۔ کہ ان کی اندھی تقلید کر رہی ہے۔ حالانکہ حال ان کا یہ ہے۔ کہ جس فن پر وہ تنقید کر رہے اس کے معمولی مسائل کا پتہ نہیں۔ مثلاً ذکے مقابلے میں محفوظ ہے، اور مرقع کے مقابلے میں موقوف ہے اور منقطع کے مقابلے میں متصل ہے، مودودی صاحب چونکہ زمانہ حال کے مجدد ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ہر چیز میں جدت پیدا کریں۔ اور جماعت کی طرف سے آواز آئے سبحان اللہ! اصل بات یہ ہے۔ کہ کامل استاد کے بغیر انسان کا علم پختہ نہیں ہوتا، اور جب علم پختہ نہ ہو، تو پھر ان کی بات کا توازن قائم نہیں رہتا، مودودی صاحب نے حدیث کا پایہ جتنا بلند کیا تھا۔ ظن کے دلدل میں پھنس کر اتنا ہی اس کو نیچے گرا دیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچی ہیں جن سے کوئی چیز حد سے ثابت ہو سکتی ہے۔ تو وہ گمانِ صحت ہے نہ علم یقین! (ترجمان القرآن ریح الاولیاء ص ۱۷۷)

بعض گمراہ فرقے ایسے گزرے ہیں جن کا دماغی توازن قائم نہیں ہوتا۔ وہ واقعات سے بالاتر ہو کر ایسی اویہیں میں لگے رہتے ہیں جس میں مودودی لگے ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک کہتا ہے۔ ساری امت گمراہی پر جمع ہو سکتی ہے، دلیل اس کی یہ ہے کہ

ہر ایک آدمی سے خطا ممکن الوقوع ہے۔

دوسرا اس پر تفریح کرتا ہوا یہ کہتا ہے۔

کہ قرآن مجید جن کی معرفت ہم تک پہنچا ہے وہ تعداد میں خواہ کتنے ہی ہوں آخر تحفے تو انسان ہی! تیسرا کہتا ہے۔

کہ نقل سے یقین حاصل نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ منطق کی کتاب حمد اللہ کے صفحہ ۲۲۲ پر صناعت خمس کی بحث میں معتزلہ اور جمہور اشعریہ کا مذہب لکھا ہے۔ اور ان کی دلیل یہ ذکر کی ہے۔ اول تو ایک لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پھر متکلم



کے ارادے کا علم مشکل ہے، کہ اس نے کون سا معنی ارادہ کیا ہے۔ حقیقی یا مجازی عا یا خاص، مطلق یا مقید اور کبھی یہ بھی شبہ ہو جاتا ہے، کہ شہید یہ حکم منسوخ ہو، اور ناسخ کا علم نہ ہوا ہو، نیز ناقل بعض دفعہ جھوٹا ہوتا ہے، یا اس کی طبیعت میں تکاسل (طبعاً مست ہونا) ہوتا ہے، اور اس کو ثقہ سمجھ لیا جاتا ہے اور بعض دفعہ ثقہ سے بھی غلطی ہو جاتی ہے۔

غرض اس قسم کے بہت سے شبہات ہو جاتے ہیں: تو نقل پر کس طرح یقین ہو سکتا ہے، گویا ان لوگوں کے نزدیک نہ علوم عربیہ کا کوئی مسئلہ قطعی ہے۔ نا اسلام کا کوئی عقیدہ یقینی ہے۔ گویا جنت، دوزخ، حساب کتاب، حشر نشر کوئی بھی یقینی نہیں۔ اسی طرح نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ بلکہ اس بات پر بھی یقین نہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص مدعی نبوت عرب میں گذرے ہیں۔ اور ان پر یہ کتاب اتری ہے۔ جو اہل اسلام کے ہاتھ میں ہے، بلکہ اس پر یقین نہیں کہ مکہ مدینہ وہی شہر ہیں، جن میں قرآن مجید اتر اٹھا، بلکہ اس سے یہ بھی لازم آتا ہے۔ کہ جن لوگوں نے مکہ مدینہ قسطنطنیہ لندن وغیرہ شہر نہیں دیکھے۔ ان کو ان شہروں کے وجود پر یقین نہ ہو۔ کہ یہ بھی دنیا میں شہر بس رہے ہیں۔ بچے سب کچھ صفایا ہو گیا۔

مجرد سب سے اعلیٰ ہے

نہ ہو روئے ناسالا ہے

غرض اس قسم کی متوشکافیاں کرنے والوں کی کمی نہیں: جو وہم و خیالات کی عمارت اتنی بلند کرتے ہیں، جوشِ عرا نہ تخیل سے بھی آگے گذر جاتی ہیں جس کے متعلق خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔

الْمُتَرَانَهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهْمُونَ۔ یعنی شہر ہر جنگل میں حیران پھرتے ہیں۔ اب مودودی صاحب اس میدان میں اترے ہیں، اور قلم کی ایک جنبش سے دنیا کا سارا سلسلہ ہی تہہ و بالا کر دیا ہے۔ کسی قابل استاد کی کفش برداری کی ہوتی، تو اتنی بڑی لغزش نہ کھاتے،

مودودی صاحب کا طرزِ عمل مودودی صاحب نے جس انداز سے بحث کی ہے منکرینِ حدیث کا انداز ہے۔ بلکہ دین سے متعلق ان کا قریباً سارا سلسلہ ہی گمراہ کن ہے۔ احادیث کو آپس میں اور قرآن شریف کے ساتھ ٹکرانا اور ان میں اختلافات پیدا کر کے ان کی قدر گرانا اور پھر ان کی تردید



مذہب ان کی عادات ہے۔ اس کے علاوہ حجامت، لباس کے متعلق جو احادیث آئی ہیں ان کے متعلق محدثین پر سخت حملہ کیا ہے، اور وہ ان کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے۔ لباس وضع قطع شریعت میں داخل نہیں، بلکہ عادات کی قسم سے ہیں، محدثین نے ان کو شریعت قرار دینے کی غلطی کی ہے۔ ایسے ہی دجال وغیرہ کی احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غلطی پر کہتا ہے، کہ آپ معاذ اللہ دجال کو نہیں سمجھے، گویا قریب قریب مرزائیوں والا خیال ہے۔ بلکہ ان سے بھی ترقی کر گئے ہیں۔ چنانچہ مودودی صاحب کے اصل الفاظ جو حدیث دجال کا ذکر کر کے لکھتے ہیں یہ ہیں۔

کانا دجال تو افسانے ہیں جس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔ (رسالہ ترجمان القرآن ص ۲۷)  
غرض اس قسم کی خرافات اس کی بہت ہیں جن کو سن کر یاد رکھ کر رو نگئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی تحریر اور چرب بیانی پر فریقہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس کا لٹریچر اسلام اور شریعت مطہرہ کے لئے سخت خطرناک ہے۔ خدا اس سے بچائے۔ اور اپنے دین کی حفاظت کرے۔

**محدثین اور فقہاء پر حملہ** مودودی صاحب کا خیال ہے کہ محدثین و فقہاء نے عادات نبوی کو سنت سمجھ کر اس بارے میں احادیث جمع کیں۔ یہ انھوں نے غلط رویہ اختیار کیا ہے۔ کیونکہ یہ کوئی شرعی چیز نہیں جس کی اتباع کے ہم مامور ہیں۔ چنانچہ مودودی صاحب کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

میں اسوہ اور سنت اور بدعت وغیرہ اصطلاحات کے ان مفہومات کو غلط بلکہ دین میں تحریف کا موجب سمجھتا ہوں، جو بالعموم آپ کے ہاں رائج ہیں۔

(رسالہ ترجمان القرآن ص ۷۱ ج ۱)

یہ محدثین اور فقہاء کے فہم پر حملہ ہے، قرآن مجید میں ہے جو مومنوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرے  
نَوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝ اس کو ہم پھیر دیتے ہیں جہنم پھرے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لا تجتمع امتی علی الضلالة۔ میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔  
بلکہ ایک نہ ایک فرقہ ضرور حق پر رہے گا، اور ظاہر ہے کہ وہ محدثین فقہاء (سلف صالحین) ہیں۔



دارِ اُصْحٰی کی سنت کے سلسلے میں مودودی صاحب فرماتے ہیں۔  
مگر میرے نزدیک یہی نہیں کہ یہ سنت کی صحیح تعریف نہیں ہے۔ بلکہ میں یہ عقیدہ  
رکھتا ہوں۔ کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا  
ایک سخت قسم کی بدعت اور خطرناک تحریف دین ہے۔

(رسالہ ترجمان القرآن مئی جون ۱۹۷۷ء)

یہاں اٹا چور کو توال کو ڈانٹنے والا حساب ہے، اور پھر اتنے پریس نہیں بلکہ عمومیت کے ساتھ  
اس قسم کی تمام چیزوں کو سخت قسم کی بدعت اور خطرناک تحریف دین بتا رہا ہے۔ اس بنا پر انسان  
آؤاد ہے جس قسم کی چاہے حجامت بنوائے، جیسی وضع قطع چاہے اختیار کرے، انگریزی بال  
رکھے فطرت و سنت انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کا بھی کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم کی مخالفت کا بھی کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ دس باتیں  
فطرت اسلام سے ہیں۔ بیس کٹانا، وارٹھیاں چھوڑنا، مسواک کرنا، وضو کے وقت ناک  
میں پانی چڑھانا، ناخن کٹوانا، وضو کے وقت انگلیوں کے جوڑ دھونا، بغلیں اکھیرنا، زیر ناف بال لینا  
استنجا کرنا، وضو کے وقت کرلی (کلی) کرنا، ایک حدیث میں وارٹھیاں کی جگہ ختنے کا ذکر ہے، اور ترمذی  
میں حدیث ہے، آپ نے فرمایا چار چیزیں رسولوں کی سنتوں سے ہیں۔

حیا      ختنہ      مسواک      نکاح

اگر کوئی صاحب جذبہ سنت کے تحت ان چیزوں کی پابندی اور اصرار کریں۔ تو یہ مودودی صاحب  
کے نزدیک سخت ترین بدعت اور خطرناک تحریف دین ہوگی۔

مجدد کے معنی میں تبدیلی حدیث میں ہے، کہ ہر صدی کے سرے پر مجدد ہوں گے، جو دین کی  
تجدید کریں گے۔ مودودی صاحب نے جہاں سنت و بدعت کو بدلا ہے، وہاں مجدد کے  
معنی پر بھی ہاتھ صاف کیا ہے۔ اور کوشش کی ہے۔ کہ اس حدیث کو اپنے اوپر چسپاں کریں۔  
نہیں یہ توقع رکھتا ہوں، کہ وہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کرے گا۔ بلکہ شاید اسے



خود بھی اپنے مہدی موعود ہونے کی خبر نہ ہوگی  
 وہ خاص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر (SCHOOL OF  
 THOUGHT) پیدا کرے گا، ذہنوں کو بدلے گا ایک زبردست تحریک  
 اٹھائے گا، جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی، باہلیت اپنی تمام  
 عادتوں کے ساتھ اس کو کچلنے کی کوشش کرے گی۔ مگر بالآخر وہ جاہل اقتدار کو  
 الٹ کر پھینک دے گا، اور ایک ایسی زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کرے گا۔

مولانا صاحب

نے محدثین اور فقہاء کے ظن کو اپنے روزمرہ کی بول چال کا ظن سمجھ کر کس قدر گمراہی پھیلانی  
 ہے کہ کوئی چیز بھی صحیح طریق پر نہیں رہ سکتی۔ یہ سب بے اسنادی کے نتائج ہیں۔



# جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

عرصہ ہوا مولانا مودودی صاحب نے ایک مضمون ”مسک اعتبار“ کے عنوان سے لکھا۔ جس پر عامۃ المسلمین میں مولانا اور ان کی جماعت کے متعلق کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور یہ قصہ اخبارات میں کافی دیر تک چلتا رہا کہ حجیت حدیث اور سنت رسول پر اعتماد کے متعلق جماعت اسلامی کا موقف کیا ہے؟ بحث و نظر کا یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں پایا تھا کہ مولانا مودودی نے جیل سے تشریف لاتے ہی مختلف مقامات پر چند تقریریں فرمادیں بیت کا علم تو اللہ کو ہے مگر ان تقاریر سے فہمیں متوج اور تیزی آگئی جماعت اسلامی کے جرائد نے اپنی قیادت کی حمایت میں جرات اور تہور سے کام لے کر خاصی گرمی پیدا کر دی۔ غالباً ان حالات سے متاثر ہو کر کسی اہل حدیث نے کچھ سوالات کئے جن کا جواب مولانا اصلاحی کے قلم سے اکتوبر ۱۹۷۷ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا۔ مولانا اصلاحی کے بلوچ میں ممکن ہے کچھ فرق ہو، مقصد کے لحاظ سے مولانا اصلاحی کے نظریات، مولانا مودودی سے چند مختلف نہیں۔ حدیث کے متعلق دونوں بزرگ ایک ہی طرح سے سوچتے ہیں۔

جماعت اہل حدیث کے احساسات کا ایک خاص مقام ہے اور قریباً ایک صدی سے جس نہج پر ان حضرات نے فن حدیث اور سنت کی خدمت کی ہے اس کا یہ لازمی نتیجہ ہے جماعت اسلامی کا طبعی فکر اس سے مختلف ہے اس لئے اہل حدیث کا اس سے ناگوار تاثر بالکل قدرتی تھا۔ اور ایک گونہ تصادم اس کا طبعی نتیجہ۔ ان جوابات سے اس اہل حدیث سائل کی کہاں تک تسکین ہوئی؟ اس کا علم نہیں ہو سکا لیکن میرے تاثرات یہ ہیں کہ ان جوابات سے نہ کوئی اہل حدیث مطمئن ہو سکتا ہے نہ عامۃ المسلمین بلکہ خود مجیب بھی شاید مطمئن نہ ہوں۔

## ذہنی انتشار

”مسک اعتبار“ قریباً تیرہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ پورا مضمون پڑھ لینے کے بعد



ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف علام ہو کچھ لکھ رہے ہیں اس پر خود بھی مطمئن نہیں۔ پورے مضمون میں ذہنی انتشار نمایاں ہے۔ اس مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلے حصہ میں مولانا مسکریں حدیث سے اتفاق فرماتے ہیں کہ ”احادیث ظنی تو ہیں اور ظنی چیز ثابت شدہ نہیں ہوتی لیکن کسی چیز کا ثابت شدہ نہ ہونا یہ کب معنی رکھتا ہے کہ وہ رد ہی کر دینے کے قابل ہو“ (تفہیمات ص ۳۱) ”اس لئے احادیث کلیۃً رد“

۱۔ معلوم نہیں مولانا کس زبان میں گفتگو فرما رہے ہیں؟ شرعی اصطلاح تو یہی ہے کہ غیر ثابت شدہ مسائل کو رد کر دیا جائے۔ پھر یہ ارشاد کہ ”ظنی چیز ثابت شدہ نہیں ہوتی“ اگر ظن بمعنی وہم ہے تو ارشاد درست ہے لیکن قرآن کریم نے ظن کو وہم کے مرادف صرف اُس وقت فرمایا جب وہ حق کے مقابل ہو اِنَّ الظَّنَّ لَا یُعِیْذُ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا۔ قرآن میں ظن حقیقت ثابتہ کے معنی میں استعمال ہوا:

وَ اِنَّا ظَنَنَّآ اَنْ كُنَّا لَعِجْزَ اللّٰهِ فِی الْاَرْضِ یٰۤاٰیُّهَا الَّذِیْنَ یُظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلَاقُ رَبِّہُمْ اَلَا یَعْلَمُوْنَ (جن) عاجز کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی بارگاہ سے بھاگ سکتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یُظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلَاقُ رَبِّہُمْ وَ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ۔ اُسے یقین ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے ملیں گے۔ اُسے یقین ہوتا ہے کہ اب جدائی کا وقت ہے۔

اَلَا یُظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ وَ ظَنَّ اَہْلُہَا اَنَّهُمْ قَادِرُوْنَ عَلَیْہَا کیا انھیں یقین نہیں کہ وہ اُٹھائے جائیں گے۔ ان کو یقین ہو گیا کہ وہ اس پر قادر ہیں۔

راغب نے ظن کے متعلق ایک قاعدہ ذکر فرمایا ہے:

الظن اسم لما يحصل عن إمارۃ ظن اُس (علم) کا نام ہے جو علامات اور قرائن سے

ومتی قویت ادت الی العلم ومتی ضعف حاصل ہو۔ جب یہ قرائن پختہ ہوں تو ان سے

جد المتیحا وزحد التوهم ومتی متوی علم و یقین حاصل ہوتا ہے کمزوریوں تو وہم سے کم

او تصور تصور القوی استعمل معہ نہیں جب یہ قرائن قوی ہوں یا اُن کے قوی ہونے کا

ان المشددة وان المخففة۔ الخ خیال ہو تو ان کے ساتھ اُن مشدّدہ اور مخفّفہ استعمال ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ ظن کو علی الاطلاق غیر ثابت شدہ کہنا قطعاً غلط ہے اور اس نظریہ پر جو نتائج مرتب

ہوں گے وہ بھی غلط ہی ہوں گے۔ اصل حکم ان امارت اور قرائن پر ہو گا جن سے ظن حاصل ہوا۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ)



کر دینا درست نہیں۔ ارشاد ہے ”مظنونات کو من حیث الکل قبول کر لیتا جس درجہ کی غلطی ہے اسی درجہ کی غلطی من حیث الکل رد کر دینا بھی ہے“ (تفہیمات ص ۳۱۷) مولانا کا مشورہ یہ ہے کہ منکرین حدیث کو پورے ذخیرہ کا انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ دیرِ خیال ہے منکرین حدیث سے پر ویر پارٹی شاید مولانا کی بخیر سے اتفاق کر لے) اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ ”آحاد کو رد کرنے سے دین میں مباحثہ نہیں رہے گی۔ قرآن سے اور متواتر احادیث سے اسلام کا مکمل نظام حیات نہیں مل سکتا، صرف اخبارِ آحاد ہی ہیں جو ہم تک ہدایات کا عظیم الشان ذخیرہ ہم پہنچاتی ہیں“ (تفہیمات ص ۳۱۷)

یہ اندازِ بیان کتنا ہی معذرت خواہانہ کیوں نہ ہو مگر درست ہے۔ طریقِ ادا میں کتنی مسکنت اور کمزوری ہو مگر مجارات مع الخصم کے طریق پر مولانا نے جو فرمایا مناسب ہے۔ طریقِ ادا سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر جو فرمایا کافی حد تک صحیح ہے۔

**دوسرا حصہ** دوسرے حصہ میں مولانا ائمہ حدیث اور ان کی خدمات کی تعریف فرماتے ہیں۔ حدیث کی حفاظت کے ذرائع کو بھی قرآن کی غیر معمولی حفاظت کے ذرائع کی طرح بے نظیر کہتے ہیں، اصولِ محدثین کی تعریف فرماتے ہیں لیکن اس پر بے اطمینانی کا اظہار فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

ائمہ حدیث کی اصطلاح میں ”ظن“ علم کے ایک خاص مرتبہ کا نام ہے۔ متواتر سے بدیہی علم حاصل ہوتا ہے۔ آحاد میں جب قرآن صدق موجود ہوں اور ان قرآن کے قوت و ضعف کے پیش نظر جو علم حاصل ہو اُسے وہ ظن سے تعبیر کرتے ہیں۔ ائمہ نے اس علم کے متعلق فرمایا کہ یہ موجبِ عمل ہے پھر جن ائمہ نے تواتر میں عدد کے علاوہ اوصافِ رواۃ کو بھی ملحوظ رکھا ہے یا جن روایات کو تلقی بالقبول کا مقام حاصل ہو ان سے علمِ نظری کا حاصل ہونا بھی مسلم ہے۔ گویا یہ ایسا ظن ہے جس سے علمِ نظری حاصل ہو سکتا ہے۔ مولانا غور فرمائیں آیا غیر ثابت شدہ چیز موجبِ عمل ہو سکتی ہے یا اس سے علمِ نظری حاصل ہو سکتا ہے؟ — عام اہل قرآن ظن کو دہم کے مراد سمجھ کر اُسے غیر ثابت شدہ تصور کرتے ہیں۔ مولانا نے ذہول یا سامحت سے اسی غلط استعمال کی بنا پر ظن کو غیر ثابت شدہ فرمادیا اور جب اس کے نتائج پر نظر پڑی تو غیر ثابت شدہ کو قبول کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ صلت علی الاسد۔ بات عن النقد۔ ائمہ ظن کی اصطلاح کے مطابق ظن علم کے اس مرتبہ کا نام ہے جو بدہست سے کم ہو علمِ نظری اور اس کے جملہ مراتب اس میں شامل ہیں۔ ان قرآن کی بناء پر محدثین نے قوت اور ضعف کے مراتب معین فرمائے ہیں۔



وہ بہر حال تھے تو انسان ہی، انسانی علم کے لئے جو حدیں فطرۃً اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان کے آگے تو وہ نہیں جاسکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ ”تقیہیات ص ۳۱۸

اس کے بعد متبعین حدیث پر تنقید فرماتے ہیں کہ:

”ان (محدثین) کی نگاہ میں احادیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا جو معیار ہے ٹھیک ٹھیک اسی معیار کی ہم (اہل حدیث) بھی پابندی کریں۔ مثلاً مشہور کوشاف پر مرفوع کو مرسل پر اور مسلسل کو منقطع پر لازماً ترجیح دیں۔“ (تقیہیات ص ۳۱۸)

بالکل بجا، مگر سوال یہ ہے کہ تو اتر کی صورت میں جو یقین کا سرمایہ موجود ہے وہ بھی تو آخر انسان ہی ہیں، ان کے لئے بھی فطری حدود و متعین ہیں۔ اگر یہ تنقید درست ہے تو قرآن اور سنت متواترہ کے یقین کو کبھی ظن ہی کے مراد سمجھنا چاہیئے۔ گویا انسان کی فطری حدود کے اندر یقین کا وجود ناپید ہے۔ مولانا کے ذاتی خیالات یقیناً یہ نہیں ہوں گے مگر ان کے استدلال کی انتہا یہی ہے۔ ائمہ حدیث اور ان کی مساعی اور فن حدیث کے متعلق مولانا نے جو کچھ ایک ہاتھ سے دیا تھا اسے دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیا، بلکہ ان کے نزدیک انسانیت کی لغت میں یقین کا لفظ ایک بے معنی لفظ ہے۔

اصول حدیث کے متعلق اہل حدیث اور متبعین حدیث کی ترجمانی مولانا نے جس طرح فرمائی ہے وہ قطعاً غلط ہے۔ ائمہ حدیث اور متبعین حدیث نے کبھی یہ دعویٰ نہیں فرمایا کہ یہ اصول تنقید آخری ہیں، ان پر اضافہ ناممکن ہے، بلکہ ہماری نظر میں اصول حدیث ایک متحرک فن ہے، وہ بتدریج اس حد تک پہنچا جہاں وہ آج موجود ہے۔ اگر کسی معقول اصل کا اس میں اضافہ فرمایا جائے تو فن میں اس کی گنجائش ہے۔ البتہ یہ شکایت بجا ہے کہ آج تک اس میں اضافہ کی جو کوشش کی گئی اس کی بنیادیں از بس کمزور ہیں اور اسے اصول کی حیثیت سے قبول کرنا سخت مشکل ہے۔ ان میں تعمیر کے بجائے تخریب ہے۔ آپ نے اور آپ سے پہلے بھی بعض بزرگوں نے ”دلیت“ کا نام لیا مگر اس کی اساسی حیثیت کیا ہے؟ اس کا تذکرہ ان حضرات نے کیا نہ آپ نے، بلکہ آپ خود بھی اس پر مطمئن نظر نہیں آتے۔



غرض حدیث اور فہم حدیث کی مولانا نے جس قدر حوصلہ افزائی کی ازراہ عنایت کی تھی اور اس کی ثمار آپ ہی کے مبارک ہاتھوں سے پیوندِ خاک بھی ہو گئی اور جناب ہی کے قلم سے منکرین حدیث کا کیس مضبوط ہو گیا۔ و ما ہی بول قارورہ کسرت۔

اس حصہ میں مولانا نے فقہاء اسلام کی بہت تعریف فرمائی، اُن کو حق دیا کہ انہیں **تیسرا حصہ** کے اصول کا تقاضا چاہے کچھ ہو مگر فقہاء کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ضعیف پر عمل کریں، مُرسل کو ترجیح دیں، منقطع کو قبول کریں۔ مولانا یہاں قادیانی شاعری کا لیادہ زینت فرماتے ہیں۔ فقیہ کا تعارف اس انداز سے کراتے ہیں کہ :

”اس کی روح روح محمدی میں گم ہو جاتی ہے، اس کی نظر بصیرت نبوی صی کے ساتھ متحرک ہو جاتی ہے، اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے تفہیمات<sup>۳۲۵</sup> پھر فرماتے ہیں :

”اس مقام پر پہنچ جاتے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا، وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اسناد پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے، اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر سہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔“ الخ<sup>۳۲۶</sup> فقہائے اسلام کے مقام کی رفعت میں کلام نہیں لیکن ”مسلب اعتدال“ کے آخری صفحات میں جو کچھ فرمایا گیا ہے قطعی بے دلیل ہے اور محض شاعری۔ معاملہ صرف طریق فکر کے اختلاف کا ہے، نہ کوئی ہیرا ہے نہ جوت۔ مگر یہ محل جو شاعرانہ پرواز سے تعبیر ہوا تھا اسے بھی بالآخر پیوندِ خاک فرماتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے :

”یہ چیز چونکہ سراسر ذوقی ہے اور کسی ضابطہ کے تحت نہیں آتی، نہ آسکتی ہے اس لئے اس میں اختلاف کی گنجائش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔“ الخ (تفہیمات ص ۳۲۷)

پھر یہ سہیرے کی جوت کیسے ہوتی؟ یعنی فقہائے اسلام کا طریق فکر بھی ذوقی ہے کوئی اصول نہیں۔

اب کوئی بتائے ان تیرہ صفحات میں مولانا نے ہمیں کیا دیا اور کونسی اعتدال کی راہ



بتائی، مکرمین حدیث دریافت کرتے ہیں کہ حضرت نے اس قدر ملامت کے بعد ہمیں کیا عنایت فرمایا، آپ اور ہم میں نقطہ امتیاز کیا ہے۔

## مولانا اصلاحی صاحب

مولانا اصلاحی مستند اور پختہ کار عالم ہیں۔ مولانا فراہی ایسے صاحب فکر سے اٹھلے نے استفادہ فرمایا ہے۔ آپ نے اپنے ارشادات میں قریبا وہی سب کچھ فرمایا ہے جو مسلک اعتدال میں کہا گیا ہے۔ مگر ذہن اور خیالات کی پراگندگی کو الفاظ کی سطح پر نمایاں نہیں ہوتے دیا۔ لیکن فضا کی گرمی اور اخبارات کی تیز تنقیدات سے ذہن متاثر ہے۔ بعض مقامات پر لہجہ خاصا تند ہو گیا ہے۔ طبعی متانت اور فطری سنجیدگی کے باوجود مولانا بعض ایسی چیزیں فرما گئے کہ اگر نہ فرماتے تو بہتر ہوتا، ایک متین آدمی کے لئے اس قدر نیچے آ جانا کوئی اچھی مثال نہیں۔

**ایک ضروری وضاحت** زیر قلم گذارشات سے مقصد کچھ اپنے مسلک کی وضاحت ہے اور کچھ ان بزرگوں کے ارشادات اور ان کے مفسر اثرات کی نشاندہی، تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ حدیث اور سنت کی حمایت میں وہ راہ صحیح ہے جسے جماعت اسلامی کی قیادت نے اختیار فرمایا، یا وہ مسلک درست ہے جس کی نشاندہی ائمہ حدیث اور سلف اُمت نے فرمائی ہے نیز اسلام کی وسعت اور ہمہ گیری ان حضرات کے طریق فکر سے ظاہر ہوتی ہے یا اہل حدیث کے طریق فکر سے۔ جن مقاصد کی تکمیل آپ حضرات برسوں سے فرما رہے ہیں اس کی کفالت اہل حدیث کا مسلک کر سکتا ہے یا آپ کے یہ محتاط اور منقبض خیالات۔

جہاں تک مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی کی ذات کا تعلق ہے یا ان کی اصلاحی سعی کا، میرے دل میں ان کے لئے پورا احترام ہے۔ گزشتہ ایام میں بعض اخباری انداز تحریر سے فضا میں جو تمارت پیدا ہو گئی تھی میں طبعا اسے ناپسند کرتا ہوں۔ دین پسند جماعتوں کے مخاطب میں یہ ترشی کبھی نہیں آنی چاہیئے اور موجودہ ظروف و احوال تو اس کے لئے قطعاً ناسازگار ہیں حقیقت یہ ہے کہ دین پسند جماعتیں جس قدر بھی باہم دست و گریباں ہوں گی باطل کو اسی قدر فائدہ پہنچے گا۔ لے عرصہ ہوا مولانا موصوف جماعت اسلامی کو خیر باد کہہ چکے ہیں۔



”مسلب اعتدال“ اور مولانا اصلاحی کے ارشادات پر کئی وجوہ سے گفتگو کی جاسکتی ہے لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ زیر قلم گذارشات حدیث اور اس کے متعلقات تک محدود ہیں تاکہ اس موضوع پر ہم ایک دوسرے کو قریب سے سمجھ سکیں۔

”مسلب اعتدال“ آج سے کئی سال پہلے بھی پڑھا تھا، اب پھر پڑھا ہے اس میں نہ کوئی علمی اور فنی خوبی ہے اور نہ کوئی اصلاحی نکتہ۔ مولانا اصلاحی نے کئی سال کے بعد اس کی نوک پلک کچھ درست فرمانے کی کوشش فرمائی ہے۔ قصورِ علم کے اعتراف کے ساتھ عرض ہے کہ اس میں بھی اطمینان کا کوئی سامان نہیں اور بے حد مناسب ہوگا اگر یہ بے مقصد مضمون تفہیمات سے بالکل قلمزن کر دیا جائے۔

## حدیث اور سنت

ائمۃ حدیث اور فقہاء رحمہم اللہ نے حدیث اور سنت کو خاص معانی میں بھی استعمال فرمایا ہے لیکن جہاں وہ اصول اور ادلہ کا ذکر فرماتے ہیں وہ انھیں ہم معنی اور مترادف سمجھتے ہیں۔ عنوان اور ابواب میں تو بعض اوقات ”خبر“ کا لفظ بھی استعمال فرماتے ہیں جو ان دونوں سے عام ہے مگر مقصد وہی ہوتا ہے جسے عرف عام میں سنت یا حدیث کہا جاتا ہے۔ منکرین حدیث اسی معنی سے حدیث کا انکار کرتے ہیں اور سنت پر حرج اور اعتراض کرتے ہیں۔ اصول حدیث اور اصول فقہ کی مختصرات اور مطولات پر ایک نظر ڈالئے، وہ ان الفاظ کے مصطلح مفہوم میں سیکڑ پیدا کرتے ہیں نہ اپنے موقف سے سرمواخراف۔ شکر اللہ مساعیہم۔ لیکن مولانا اصلاحی صاحب نے سنت کے مفہوم کو بالکل سیکڑ کر دیا ہے۔

**سنت ائمہ کی نظر میں** (۱) السنة وہی تطلق علی قول الرسول علیہ السلام وعلی فعلہ والحديث مختص بقوله رتلویح علی التوضیح صند طبع نول کشور۔

(۲) يطلق لفظ السنة علی ما جاء من قول رسول الله صلى الله عليه وسلم من قول او فعل او تقرير۔ راصول الفقہ للخضر می ص ۲۵

(۳) السنة فی عرف المحدثین وجمہور اهل الشرع کل ما صدر عن الرسول



صلى الله عليه وسلم من قول أو فعل أو تقرير سواء صدر عنه بأمر أو رسولاً  
باعتباره إنساناً من البشر وفقه الاسلام حسن احمد خطيب ص ٢٩

(٣) السنة ما شرعاً فهو قول النبي صلى الله عليه وسلم وفعله وتقريره

(حصول المال ص ٢٢)

(٥) اما السنة فتطلق في الأكثر على ما اضيف الى النبي صلى الله عليه وسلم

من قول أو فعل أو تقرير فهي مرادفة للحديث عند علماء الاصول وتوجيه النظر للبحر الرقي ص ٢٢

(٦) اما السنة فهي لغة الطريقة واصطلاحاً مرادفة للحديث بالمعنى

المتقدم الذي هو كل ما اضيف الى النبي صلى الله عليه وسلم (لفظ الدرر ص ٢٢)

(٧) والسنة هي هذا ما عن النبي صلى الله عليه وسلم غير القرآن من

قول ويسمى الحديث أو فعل أو تقرير والقول المأمول في فن الاصول ص ٢٢

(٨) السنة هي المروية عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قولاً وفعلًا ورسالة

لزين الدين الحلبي ص ٢٢

(٩) والسنة ما ورد عن النبي صلى الله عليه وسلم غير القرآن أو فعل أو تقرير

(قواعد الاصول لصفي الدين جنبلي ص ٢٢٨ ص ٩١)

(١٠) والسنة لغة العادة وشرعية مشترك بين ما صدر عن النبي صلى الله

عليه وسلم من قول أو فعل أو تقرير وبين ما واطب عليه النبي صلى الله عليه وسلم

بلا وجوب تعريفات للبحر جاني ص ٢٢

(١١) والسنة لغة العادة وهي ما صدر عن رسول الله عليه وسلم

غير القرآن من قول أو فعل أو تقرير كما في شرح المختصر ص ٢٢ ج ٢ مسلم الثبوت

(١٢) السنة هي قول الرسول صلى الله عليه وسلم وفعله (منهاج الليثي)

(١٣) وانما اختار لفظ السنة دون لفظ الخبر كما ذكره غيره لان لفظ السنة

شامل لقول الرسول وفعله عليه السلام (كتاب التحقيق شرح المحامي ص ١٢٤)

(١٤) السنة شرعاً ما نقل عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قولاً أو فعلًا

أو قراراً على فعل ونزعت الخاطر العاطف ص ٢٢ ج ١



(۱۵) السنۃ تطلق علی قول الرسولؐ وفعله وسکوته وعلی اقوال الصحابةؓ والائمةؓ

الخ (نور الانوار ص ۱۷۷)

(۱۶) السنن تنقسم ثلاثة اقسام قول من النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفعل

منہ علیہ السلام او شیء را لا فعلہ فاقر علیہ (احکام لابن حزم ص ۲۱)

(۱۷) یطلق لفظ السنۃ علی ما جاء منقولاً عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

علی الخصوص مما لم ينص علیہ فی کتاب العزیز (موافقات ج ۲ ص ۲۱)

اس مفہوم کا ذکر اہل علم کی مصنفات میں بکثرت موجود ہے۔ ائمہ اسلام قرآن کے بعد

سُنّت کو حجّت شرعی سمجھتے ہیں اور سُنّت کا یہی مفہوم سمجھتے ہیں جو اوپر کے حوالوں میں مرقوم ہے

بعض تعریفات میں معمولی تغایر ہے، اس کا مفہوم اہل علم سمجھتے ہیں۔ ان تعریفات میں تشدّد

اور سُنّت کو ہم معنی ظاہر کیا گیا ہے اور آنحضرتؐ کے قول، اور تقریر سب کو شامل سمجھا گیا ہے

اور اس معنی سے اس کی حجّت محل نزاع ہے۔

ائمہ حدیث نے جو کتابیں سُنّت کے متعلق لکھی ہیں ان میں بھی قولی، فعلی اور تقریری

سُنّت کا ذکر فرمایا ہے۔ تمام کتب سنن شاہد ہیں کہ ان میں سُنّت کو اسی متعارف اور مصطلح

معنی میں ذکر فرمایا گیا ہے اور معلوم ہے کہ سُنّت کے یہ دفاتر اور ان کے مصنفین کا علم و فضل

اُمت میں مسلم ہے۔ سُنّت کے متعلق ان کا نقطہ نظر وہی ہے جس کا ذکر اوپر کی عبارات میں ہوا۔

جن حالات سے متاثر ہو کر مولانا اصلاحی نے

**سُنّت مولانا اصلاحی کی نظر میں** ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۵۵ء میں زیر تنقید

مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ اہل حدیث، اہل قرآن وغیرہ جماعتیں سب مولانا کے پیش نظر ہیں۔ آپ

فرماتے ہیں:

”حدیث اور سُنّت کا دین میں اصلی مقام واضح کرنے سے پہلے میں چاہتا

ہوں کہ مختصر طور پر وہ فرق واضح کر دوں جو حدیث اور سُنّت کے درمیان میں سمجھتا

ہوں لیکن عام طور پر لوگ اس کو ملحوظ نہیں رکھتے۔

”حدیث تو ہر وہ قول یا فعل یا تقریر ہے جس کی روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کی نسبت کے ساتھ کی جائے، لیکن سُنّت سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف



اہمیت شدہ اور معلوم ہوا ہے کہ جس پر آپ نے بار بار عمل کیا ہو، جس کی آپ نے ممانعت فرمائی ہو، جس کے حصول عام طور پر پابند ہے، مثلاً: ”درجہ بن القرآن“ (توہفہ صوفیہ) مولانا کی تعریف منطقی ہے، عربی، تہذیبی،

۱۱) مولانا نے جو فرمایا تھا کھل کر فرمایا ہے۔ ان کی نظر میں جمہوریت سنت کو حاصل ہے وہ حدیث کو نہیں۔

(۱۲) اور یہ اہمیت بھی سنت کے اسی مفہوم کو حاصل ہے جسے مولانا نے اپنے لئے متعین فرمایا ہے یا جس کی تعلیم جماعت اسلامی کو دنیا اس وقت پیش نظر ہے۔

(۱۳) اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سنت کے متعلق یہ مولانا کی اصطلاح ہے، عام طور پر لوگ اسے ملحوظ نہیں رکھتے۔

(۱۴) مولانا کی نگاہ میں کسی دوسرے مفہوم پر سنت کا اطلاق درست نہیں، سنت کا منطوق ”صرف“ یہی ہے حالانکہ مولانا اس مفہوم میں پوری اُمت سے مختلف ہیں۔ جہاں تک میرا یقین ہے مولانا نہ منکرِ حدیث ہیں نہ ان کو سنت سے انکار ہے لیکن مولانا جس انداز سے بحث کا آغاز فرمایا ہے اس سے چور و دوازے کھل سکتے ہیں اور منکرین حدیث کو اس سے کافی مدد مل سکتی ہے۔

(۱۵) مولانا نے سنت کی تعریف کو اس قدر سکیڑ دیا ہے کہ اس کا تعلق چند اعمال سے ہی ہوگا جن کا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے علی سبیل الاستمرار ہے جیسے نماز کے بعض ارکان، لیکن اقدارِ زکوٰۃ وغیرہ کے لئے شاید کچھ خبر واحدی کا سہارا لینا پڑے۔

(۱۶) ہزار دفعہ فرمایا جائے ”کہ اگر کوئی شخص اس (سنت) کو اخذِ دین تسلیم نہیں کرتا تو میں اس کو مسلمان تسلیم نہیں کرتا“ سوال یہ ہے کہ اس ”سنت“ کی پہچانی ہے کہاں تک؟ اس کا احاطہ چند اعمال سے آگے نہیں بڑھے گا۔ پورا اسلام تو کسی دوسری جگہ ہی سے ثابت کرنا ہوگا پھر اس کی ادعا کی ضرورت ہی کیا ہے؟

(۱۷) دعوئے یہ ہے کہ اسلام زندگی کے تمام گوشوں میں رہنمائی کے فرائض انجام دیتا ہے لیکن جناب کی پیش کردہ تعریف کے لحاظ سے تو اس کا دائرہ اس قدر تنگ ہوگا کہ تنگی کے بعض اہم گوشے بھی شاید اس کی رہنمائی سے خالی رہیں۔ سیاسی اور معاشی امور میں رہنمائی تو



بڑی بات ہے، عبادات اور معاملات میں کبھی ہمیں اسلام کی رہنمائی سے محروم ہونا پڑے گا۔ اخبارِ آماد کے ساتھ معتزلہ کی طرح اگر سوتیلی ماں کا ساسلوک جاری رہا تو جہاد، تقسیم غنائم، جزیرہ، مجاہدات ایسے اہم مسائل اور اسی قسم کے اکثر بین الاقوامی مسائل میں ہم اسلام کی رہنمائی سے محروم ہو جائیں گے اور تکمیلِ دین ایک ایسا خواب ہو کر رہ جائے گا جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ قرآنِ عزیزِ نرا درسِ تمناؤں کے ساتھ اہلِ قرآن کی طرح اگر ضروری احکام کشید کرنے کی کوشش کی گئی تو استدلال کا جوہر اختیار کرنا پڑے گا اس کی حیثیت سیاسی جوڑ توڑ سے زیادہ بہتر نہیں ہوگی۔

ادارہ طلوعِ اسلام کے بعد ادارہ ثقافتِ اسلامیہ <sup>انکارِ حدیث کے بعد</sup>  
آپ کے سامنے ہیں۔ ان کا طریق استدلال نمایاں ہے۔ ادارہ طلوعِ اسلام کراچی اور ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور۔ ان میں اکثریت منکرینِ حدیث کی ہے، ان میں جو حضرات کھلے طور پر حدیث کا انکار نہیں کرتے ان کا ذہنی رجحان انکار ہی کی طرف ہے وہاں اسلام کے بنیادی حقائق کی تشریحات اس انداز سے کی گئی ہیں جس سے اسلام کے ارکان تک محفوظ نہیں رہ سکے۔ نہ نماز موجود ہے نہ روزہ، نہ حج ہے نہ زکوٰۃ نہ توحید سلامت ہے نہ رسالت، نہ قیامت ہے نہ جزا اور سزا۔ پورا اسلام قریباً دنیا پرستی کا دوسرا نام ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو رسالہ ”اسلام کی بنیادی حقیقتیں“ مصنفہ خلیفہ عبدالحکیم۔ ”مقام حدیث“ از سید جعفر شاہ اور نظامِ ربوبیت“ از پرویز وغیرہ۔

آج سے صدیوں پیشتر سنت اور حدیث کی حمایت میں ہم جہاں کھڑے تھے اُس مقام سے ائمہ حدیث کے حملوں نے معتزلہ، خوارج اور دوسرے مبتدع فرقوں کو شکست پر شکست دی تھی اور ہمارے اسلاف کی تعمیری اور تخریبی مساعی نے اہل بدعت کو ناکام بنا دیا تھا لیکن مولانا نے تعریف میں جو سکیڑ اور انقباض پیدا فرمایا ہے اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم اپنے دعوے کے بہت سے حصوں سے خود ہی دست بردار ہو گئے۔ اگر ہماری ان فکری قیادتوں کی گریز پائی کا یہی حال رہا تو ہمیں اپنی شکست کا اعتراف کرنا چاہیے ہم آماد کے قیمتی ذخیرہ سے خود بخود دست کش ہو گئے۔ یہ غیر محتاط احتیاطِ قلتِ مطالعہ کا نتیجہ ہے یا جہن اور بُردلی کا ۱۹ اللہم اتی اعوذ بک من الجبن۔



(۹) اس تعریف سے شاید وہ مقصد بھی حاصل نہ ہو جس کے لئے یہ سیکڑ اور انقباض

اختیار کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ اہل قرآن سے بروہن پارٹی شاید وقتی طور پر کسی قدر الفاظ کے  
بہرہ پھر سے آپ کے ساتھ اتفاق کرے، غالباً ان کے انکار حدیث اور آپ کے اقرار حقیقت  
سنت پر اس تعریف کے بعد کوئی نمایاں اثر نہیں پڑتا۔ کچھ اعتباری سامیتا زہ جانے گا۔

(۱۰) اس قسم کی تعریف مقام بحث سے ایک گونہ انحراف  
**مقام بحث سے انحراف** ہے۔ محل نزاع سنت کا وہی مفہوم ہے جس کا ذکر

مختلف اہل علم کی مصنفات سے اوپر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے سنت کی تحت  
کا وہ مقام بدل لیا جس پر ہم قرون خیر سے آج تک قائم تھے۔ اس انحراف اور حمیدہ کی جٹا  
سے اُمید نہ تھی۔

(۱۱) آنحضرتؐ کا عمل اور اس پر استمرار ثابت کرنے کے لئے تو اتر کا ذخیرہ تو

بہت ہی مختصر ہے، اگر آحاد پر اعتماد کیا جائے تو مولانا کے نقطہ نظر سے اثبات الظن باظن  
ہوگا اور بصورتِ اول زندگی کے عام گوشوں میں اس کا نتیجہ انکار حدیث ہوگا کیونکہ دفاتر  
سنت میں جو کچھ ملتا ہے یہ تعریف اس پر صادق نہیں آتی۔ نیز مولانا کی یہ تعلیق ایسی ہے جیسے کوئی  
کہے کہ میں سنت کو حجتِ قطعی سمجھتا ہوں لیکن سنت کی تعریف یہ ہے کہ امام شافعیؒ یا امام احمدؒ  
کی حیثیت کے آدمی از اول تا آخر اسے روایت کریں۔ سنگین شروط کا نتیجہ معنی انکار ہی ہوگا۔

(۱۲) اس تعریف کے مطابق صوم عاشورائے جو غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

ایک ہی دفعہ رکھا، نماز تراویح، جسے حضرت نے رمضان میں صرف تین دن باجماعت ادا  
فرمایا۔ دُعایِ استفتاح کے مختلف صیغ جن پر مختلف اوقات میں عمل فرمایا ایسے ہی دوسری  
عملی سنتیں جن پر استمرار ثابت نہیں یا وہ زیر بحث ہے، اس تعریف میں کیسے شامل  
ہوں گی، ان کی سُنیت سے انکار اس تعریف کے مطابق دشوار نہیں ہوگا۔

(۱۳) سُنّت کی تعریف میں بعض اہل علم کچھ قیود کے ساتھ عادات اور عبادات

دونوں کو شامل سمجھتے ہیں، بعض صرف تعبّدی امور ہی کو سُنّت میں داخل جانتے ہیں۔  
یہ بحث اپنی جگہ محلِ نظر و غور ہے۔ لیکن مولانا کی تعریف اس باب میں بھی خاموش  
ہے۔ عاداتِ مستمرّہ کو خارج کرنے کے لئے تعریف میں کوئی فصل نہیں۔ آپ کی اس



تعریف کو زیادہ سے زیادہ اتنی اہمیت دی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی عمل ان شرائط سے ثابت ہو جائے تو وہ بھی سنت ہوگا۔

(۱۴) اصطلاحات کے تعین کا ہر شخص کو حق حاصل ہے لیکن ان ائمہ کی متعینہ اصطلاحات کی جگہ نہیں دی جاسکتی۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ میرے نزدیک صلوٰۃ کا مفہوم ربوبیت کبریٰ ہے اور آخرت سے مراد یوم الحساب نہیں بلکہ اسی دنیا میں کل کی فکر اور زندگی میں مستقبل کی فکر ہے اور ملائکہ سے مراد قدرت کے وہ کرشمے ہیں جو اسی دنیا میں انسان کے لئے مسخر فرمائے گئے ہیں صوم سے مراد جذبات پر صرف انضباط اور کنٹرول ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اپنی جگہ یہ چیزیں کتنی ہی مفید کیوں نہ ہوں مگر اس سے صوم و صلوٰۃ ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالملائکہ کے متعلق متعین اور مصطلح مفہوم ثابت نہیں ہوگا۔ اسی طرح سنت کے متعلق ایک جدید اصطلاح کی حد تک تو اس پر غور ہو سکتا ہے لیکن وہ بابہ النزاع مسئلہ جس پر گفتگو چل رہی ہے اس سے حل نہیں ہوگا۔ جہاں تک میرا خیال ہے مولوی احمد دین امرتسری قریباً اسی نقطہ نگاہ سے اعمال متعارفہ اور معمول بہا سنن کا انکار نہیں کرتے تھے، اذان، نماز، نکاح میں اسی متعارف طریق پر عمل کرتے تھے۔ بُرہان القرآن اور ان کی تفسیر میں اس کا ذکر بار بار ملتا ہے، حالانکہ مولوی احمد دین مسلمہ طور پر منکرِ حدیث تھے۔ اُمید ہے مولانا اس طریق بحث پر نظر ثانی فرمائیں گے کیونکہ اس انحراف سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

**اثباتِ سنت کے طریقے** | چار طریق سے ثابت ہو سکتی ہے (۱) عملی تو اتر (۲)

اہلِ مدینہ کا تعامل (۳) خلفاء راشدین کا عمل (۴) آحاد خبر متواتر اور تو اتر عملی میں بھی فرق ہے مگر اس وقت اس بحث کی ضرورت نہیں۔ تو اتر کی حیثیت مسلم ہے جو سنت تو اتر سے ثابت ہو وہ بہر حال ثابت شدہ ہے لیکن تو اتر سے کس قدر سنن ثابت ہو سکیں گی اس کا مختصر تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔

احادیث پر گفتگو سے قبل تعاملِ اہلِ مدینہ اور سنتِ خلفاء راشدین کا معاملہ سامنے آتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہم تک اسناد اور روایت کے ذریعہ سے ہی پہنچیں گی جن میں زیادہ تر احاد ہیں اس لئے اس کا مقام اخبارِ احاد سے بھی فروتر ہونا چاہیئے۔ احاد کی ظنیت اگر شبہات



کا سبب بن سکتی ہے تو یہاں بھی ظن ہی ظن ہے۔ مرفوع اور صحیح آحاد سے گھبراننا اور اہل مدینہ کے تعامل سے استدلال معقول معلوم نہیں ہوتا۔ فرمن المطروقہ قائم تحت المیزاب والامعاملہ ہو جائے گا۔ مولانا نے اہل مدینہ کے کیس کو اپنے الفاظ میں بیان فرمایا کہ مدینہ منورہ تمام بڑے بڑے صحابہؓ کا مرکز تھا۔ زندگی کے مختلف معاملات میں صحابہؓ جو کچھ کرتے تھے امام مالکؒ اسے سنت کا ہم مرتبہ سمجھتے ہیں کیونکہ ایسے وقت میں صحابہؓ سنت سے کیونکر الگ ہو سکتے ہیں۔ الخ مختصراً اور نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں:

”میں مالکیہ کے اس نقطہ نظر کو قابل لحاظ سمجھتا ہوں۔“

(۱) مالک کی جس قدر کتابیں میری نظر سے گزری ہیں وہ لوگ اہل مدینہ کے عمل کو سنت کہنے کی جرات نہیں کرتے، وہ جانتے ہیں کہ سنت نبویؐ کے اثبات کے لئے صحیح راہ سند ہے، شہریت کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ آج کل سند کے متعلق جن خطرات کا اظہار کیا جاتا ہے اس وقت یہ خطرات موجود نہ تھے۔

(۲) امام مالکؒ ۹۳ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور ۱۷۸ھ کے قریب آپ نے انتقال فرمایا اور عام طور پر کبار صحابہؓ ۳۰ھ سے پہلے ہی دینی خدمات کے سلسلہ میں عراق، شام، فارس وغیرہ مفتوحہ ممالک کی طرف تشریف لے جا چکے تھے۔ دار الخلافہ ہونے کی وجہ سے مدینہ میں علوج کی کثرت ہو گئی تھی جو ذریعہ مقاصد کے لئے مدینہ کو قریباً اپنا سکون بنا چکے تھے۔ شہادت عثمانؓ اور بعد کے واقعات اور حوادث کا ایک سبب اہل الرائے اور کبار صحابہؓ کی عدم موجودگی بھی تھی۔ ان حالات میں اہل مدینہ کے عمل کو کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی بلکہ قرین قیاس تو یہ ہے کہ اس وقت کے عمل کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔

(۳) تمام دنیا کے لئے مدینہ ہو یا کوفہ، سنت ہی صحت عمل کی کسوٹی ہے۔ اب سنت کے لئے کسی شہر کو معیار قرار دینا معقول بات معلوم نہیں ہوتی۔ سنت اگر دینا حاجت ہے تو کسی شہر یا کسی فرد کا عمل اس کے لئے بنیاد نہیں ہو سکتا۔ گھوڑا تانگے کے پیچھے نہیں جوتا جاسکتا۔ (۴) کبار صحابہؓ کا بھی یہی طریقہ تھا کہ سنت صحیحہ مل جانے کے بعد اپنے عمل کو بدل دیتے اور اپنی روش پر اصرار نہیں فرماتے تھے اس لئے اگر بالفرض صحابہؓ اس وقت مدینہ میں موجود بھی ہوتے تو بھی سنت ان پر حجت ہوتی۔ امام شافعیؒ فرماتے تھے ”کیف اترك الخبر



لا أقوال اقوام لو عامرتهم لحاججتهم بالحديث واحكام لآدمي ج ۲ ص ۱۶۵) ”میں ان لوگوں کی اطاعت کیونکر کر سکتا ہوں اگر میں اس وقت موجود ہوتا تو سنت کے اعتقاد پر ان سے بحث کرتا۔“  
حافظ ابن قیم فرماتے ہیں: والسنة هي المعيار ليس العمل معيارا على السنة۔ (اعلام المؤمن ج ۲ ص ۲۹۵) ”سنت معیار ہے کسی کا عمل معیار نہیں۔“

(۵) اصل مستند چیز سنت ہے۔ صحابہؓ جہاں گئے ان کے پاس علم تھا اور انھوں نے اس فقہ کے قول و فعل کی تلقین فرمائی، عجیب بات ہے کہ جب یہ حضرات مدینہ میں ہوں تو یہ علم مالک کے نزدیک حجت ہو، لیکن جب یہ علم کوفہ یا شام میں چلا جائے تو اس کی حجیت محل نظر ہو جائے والجدان والمساکن والبقاع لا تأثیر لھا من ترجیح الاقوال وانما التأثير لاهلھا وسكانھا (اعلام ج ۲ ص ۲۹۵) اینٹوں اور مکانات کو کسی بات کی ترجیح میں کیا دخل ہو سکتا ہے، اس کا تعلق تو وہاں کے رہنے والوں سے ہی ہونا چاہیئے۔“ علوم صحابہؓ اور سنن نبویہؐ جہاں ہوں حجت ہوں گی۔  
(۶) مدینہ میں بھی اہل علم باہم اختلاف فرماتے تھے۔ موطا میں مالکؒ نے خود ان اختلافات کا ذکر فرمایا۔ اس صورت میں بعض اہل مدینہ کے ارشادات دوسروں پر کیونکر حجت ہوں گے اور مولانا سنت ثابت کرنے کے لئے کن اقوال کو معیار قرار دیں گے۔ موالک کے اس اصول کا لحاظ کیسے کیا جائے گا جب دونوں طرف اہل مدینہ موجود ہوں۔

(۷) اہل مدینہ بعض اہم سنتوں کو ترک کر چکے تھے مثلاً:  
(۱) ہاتھ باندھنا موالک میں رائج نہیں وہ کھلے

ہاتھوں نماز ادا کرتے ہیں۔ (۲) موالک سلام صرف ایک طرف پھیرتے ہیں، جمہور ائمہ کا مذہب ہے سلام دونوں طرف ہونا چاہیئے (۳) مالکی نماز میں بسم اللہ پڑھنا ہی پسند نہیں کرتے (۴) رفع الیدین ایسی معروف سنت موالک میں معمول بہا نہیں (۵) تکبیرات میں جہر کا رواج مدینہ میں نہیں رہا تھا (۶) دعا، استفتاح بالکل ترک کی جا رہی تھی حضرت عمرؓ نے تعلیم کے لئے عرصہ تک اسے جہر فرمایا (مسلم) موالک میں رواج ہے کہ وہ صبح کی اذان وقت سے پہلے کہنا پسند کرتے ہیں، حالانکہ سنت صحیحہ اس کے خلاف ہے، اذان وقت ہی کے اظہار کا ذریعہ ہے (۸) مسجد میں جنازہ درست ہے لیکن موالک اسے جائز نہیں سمجھتے، ابن حزم نے احکام ج ۲ میں اس قسم کے بیسیوں مسائل ذکر کئے ہیں جن میں اہل مدینہ



ہا عملِ سنت کے خلاف ہے یا ممالک ان سنن کے پابند نہیں ہیں کا مدنیہ منورہ میں عرصہ تک رواج رہا۔ اب دُوبہی رائیں ہو سکتی ہیں یا مالک خود اہلِ مدنیہ کے عمل کو حجت نہیں سمجھتے تھے یا اہلِ مدنیہ کا عملِ سنت کے مطابق نہ تھا۔

(۸) ممالک اور شہروں کے اعمال اور عادات میں حکومت کو جہاں تک دخل ہے اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مدنیہ میں جہاں خلفاء راشدین اور ائمہ ہدیٰ کا اثر رہا وہاں فاسق فاجر حکام کا بھی اثر رہا۔ حافظ ابن حزم لکھتے ہیں کہ ”زمانہِ نبیر کے بعد مدنیہ میں عمرو بن سعید، حجاج بن یوسف، طارق، خالد بن عبداللہ، قسری، عبدالرحمن بن ضحاک، عثمان بن حیان مرئی ایسے فاسق اور فاجر بادشاہوں کا دور رہا اور ان کے اخلاقی اثرات اور وحشت خیز بدعات سے بھی مدنیہ الرسول متاثر ہوا (الاحکام)، امام مالک کے زمانہ میں مدنیہ اس ملی جلی تہذیب کا مظہر تھا۔ معلوم نہیں مولانا ممالک کے نقطہ نظر کو کہاں تک قابلِ لحاظ سمجھیں۔“

(۹) ایک صدی کے مختلف اثرات کے بعد مولانا اہلِ مدنیہ کے عمل کو اس وہمِ باطن کی بنیاد پر سنت کی اساس قرار دیتے ہیں کہ یہ آنحضرت کے ارشادات سے ماخوذ ہوگا اور سنتِ صحیحہ سے اس لئے گھبراتے ہیں کہ خبر واحد ظنی ہے۔ اوہام و ظنون کو علوم پر ترجیح ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور نہ ہی مولانا ایسے فہیم آدمی سے اس کی امید ہونی چاہیے۔ صلت علی الاسد و بلت عن النقد کی مثال اس سے زیادہ اور کیا ہوگی۔ مولانا نے کس سادگی سے فرمادیا۔

”اس طریقہ سے معلوم شدہ سنت کو اس علمِ سنت پر ترجیح دی گئی جو اخبارِ آحاد

سے حاصل ہو۔“

مدنیہ کے نام پر جذباتی اپیل تو کی جاسکتی ہے، علم و درایت کی دنیا میں اُس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

(۱۰) حقیقت یہ ہے کہ امام مالک خود بھی اہلِ مدنیہ کو یہ اہمیت نہیں دیتے جو اُسے مولانا دے رہے ہیں۔ وہ سنتِ صحیحہ کو اہلِ مدنیہ کے عمل سے رد کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اگر ان کی نظر میں یہ عمل اس قدر اہم ہوتا تو وہ ہارون الرشید کی موطا مالک کے متعلق پیش کش فوراً منظور فرما لیتے۔

انہ شاور مالک کافی ان یعلق الموطا خلیفہ ہارون نے امام مالک سے مشورہ کیا کہ



فی الکعبۃ ۛ یجمل الناس علی مآئیں  
فقال لا تفعل فان اصحاب رسول الله  
صلی الله علیہ وسلم اختلفوا فی الفروع  
وتفرقوا فی البلدان وکل سنة مضت  
قال وفک الله یا ابا عبد الله -

رحۃ الشرح ۱۱۶، اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۹۶  
مفتاح السعادة تاشکری زادہ ۲۲ ص ۸۶

موطا کو ملک کا قانون قرار دے کر کعبہ میں لٹکا دیا  
جاتے تاکہ لوگ اس کے اتباع پر مجبور ہوں،  
امام مالکؒ نے فرمایا، صحابہؓ کا فروع میں اختلاف  
تھا اور وہ مختلف ممالک میں پھیل گئے۔ جو  
کچھ ان سے منقول ہے سب سنت ہے۔  
ہارون نے معاملہ سمجھ کر فرمایا، اللہ تمہیں  
خیر کی توفیق دے۔

امام مالکؒ تمام صحابہؓ کے علوم کو سنت سمجھتے ہیں۔ علم مدینہ میں ہو یا کسی دوسرے شہر میں  
وہ اہل مدینہ کے علم کو سنت کی بنیاد نہیں سمجھتے، موطا میں عمل اہل مدینہ کا ذکر ترجیح اور تائید  
کے لئے ہے، اصل دلیل وہاں بھی سنت ہی ہے جس کا ثبوت اُسی طریق سے ہوگا جو محدثین  
میں متعارف ہے۔ مولانا نے جس انداز سے اہل مدینہ کے عمل کا ذکر فرمایا ہے متاخرین ممالک  
یا مولانا ایسے دکلا جو مقام چاہیں اُسے عنایت فرمائیں، امام مالکؒ پر اس کی ذمہ داری نہیں  
ڈالی جاسکتی۔ امام قطعاً اس کے حق میں نہیں کہ اہل مدینہ کے عمل سے سنت صحیحہ کو رد کیا  
جائے۔ یہ ایسی وکالت ہے جسے موکل پسند نہیں کرتا۔

(۱۱) بقول امام ابن حزمؒ تین سو کے قریب اہل علم مدینہ سے کوفہ اور ان اطراف میں  
آباد ہو گئے اور اسی کے پس و پیش شام میں، اور ان کی یہ ہجرت محض دینی اور تبلیغی ضرورتوں  
کے پیش نظر تھی، اس اشارہ کی یہ کتنی سخت سزا ہو گئی کہ ان کا عمل نہ حجت ہے نہ سنت کے لئے  
اساس، اور بعض دوسرے حضرات جو دینی یا دنیوی ضرورتوں کے تحت مدینہ میں آباد ہو گئے ان کے  
اعمال سنت نبویؐ کے لئے کسوٹی قرار پائے۔ اگر وطنی عصیت کا دین میں یہ مقام ہو تو غلطی  
کی کیا قدر قیمت رہ گئی۔

فما حب الیاء شققن قلبی

ولکن حب من سکن الیاء

(۱۲) اگر انسانی اعمال کو محض شرف و طبیعت کی بنا پر احادیث صحیحہ اور اخبار احاد  
پر بے اعتمادی کا ذریعہ بنایا جائے تو انکار حدیث کے ایک خطرناک باب کھل جائے گا۔



لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ۔

(۱۳) اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غیر مدنی صحابہؓ کے پاس بھی علوم نبویہ کے ذخائر موجود تھے اور ان میں بعض ایسے بھی تھے جو اہل مدینہ کے پاس نہیں تھے۔ اس صورت میں اگر حدیث پر عمل کیا جائے تو اہل مدینہ کے عمل کی حیثیت کیا رہی؟ اور اگر اہل مدینہ کے عمل کو ترجیح دی جائے تو منکرین سنت نے آخر کیا جرم کیا؟ اس اصول سے حجت حدیث کے مسلک کو مدد ملی یا انکار حدیث کی تائید ہوئی؟ اس کا فیصلہ مولانا ہی فرما سکتے ہیں۔

(۱۴) امام مالکؒ نے مؤطا میں چند مقامات پر اہل مدینہ کے عمل کا ذکر فرمایا ہے ان کا اپنا انداز ترجیح کی حد تک ہے، الزام و حجت نہیں بلکہ بعض مقامات پر تو یہ تذکرہ صرف اظہار واقعہ کے طور پر آیا ہے۔ حافظ ابن القیمؒ مؤطا کی سرکاری حیثیت کے متعلق ہارون الرشید کی تجویز اور امام مالکؒ کے انکار کے بعد فرماتے ہیں :

وهذا يدل على ان عمل اهل المدينة ليس عندنا حجة لجميع الامة  
وانما هو اختيار منه لما رأى عليه العمل ولم يقل قط في مؤطاه  
ولا غيره لا يجوز العمل بغيره بل يخبر اخبارا مجردا ان هذا  
عمل اهل بلدة فانه رضى الله عنه وجزاه عن الاسلام خيرا  
ادعى اجماع اهل المدينة في نيف واربعين مسألة۔

(اعلام منيرية، ج ۲ ص ۲۹۷)

”اسی سے ظاہر ہے کہ اہل مدینہ کا عمل حجت نہیں، نہ اُمت پر ہی اُسے قبول کرنا ضروری ہے بلکہ مطلب صرف ایک واقعہ کا اظہار ہے۔ اہل مدینہ کے اجماع کا ذکر امام نے قریباً چالیس مواقع پر فرمایا ہے۔“

سنت سازی کی توجیہ غالباً مولانا نے کسی مالکی کے بیان سے فرمائی یا اپنی ہی درایت سے اسے جنم دے دیا، امام مالکؒ کے ارشاد سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔

مولانا اصلاحی گواہ حدیث نہیں لیکن وہ کھلے ذہن سے سوچنے کے عادی ہیں۔ اگر وہ اعلام الموقعین ج ۲، اور احکام ابن حزم ج ۲ ملاحظہ فرمائیں تو وہ راقم سے اتفاق فرمائیں گے



حافظ ابن قیم اہل مدینہ کے عمل کا پس منظر

اہل مدینہ کے عمل کے اجزائے ترکیبی ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

”کان یحسب من فیہا من العفتین والامراء والمحتسبین  
على الاسواق ولم تکن الرعیۃ تخالف هؤلاء فاذا اتقی المقتنون نفقة  
الوالی وعمل به المحتسب وصار عملاً فہذا هو الذی لا یلتفت الیہ  
ما عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وخلفائہ والصحابۃ  
فذاک ہوا السنۃ فلا یخلط احدہما بالآخر فنحن لہذا العمل  
اشد تحکیمًا وللعمل الاخر اذا خالف السنۃ اشد ترکاً وبالله  
التوفیق (اعلام ج ۲ ص ۳)

”خلفاء راشدین اور صحابہ کا دور گزرنے کے بعد اہل مدینہ کا عمل کیا  
تھا۔ مفتی کا فتوے، امیر کا حکم اور کو تو ال کا احتساب، رعیت اس کی مخالفت  
نہیں کرتی تھی لیکن یہ قطعاً قابل توجہ نہیں، آنحضرت خلفاء اور صحابہ کا عمل تو  
سُنّت ہے۔ ہم ان کا فیصلہ قبول کرتے ہیں اور اس کے ساتھ دوسری کوئی چیز غلط  
نہیں کرنا چاہتے اور اس کے سوا جو عمل سُنّت کے خلاف ہوا اس کا حتمًا انکار کرتے  
ہیں۔“

اس کے بعد حافظ ابن قیم نے ایسی سُنّتوں کا ذکر فرمایا جو خلفاء اور صحابہ کے وقت  
موجود تھیں لیکن موالک نے ان پر عمل ترک کر دیا۔

یہی تذکرہ حافظ ابن حزم اس طرح فرماتے ہیں:

”یہ زمانہ بغیر تو گذر گیا۔ اس کے بعد عمرو بن سعید اور حجاج بن یوسف  
ایسے فاسق اور ظالم بھی مدینہ کے والی بنے اور عمرو بن حزم اور عمر بن عبد العزیز ایسے  
صالح اور نیک بھی اور اہل مدینہ کا عمل ان کے اثرات کا دوسرا نام تھا۔ مختصرًا۔  
(الاحکام ج ۲ ص ۱۱۵)

مصر بھی آج کل علم ”درایت“ کا گہوارہ ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اہل مدینہ کے عمل کے  
متعلق ایک مصری عالم کی رائے بھی سن لیجئے۔ شیخ حسن احمد الخطیب فرماتے ہیں:



”قالوا ان عمل اهل المدينة كعمل غيرهم من اهل الامصار  
فلا فرق بين عملهم وعمل اهل العراق والشام والحجاز والاندلس  
العبارة بالسنة فمن كانت معهم فهم اهل العمل المتبع وكيف  
يكون عمل بعضهم حجة على بعض اذا اختلف علماء المسلمين و  
قد انتقل اكثر اصحاب رسول الله صلعم عن المدينة وتفرقوا في  
الامصار واكثر علماءهم صاروا الى الكوفة والبصرة والشام والاندلس  
الحجة فهي الاصل الذي يجب ان يرجع اليه وعمل مصر او  
بلد اصلا لا معيار في التشریع (مخلصا فقه الاسلام ص ۱۲)

”جمہور آئمہ کا خیال ہے کہ مدنیہ کو عمل میں باقی شہروں پر کوئی مرتبہ حاصل نہیں یا اختلاف  
کے وقت سنت کا اتباع اصل چیز ہے، کسی عالم کا قول دوسرے پر حجت نہیں۔ صحابہ مختلف  
ممالک میں پھیل گئے۔ سب کے پاس علم تھا، اصل چیز سنت ہے کسی شہر کا عمل تشریع کی بنیاد  
قرار نہیں پاسکتا۔“

جمہور آئمہ اسلام کی عمل اہل مدنیہ کے متعلق یہی رائے ہے۔

## خبر آحاد

خبر آحاد کے متعلق بہت سے فنی مباحث ہیں جن کی تفصیل اصول فقہ اور اصول

۱۵ خبر کی دو قسمیں ہیں، متواتر اور آحاد، متواتر کی حجت پر سب عقلمند متفق ہیں البتہ سمیعہ اور  
براہمہ متواتر کو بھی حجت نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ کسی خبر سے بھی یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا،  
جب افراد اور آحاد سے یقین حاصل نہیں ہوتا تو متواتر انہی کے مجموعہ کا نام ہے، اس پر یقین کہا  
سے آگیا۔

متواتر کے سوا باقی سب آحاد ہیں، خبر دینے والا ایک ہو یا دس بیس، اصطلاح میں یہ خبر  
واحد ہی ہوگی۔ متواتر کا وجود چونکہ نسبتاً کم ہے، دُنیا اور دین کے تمام کاروبار کا انحصار خبر واحد  
پر ہے، دینی مسائل بھی اکثر خبر واحد ہی سے ہم تک پہنچے ہیں اور دُنیا کی بیشتر اطلاعات میں بھی خبر



حدیث کی بسوطات میں پائی جاتی ہے۔ آحاد میں راویوں کی کوئی تعداد معین نہیں۔ متواتر کے واحد ہی کا فرما ہے۔ حکومت سے لے کر عوام الناس تک اگر خبر واحد پر اعتماد کرنا ترک کر دیں تو کاروبار کا پورا کارخانہ برباد اور تباہ ہو کر رہ جاتے، دوسری طرف تو اتر کے عدد کا کسی کام کے لئے اجتماع ناممکنات سے ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام وفود بھیجتے، ان وفود کی اطلاعات پر لڑائیاں لڑی جاتیں، ہزاروں جانیں ضائع ہو جاتیں مگر خبر واحد کی افادی حیثیت کبھی زیر بحث نہیں آتی۔  
قرآن مجید نے فرمایا:

اِذَا جَاءَكُمُ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوْا  
جُبُّ کوئی فاسق فاجر آدمی بھی نہیں اطلاع دے تو اس خبر کی تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ بعد میں  
اَنْ تَصِيْبُوْا قَوْمًا بِيْحٰثَالِهٖ فَتَصْحٰجُوْا عَلٰی  
ندامت اٹھانی پڑے۔  
مَا فَعَلْتُمْ ذٰلِكَ مِثْنًا۔ (۶: ۴۹)

فاسق کی خبر کو مسترد کرنے کا حکم نہیں دیا گیا البتہ تحقیق و ثبت کی تائید فرمائی گئی ہے۔ آیت میں وصف فسق کی تخصیص سے ظاہر ہے کہ ثقہ اور متدین آدمی کی اطلاع کے لئے یہ بھی چنداں ضروری نہیں، اس سے ظاہر ہے کہ خبر واحد کو دین اور دنیا کے معاملات میں کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ منافقین کے ارجاف سے بچنے کے لئے یہ تجویز نہیں کہ ان کی باتوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دو بلکہ یہ فرمایا ایسی خبریں اہل علم اور اہل استنباط کی طرف لوٹائی جائیں تاکہ وہ ان سے صحیح نتائج اخذ کر سکیں۔ تبلیغ و موعظت کی ضرورت کے پیش نظر فرمایا: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ (۱۲۲: ۹) یعنی ہر گروہ سے کچھ لوگ علم و فقہ و تفقہ کے لئے سفر کریں اور واپس آ کر اپنی قوم کو ڈرائیں۔ ”طَائِفَةٌ“ کا لفظ ایک اور اس سے زائد کے لئے مستعمل ہوتا ہے اور یہ خبر واحد ہی ہوگی، ان کے علم انداز پر کوئی عددی پابندی نہیں لگائی گئی کہ جب تک وہ سلوچپاش نہ ہو جائیں کوئی بات زبان سے نہ کہیں۔ معلوم ہے جب وہ کہیں گے تو قرآن عزیز کی ہدایت کے مطابق ان کے ارشادات پر لازماً اعتماد ہوگا، خبر واحد کی حجت اور اعتماد کے متعلق قرآن عزیز کی یہ صراحت ہے۔ آنحضرتؐ پر بھی پابندی نہیں لگائی کہ جب تک مخاطبین کی تعداد حد تو اتر تک نہ پہنچ جائے آپ کوئی لفظ زبان سے نہ فرمائیں، اگر خبر واحد شرعاً مستند نہ ہوتی تو آنحضرتؐ کے ارشادات پر ضرور کوئی نہ کوئی پابندی لگائی جاتی۔ ظاہر ہے کہ خبر واحد شرعی حجت ہے۔



علاوہ سب آحاد ہیں۔ اگر خبر واحد میں یقین کے قرائن موجود نہ ہوں یا ضعف کے قرائن پائے جائیں

اسی لئے ائمہ سنت نے تثبت اور تحقیق کے بعد اسے حجت مانا ہے، قرائن کے بعد اسے پوری اہمیت دی ہے اور جو اس سے ثابت ہو اسے علم کی حیثیت سے قبول فرمایا ہے۔ سلسلہ احادیث میں اکثر آحاد ہیں، ائمہ حدیث نے جہاں ضرورت محسوس کی، تحقیق اور توثیق فرمایا۔ قرائن کی چھان پھٹک فرمائی ہے، اس کے لئے اصول وضع فرمائے اور اسے قبول فرمایا۔ یہی ممکن تھا، امکان کی حدود سے آگے انسان کے اختیار کی چیز نہیں۔ اس کا علم اور عمل سعی اور کوشش، ممکنات تک محدود ہے، اس سے زیادہ کی تکلیف نہ اسے قدرت نے دی ہے نہ وہ اس کا مکلف ہے۔

خبر واحد اور اس پر بحث و نظر پہلی صدی ہجری اسلامی روایات کا مقدس دور ہے، شریعت کی علمی اور عملی روایت اس وقت اپنے جو بن پر تھیں۔ جو کچھ اس وقت ہوا وہ اسلامی نقطہ نظر سے بہت حد تک احترام و قبول کا مستحق ہے۔ ابن حزم فرماتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری میں خبر واحد بلا انکار قبول کی جاتی تھی۔ اہل سنت، خوارج، شیعہ، قدریہ سب اسے قبول کرتے تھے۔ پہلی صدی کے بعد متکلمین معتزلہ نے اس میں اجماع اُمت کی مخالفت کی (احکام الاحکام ج ۱ ص ۱۱۱) شیخ محمد ابراہیم الوزیر الیمینی (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں:

”وقد انعقد اجماع المسلمین علی وجوب قبول الثقات فیما لا یدخلہ النظر

ولیس ذالک بتقلید بل عمل بمقتضی الادلة القاطعة الموجبة لقبول خبر الواحد

وہی محررة فی موضعہا من فن الاصول ولم یخالف فی هذا الاشرذمة،

یسیرة وہم متکلمو ابغداد من المعتزلة والجماع منطبق قبلہم وبعہم

علی بطلان قولہم اھ الروض الباسم ص ۳۷

”ثقات کی ایسی خبریں جن پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ ان کے قبول پر اہل اسلام کا اجماع

ہے اور یہ تقلید نہیں بلکہ قطعی دلائل کا تقاضا ہے جن کا مفاد یہ ہے کہ اخبار آحاد کا قبول اور

ان سے احتجاج ضروری ہے۔ یہ مسئلہ فن اصول میں اپنی جگہ پر مرقوم ہے اور بغداد

کے معتزلہ متکلمین کے سوا کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس پر اجماع پہلے بھی تھا

اور اب بھی ہے۔“

اخبار آحاد پر اعتراض عموماً ان لوگوں نے کیا جو انسانی نفسیات سے ناواقف اور



ایسی خبر سے قطعاً علم حاصل نہیں ہوگا۔ ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ولا ریب ان مجرّد خبر الواحد

ان کی حدود امکان سے نا آشنا تھے۔ آج بھی اس میں وہی نیچر پرست شبہات کی راہیں پیدا کر رہے ہیں جو زمین پر بیٹھ کر آسمان کی باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ مختلف ادوار میں اخبارِ احاد کے خلاف انہی حلقوں سے آواز اٹھی جو یا تو خود بدعت کے داعی تھے یا اہل بدعت سے ایک گونہ متاثر تھے۔

۴ منکرین کو نسی حدیث کے ؟ کب ؟

۱۔ خوارج جو اہل بیت کے فضائل میں تھیں۔ ۲۰۰ھ

۲۔ شیعہ جو احادیث صحابہؓ کے فضائل میں تھیں۔ ۲۰۰ھ

احادیث صفاتِ الہی

۳۔ معتزلہ اور جہمیہ

جو احادیث غیر فقہ صحابہؓ سے مروی

۴۔ قاضی عیسیٰ بن ابان

ہیں۔

اور ان کے اتباع

۲۲۱ھ

۵۔ متاخرین فقہار سے

قاضی الوزید دہلوی وغیرہ

اصول اور فروع دونوں میں ان حضرات

۶۔ اس کے بعد معتزلہ اور

نے خبر واحد سے اختلاف کیا۔

مشکلمین کے ساتھ متاخرین

فقہاء کی ایک مختصر سی

جماعت

یہ حضرات فن سے قطعاً ناواقف تھے

۷۔ یورین تہذیب سے

ان کی تئیں میں احادیث تاریخ کا ذخیرہ

مرعوب گروہ، مولوی

ہیں جو ان کی نیچر کے موافق ہوا قبول کر لیا

چراغ علی، سرسید

اور جو مخالف ہوا ترک کر دیا۔

احمد خاں وغیرہ

۱۳۰ھ کے

قریب قریب

۸۔ مولوی عبداللہ عظیمی  
مستری محمد رمضان گوجرانوالہ

۱۳۰ھ



ہندی لادیل علی صدقہ لایقید العلم الرود علی المنطقین (ص ۳۸) خبر واحد میں اگر صدق کے

مولوی حسرت علی لاہوری،  
مولوی رفیع الدین ملتانی

احادیث کا بالکلیہ انکار

۱۳۰۰ھ کے بعد

۹۔ مولوی احمد دین صاحب  
امرتسری، مسٹر غلام احمد  
پر دینر۔ یہ حضرات مسند  
سے متاثر ہیں لیکن جاہل  
اور غیر محتاط۔

ان کے نزدیک قرآن وحدیث اور پورا  
دین ایک کھیل ہے یا زیادہ سے زیادہ  
ایک سیاسی نظریہ جسے ہر وقت ہمیں  
بدلنے کا حق حاصل ہے۔ مولوی احمد دین  
بعض متواتر اعمال کو مستثنیٰ سمجھتے  
تھے۔

۱۰۔ مولانا شبلی مرحوم، مولانا  
حمید الدین فراہی، مولانا  
ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین  
احسن اصلاحی اور عام  
فرزندانِ ندوہ، باشتنائے  
حضرت سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ

یہ حضرات حدیث کے منکر نہیں لیکن ان کے  
اندازِ فکر سے حدیث کا استحقاق  
اور استحقاق معلوم ہوتا ہے اور طریقہ گفتگو  
سے انکار کے لئے چور دروازے کھل سکتے  
ہیں۔

یہ جدول میرے ذاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے، مجھے اس کے کسی حصہ پر اصرار نہیں۔ میں ممنون  
ہوں گا اگر مجھے میری لغزش سے آگاہ کیا جائے۔ میرے خیال میں تحریک انکار حدیث تدریجی  
ارتقار سے اس مقام تک پہنچی ہے۔

تحقیق و ثبوت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے اور فی الحقیقت  
اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا۔ قرآنِ عزیز کے  
الفاظ کی تاویل میں جب اختلاف ہو تو اس کے الفاظ کی قطعیت میں شبہ نہیں ہوگا، لیکن  
مفہوم کی تاویل اور اس کے تعین میں بحث رہے گی، جو تاویل قواعدِ صحیحہ اور علومِ سنت کے  
خلاف ہوگی اس کے منکر کو قرآن کا منکر کہا جائے گا۔ اختلافِ تاویل کسی کو اس فتوے سے بچا



قرآن موجود نہ ہوں تو اس سے علم حاصل نہیں ہوگا۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتبِ حدیث کے پانچ طبقات متعین فرمائے ہیں، آخر میں فرمایا: اما الطبقة الاولى والثانية فعليهما اعتماد المحدثين وحرمانهما مرتعهم ومسرحهم الخ۔ ائمہ حدیث کا اعتماد پہلے اور دوسرے طبقہ پر ہے۔ یہی ان کے اعتماد کا محوری نقطہ ہے۔ تیسرا طبقہ جس میں سہقی، طحاوی، مصنف ابن ابی شیبہ اور طبرانی وغیرہ کو شمار کیا ہے، اس سے صرف ماہرین فن استفادہ کر سکتے ہیں، یہ عوام کے استعمال اور استفادہ کی چیز نہیں۔ باقی طبقات سے اہل بدعت استدلال کرتے ہیں۔ اہل حدیث ان پر اعتماد نہیں کرتے۔ (حجۃ الشرح ۱، ص ۱۸۱) کیونکہ ان طبقات میں صدق کے قرائن ناپید ہیں، ان کی اسانید میں خبط ہے۔ اور ان کے رجال کتابوں میں عموماً ناپید ہیں۔

**صدق کے قرائن** اگر احاد کے متعلق صدق کے قرائن موجود ہوں، مثلاً اس کی سند صحیح ہو، اُمت نے اسے قبول کیا ہو، مصنف نے صحت کا التزام کیا ہو، اُمت نے اس التزام کو درست تسلیم کیا ہو، اہل علم نے ان کتب کی خدمت کی ہو، شرحیں لکھی ہوں، لغات کو حل کیا ہو، رجال کو منضبط کیا ہو، مقدمات و حواشی لکھے ہوں، غرض اعتماد کی نظر سے دیکھا ہو یا واحد عن واحد منقول ہو اور اس میں شرائطِ صحت پائی جائیں یا اُمت نے عملاً اسے قبول کر لیا ہو، رواۃ کی ثقاہت معلوم ہو، ان حالات میں اس سے بھی یقین حاصل ہوگا اور اس پر عمل بھی واجب ہوگا۔ علامہ آندی نے خبرِ واحد کے متعلق بہت بسط سے لکھا ہے لیکن اہل ظاہر اور اہل حدیث کے مسلک کا ذکر بہت اجمال سے

نہیں سکتا۔ ٹھیک اسی طرح جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مترادف صرف اختلاف اور وہ بھی ایسے حضرات کا جو حقیقت سے آگاہ نہیں کسی حقیقت کو اپنے موقف اور مقام سے نہیں ہٹا سکتا۔ قرآن اختلافِ تاویل کے باوجود خدا کا کلام ہے اور شرعاً حجت، اسی طرح حدیث تحقیق و ثبوت کے باوجود خدا کی طرف سے ہو، ہے اور دین میں قرآن کے بعد حجت، امام عثمان سعید دارمی (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں: لان هذا الحديث انما هو دين بعد القرآن (نقض الدارمی علی بشر المریسی ص ۱۳)



فرمایا ہے، ”الاحکام فی اصول الاحکام ابن حزم“، صواعق مرسلہ علی الجہمیہ والمعتزلہ میں دونوں مسلک تفصیل سے مرقوم ہیں، اسی سے اہل حدیث کا مسلک پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ والقسم الثانی من الاخبار ما نقله الواحد من الواحد فهذا اذا اتصل برواية العدول الى رسول الله صلى الله عليه وسلم وجب العمل به ووجب العلم بصحته ايضا (الاحکام، ج ۱ ص ۱۱۱) ”جب ایک راوی دوسرے سے اتصال کے ساتھ نقل کرے اور یہ عادل ہوں تو اس پر عمل بھی واجب ہے اور اس کی صحت پر یقین بھی ضروری ہوگا۔“ دوسرے مقام پر مرقوم ہے۔ فصح بهذا اجماع الامة كلها على قبول خبر الواحد الثقة عن النبي صلى الله عليه وسلم (الاحکام ج ۱ ص ۱۱۱)۔ ”خبر واحد صحیح کے قبول پر پوری اُمت کا اجماع ہے۔ پھر ج ۱ ص ۱۱۱ میں فرمایا: وقد ثبت عن ابي حنيفة ومالك والشافعي واحمد وداود رضي الله عنهم وجوب القول بخبر الواحد وهذا حجة على من قلد احدهم في وجوب القول بخبر الواحد۔ (احکام) آئمہ اربعہ اور داؤد ظاہری سب خبر واحد کے قبول پر متفق ہیں اور یہ ان کے اتباع پر حجت ہے۔

**متاخرین فقہار** ابن حزم متقدمین آئمہ کے اجماع کا ذکر فرمانے کے بعد متاخرین فقہار کا ذکر فرماتے ہیں جو معتزلہ اور متکلمین سے متاثر ہو کر مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے تھے اور جنہوں نے ظن مصطلح کو حدودِ علم سے باہر سمجھا۔ امام نے دو اصول پر زور دیا ہے۔ (۱) وہ فرماتے ہیں کہ دین کامل ہے جیسے آیت الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ الخ سے ظاہر ہے، پھر اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لی جو اَنَا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ سے واضح ہے۔ اگر متاخرین فقہار کے خیال کے مطابق کامل دین پر ظنون اوہام غالب ہو جائیں اور حق اور باطل اس طرح آمیز ہو جائیں کہ امتیاز ناممکن ہو تو حقائق کا وعدہ کس طرح پورا ہوا؟ کیونکہ ذکر کا لفظ کتاب اللہ اور سنت دونوں پر حاوی ہے۔ پس اگر متاخرین کا خیال مان لیا جائے تو هذا السلاخ من الدين وهم للدين وتشكيك

لہ آئمہ اصول نے خبر واحد کو ظنی لکھا ہے، اس ظن کا محدثین کی اصطلاح میں یہ مطلب ہے کہ اس علم کا مرتبہ اُس علم سے کم ہے جو متواتر سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ ظن بمعنی وہم نہیں جیسے منکرین حدیث نے سمجھا۔ (من المؤلف)



فی الشرائع - احکام ج ۱ ص ۱۲۱) اس عقیدے کے بعد انسان دین سے بالکل بیخارج ہو جائے گی۔

اور دین کی پوری عمارت پتھر پتھر سے بنائی جائے گی۔  
(۲) معلوم ہے کہ خبر واحد میں تمام شبہات سند کی وجہ سے ہیں۔ صحابہؓ نے جب آنحضرتؐ سے سنا، اس وقت نہ تو سند تھی نہ کوئی شبہ گویا اللہ کی حفاظت ہمیں ختم ہو گئی، مستقبل کے لئے سنا، اس وقت نہ تو سند تھی نہ کوئی شبہ گویا اللہ کی حفاظت سے ہی ہوگا۔ فقد ثبت یقیناً ان لازماً دین قیامت تک محفوظ ہوگا اور یہ آحاد کی حفاظت سے ہی ہوگا۔  
خبر الواحد العدل عن مثله مبلغاً عن مثله الى رسول الله صلى الله عليه وسلم  
حق مقطوع به موجب للعمل والعلم معاً واحکام، ج ۱ ص ۱۲۲) لہذا ثابت ہوا کہ  
حدیث صحیح متصل پر عمل واجب ہے اور اس کی صحت بھی یقینی ہے۔

## اہل حدیث کا مسلک

اہل حدیث کے نزدیک خبر واحد میں جب صدق کے قرائن پائے جائیں یعنی حدیث کی ثقاہت اور اتصال وغیرہ قرائن موجود ہوں تو وہ مفید علم ہوگی وعند بعض اہل الحدیث یوجب العلم لانه یوجب العمل ولا عمل الا عن علم اھ (تلویح ص ۳۰۲) عمل علم کی فرع ہے، جب علم ہی نہ ہو تو عمل کیسے ہوگا۔ اس لئے اہل حدیث کا مذہب ہے کہ خبر واحد سے علم اور یقین حاصل ہوگا۔ آمدی فرماتے ہیں: والمختار حصول العلم بخبره اذا احتفت به القرائن ويمتنع ذلك عادة دون القرائن والاحکام لا بدی ج ۲ ص ۲۵) مختار مذہب یہی ہے کہ اگر قرائن موجود ہوں تو علم حاصل ہوگا ورنہ عادة منع ہے۔ اصول بردوی ص ۶۹ ج ۲۔ قال بعض اہل الحدیث یوجب علم الیقین لما ذکرنا انہ وجب العمل ولا عمل من غیر علم وقد ورد الاحادیث فی احکام الآخرة مثل عذاب القبر ورؤية الله تعالى بالابصار ولا حظ لذلك الا العلم اھ بعض اہل حدیث نے کہا کہ خبر واحد سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے، کیونکہ جب عمل واجب ہے تو عمل علم کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے اور آحاد میں عذاب آخرت اور رؤیت باری تعالیٰ کے متعلق جو کچھ وارد ہوا ہے اس کا مقصد علم اور اعتقاد ہی تو ہے۔“



بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اعمال میں تو خبر واحد سے استدلال درست ہے مگر اصول اور عقائد میں استدلال درست نہیں۔ بزدوی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل حدیث کے نزدیک یہ تفریق درست نہیں، اہل حدیث اعمال اور عقائد دونوں میں خبر واحد کو حجت سمجھتے ہیں ذہب اکثر اہل الحدیث الی ان الاخبار التي حکم اهل الصنعة بصحتها توجب علم اليقين بطريق الضرورة وهو مذهب احمد بن حنبل (رکشف الاسرار ص ۶۹ ج ۲)۔ اہل حدیث اور امام احمد کا مذہب ہے کہ صحیح احادیث سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ ابن قیم فرماتے ہیں جو لوگ خبر واحد سے علم کی نفی کرتے ہیں وہ معتزلہ اور بدعی فرقوں سے متاثر ہیں بعض فقہار اور ائمہ اصول بھی ان سے متاثر ہیں لیکن سلف امت میں ان کا کوئی پیشرو نہیں، ائمہ سنت امام شافعی، امام مالک، امام احمد، امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ اور ان کے تلامذہ امام ابو داؤد، ابن حزم، حسین بن علی، کرابیسی وغیرہ نے فرمایا کہ خبر واحد یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ امام احمد کے پاس کسی آدمی کا ذکر ہوا جو کہتا تھا کہ خبر واحد سے عمل واجب ہوتا ہے۔ لیکن علم حاصل نہیں ہوتا۔ امام نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا ”میں نہیں جانتا یہ کیا بلا ہے“ (صواعق ج ۲ ص ۳۱۵) اس سے ظاہر ہے ائمہ اربعہ اور قدیمہ اس مسئلہ میں اہل حدیث کے ساتھ میں خبر واحد پر بدگمانی اس وقت پیدا ہوئی جب متکلمین اور فلاسفہ نے اسلامی عقائد پر یورش کی اور متاخرین فقہار اس سے متاثر ہو گئے۔

**وحدان اور شعور** علم اور یقین کا مسئلہ بہت حد تک وجدانی ہے۔ اس معاملہ میں صرف وجدان اور شعور اتنا ہی نہیں، رجال کے اوصاف بھی موثر ہوتے ہیں، زہد و تقویٰ کی کمی کے باوجود جب ہم بااخلاق اور متدین آدمی سے کوئی خبر سن لیں تو ہم اپنے دل میں بہت زیادہ اطمینان محسوس کرتے ہیں، عامی یا غیر متدین آدمی متعدد بھی ہوں تو دل میں وہ یقین پیدا نہیں ہوتا مگر رواۃ کے اوصاف اور دوسرے قرائن سے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ جماعت اسلامی کی قیادت نے عام فرقوں کی طرح خبر واحد کی ظنیت کا وظیفہ شروع فرمادیا، حالانکہ دینی جماعتوں کا طریق فکر، بدعی فرقوں سے مختلف ہونا چاہیے۔ تعجب ہے جس جماعت کی دعوت اقامت دین ہو وہ رواۃ حدیث کا عام خبروں کے رواۃ سے موازنہ کرے اعتراف و تحکم کے مغالطہ سے متاثر ہو جائے اور پھر اس کا اظہار ایسے وقت میں کرے جب ملک میں اہل بدعت احادیث اور سنن کے خلاف ایک شور برپا کر رہے ہوں۔ حالانکہ



اہل دیانت کی وجدانی کیفیت کو اہل دیانت ہی سمجھتے ہیں، اہل بدعت کے لئے اس کا سمجھنا مشکل ہے  
 آئمہ حدیث اس وجدان اور شعور کو اچھی طرح جانتے تھے، انھوں نے اوصافِ رواۃ اور موافق  
 قرآن اور مخالف اثرات کو ذہن میں رکھ کر فرمایا: وَالْأَحَادُ فِي هَذَا الْبَابِ قَدْ تَكُونُ ظَنُونًا  
 بِشُرُوطِهَا فَإِذَا قَوِيَتْ صَارَتْ عِلْمًا فَإِذَا ضَعُفَتْ صَارَتْ أَوْهَامًا وَخَيَالَاتٍ فَاسِدَةٌ  
 ابن تیمیہ بحوالہ صواعق ج ۲ ص ۳۷۷) ”اخبارِ آحاد کبھی ظنی ہوتی ہیں، کبھی علم و یقین کے مترادف  
 اور کبھی اوہام اور فاسد خیالات“

**تَلَقَّى بِالْقُبُولِ** اُمت کے قبول اور عمل سے بھی حدیث یقین کے مقام پر پہنچ جاتی ہے  
 حدیث انما الاعمال بالنیات، حدیث ذوقِ عیلة، صدقہ فطر،  
 حرمتِ نکاح مع العمۃ والخالہ، حدیث حرمتِ رضاع مثل نسب، تعین عشرہ بشرہ  
 وغیرہ احادیث کو اُمت نے عملاً قبول کر لیا ہے، ابن تیمیہ فرماتے ہیں ان سے متواتر ہی کی  
 طرح یقین حاصل ہوتا ہے اما السلف فلم یکن بینہم فی ذالک نزاع (صواعق ج ۲ ص ۲۷۷)  
 صواعق) سلف میں اس کے متعلق کوئی نزاع نہ تھی۔

بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر اُمت متفق ہے اور انھیں تلقی بالقبول کا مقام  
 حاصل ہوا ہے۔ ابن الصلاح فرماتے ہیں لا اتفاق الا مۃ علی تلقی ما اتفق علیہ بالقبول  
 وهذا القسم جمعہ مقطوع بصحته والعلم الیقینی النظری واقع بہ۔  
 (ابن الصلاح ص ۱۷۷) ”اُمت نے صحیحین کی متفقہ روایات کو اجماعاً قبول فرمایا۔ ان احادیث  
 کی صحت قطعی ہے، اس سے علم نظری اور یقینی حاصل ہوتا ہے“ ہم مولانا اصلاحی کو قطعاً  
 تکلیف نہیں دیتے کہ وہ آئمہ حدیث کو معصوم سمجھیں لیکن اُمت کی عصمت پر تو غور  
 فرمانا چاہیے۔ اُمت کی تلقی آئمہ حدیث اور اہل حدیث کے نزدیک بے حد مضبوط قرینہ  
 ہے، تلقی بالقبول اور احادیث صحیحین کے افادہ یقین کے متعلق دراساتِ اہلبیت میں  
 نہایت نفیس اور مبسوط بحث موجود ہے جسے طوالت کی وجہ سے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔  
 اہل تحقیق کے لئے وہ بحث بہت مفید ہوگی۔

متاخرین میں مولانا سید انور شاہ رحمۃ اللہ وقتِ نظر اور وسعتِ معلومات میں  
 یگانہ روزگار تھے، بخاری کے حاشیہ میں فرماتے ہیں: حاصلاً انہ یفید القطع اذ



احتف بالقرائن کخبر الصحیحین علی الصحیح میدانه یکون نظریا ونسب  
الی احمد ان اخبار الاحاد تفید القطع مطلقاً (ج ۴ فیض الباری) ”حاصل یہ  
ہے کہ خبر واحد میں اگر قرائن موجود ہوں تو اس سے علم یقینی ونظری حاصل ہوگا۔ امام احمد سے  
منقول ہے کہ اس سے قطعیت کا فائدہ حاصل ہوگا۔“ دراصل یہ اختلاف قرائن کے قوت  
اور ضعف پر موقوف ہے۔

**اس اختلاف کا پس منظر** انسان ماحول کا غلام ہے، معتزلہ اور آئمہ کلام اور دوسرے  
بدعتی گروہوں کا تعلق عموماً شاہی درباروں سے رہا بجای  
دربار تو ان مناظرہ بازیوں میں مشہور تھے۔ وہاں یہ سب کچھ فتح و شکست اور دفتری اقتدار کے لئے  
ہوتا تھا۔ ان حالات میں سخن سازی، غلط گوئی ہر چیز جائز سمجھی جاتی تھی تاکہ دربار میں اعزاز حاصل  
ہو۔ ایسے وقت میں پارٹی بازی لازمی ہے اور جھوٹ سے پرہیز ناممکن۔ فرد تو فرد ہے، عجمیاں  
غلط بیانی کرتی ہیں، اس ماحول میں خبر واحد پر اعتماد کون کرے اور کیوں کرے۔ اس معاملہ  
میں معتزلہ اور متکلمین معذور ہیں۔

**آئمہ حدیث کی بے نیازی** آئمہ حدیث کا ماحول اس سے بالکل مختلف تھا، دربار  
سے بے نیاز، بادشاہوں سے نفرت، ہر چیز اللہ کی  
رضاء اور خدمت دین کے لئے۔ ابن قیم نے فرمایا: کل احد یعلم ان اهل الحدیث اصدا  
اهل الطوائف کما قال ابن المبارك وجدت الدین لاهل الحدیث والکلام  
للمعتزلة والکذب للرافضة والحیل لاهل الراى ”سب جانتے ہیں کہ اہل حدیث  
بہت سچے ہیں۔ ابن مبارک نے فرمایا، دین اہل حدیث کے پاس ہے، باتیں بنانا معتزلہ کے  
پاس، جھوٹ و روافض کی عادت اور اہل الرائے حیلوں کے عادی ہیں۔“ اس ماحول میں جہاں  
کوئی لالچ نہ ہو جھوٹ کیوں بولا جائے اور کون بولے؟ جو لوگ ان دونوں گروہوں کو برابر  
سمجھیں انھیں اس اختلاف میں تطبیق دینا مشکل ہوگا اور جو لوگ اس پس منظر کو سمجھتے  
ہیں، انھیں اس کے سمجھنے اور تطبیق دینے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ انسان جیسے ماحول  
میں رہے اس کی نفسیات اسی سانچے میں ڈھل جاتی ہیں، ولنعم ما قیل ح



اس عنوان کے تحت ترجمان القرآن ضلہ سے ۲۵۰ ایک

## احادیث سے استفادہ | مولانا اصلاحی ایسے متین اور صاحب فکر کا قلم طرہ تعریف

کی طرف پھر گیا ہے۔ اگر مولانا یہ انداز اختیار نہ فرماتے تو ہم بھی مولانا کے ارشادات پر اور زیادہ غور کرتے، اپنے نقائص اور نارسائیوں کے متعلق ضرور سوچتے۔ اخبارات کے لب و لہج سے جو خلش مولانا کے ذہن میں تھی اس کا انتقام جماعت اور مسلک سے لینے کی کوشش فرمائی گئی۔ عفا اللہ عنہ۔

## ماخذ میں غلو اور تحرب | جہاں تک ہمیں اپنے حالات کا علم ہے اپنی کمزوریوں کے اعتراف کے باوجود ذہن بجمہ اللہ بالکل صاف ہے،

نہ کسی ماخذ کے لئے غلو ہے نہ تعصب، البتہ اپنے اسلاف کے کارناموں کا احترام ضرور ذہن میں ہے۔ اسے تعصب سے تعبیر فرمائیے یا غلو سے، آپ اور آپ کے رفقاء مختار ہیں۔ یہاں نہ ”تحرب“ ہے نہ ”تشیع“ نہ ”یک حثمی“۔ تمام ماخذ کو ان کی ترتیب ہی کے لحاظ سے مانتے ہیں، البتہ مقاصد کو ضرور پیش نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ہمارے ہاں تفقہ، درایت اور قیاس کا اپنی جگہ پر پورا پورا احترام ہے لیکن سنن صحیحہ کو گو وہ آحاد ہی کیوں نہ ہوں، ہم ان جیلوں اور الفاظ کی ہیرا پھیری سے رد کرنا پسند نہیں کرتے، اعمالِ رجال خواہ وہ مدنیہ میں ہوں یا خراسان میں کوفہ میں ہوں یا شام میں، سنت صحیحہ کے ہم پایہ نہیں ہو سکتے۔ ہمارے ہاں اس وہم کی کوئی قیمت نہیں کہ فلاں شخص چونکہ مدنیہ میں مقیم ہے اس لئے اس کے اعمال سنت ہیں، بلکہ ان سے سنت صحیحہ کو رد بھی کیا جاسکتا ہے۔ ہم بجمہ اللہ مراتب کا احترام کرتے ہیں اور جناب کی نصیحت سے بہت پہلے یہ احترام موجود ہے۔ شاہ صاحب اور خطابی نے جمع حدیث کے متعلق جو شکوہ فرمایا ہے وہ اپنی جگہ پر درست ہے، سیوطی، بیہقی، ابن ابی الدنیا، طبرانی، دیلمی وغیرہ نے جس طرح احادیث جمع فرمائی ہیں اس سے واقعی اہل حدیث کے مسلک اور سلف کی روش کو نقصان پہنچا ہے، اہل بدعت بلا تحقیق ان ذخائر سے استدلال کرتے ہیں، لیکن اس میں بھی فن کے لئے کوئی عصبیت نہیں۔ سیوطی، بیہقی وغیرہ عصبیت کی بدگمانی نہیں کی جاسکتی۔ طریقہ تصنیف کی ایک لغزش ہے، یہ حضرات خود بھی اس کے قائل نہیں کہ ان تصانیف میں جو کچھ جمع کیا گیا وہ سب مستند اور قابل عمل ہے۔ مولانا اطمینان رکھیں کہ ہمارے ہاں یہ عیب نہیں۔



جناب کے ہاں دو تین ایسے بزرگ موجود ہیں جنہوں نے اہل حدیث کے ہاں تعلیم پائی ہے ان سے دریافت فرمائیے کہ جماعت اسلامی میں شمولیت سے پہلے کبھی انہوں نے اندھا دھند احادیث کو بلا تحقیق قبول فرمایا؟ یا موضوع اور مقلوب روایات کو قابل عمل سمجھا؟ اب اگر جماعتی عصبیت ان کے اذہان پر غالب نہیں آگئی تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ اہل حدیث میں بحمد اللہ دھاندلی نہیں ہے بلکہ ائمہ جرح و تعدیل اور اہل نقد و نظر کے افکار سے استفادہ یہاں کا شعار ہے۔

اول تو ہم قرآن اور حدیث، قرآن اور عقل سلیم میں تعارض کے قائل ہی نہیں لیکن اگر بظاہر کہیں تعارض محسوس ہو تو اصول کی حد تک یقیناً یہی بات ہے کہ حدیث کا درجہ قرآنِ عزیز کے بعد ہی ہونا چاہیے۔ اصول حدیث میں تطبیق، ترجیح، توقف کی ساری صورتیں موجود ہیں کما فصل فی موضعتہ

ہاں استدلال اور اخذ مسائل کے وقت ہمارے نزدیک حدیث وحی ہے اور اس کا اُسی طرح آنحضرتؐ کو علم دیا گیا جیسے قرآن کا۔ آنحضرتؐ نے قرآن کے الفاظ ہم تک پہنچائے اور احادیث کا مفہوم، اور ہمارا ایمان ہے کہ آنحضرتؐ نے اس باب میں پوری امانت اور صحیح دیانت سے کام لیا ہے یہی حال صحابہؓ کا تھا، ہمیں ان کے علم و دیانت پر پورا یقین ہے۔ عن حسان ابن عطیة کان جبریل ینزل بالقرآن والسنة ویعلمہ ایأھا کما یعلمہ القرآن۔ (صواعق ص ۲۲ ج ۲۔ شاطبی ج ۲۔ جامع بیان العلم ابن عبد البر) جبریل قرآن اور سنت دونوں کو لے کر نازل ہوتے، آنحضرتؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔ قرآن اور حدیث دونوں مآخذ ہیں اور بیک وقت مآخذ ہیں۔ اسی لحاظ سے آنحضرتؐ نے فرمایا: اوتیت القرآن ومثلہ معہ۔ حلت وحرمت اور بعض دوسرے مسائل میں سنت کو جو مستقل حیثیت حاصل ہے اس پر ہمیں پورا یقین ہے۔ اس مقام پر جناب کا یہ ارشاد بالکل مجمل ہے:

”دین میں ان (احادیث) کی اصلی جگہ قرآن کے بعد ہے نہ کہ اس سے پہلے یا اس کے برابر، اگر کوئی شخص یہ ترتیب الٹ کر ان کو قرآن سے پہلے کر دے یا قرآن کے برابر کر دے تو وہ اسی غلو میں مبتلا ہو جائے گا جس میں اہل ظاہر مبتلا ہوئے جنہوں نے ہر حدیث کو



حدیث متواتر بنا کے رکھ دیا۔  
 اس چستان کی تشریح فرمائیے۔ ہماری نظر میں تو کوئی ایسا آدمی نہیں جو حدیث ہی کو سب  
 کچھ سمجھے، قرآن اور اجتہاد کو نظر انداز کر دے۔ ”در جہان ص ۱۴۱“ نہ ہم نے کوئی ایسا آدمی دیکھا  
 جو تعارض کے وقت یا طریقہ ثبوت کے لحاظ سے حدیث کو قرآن سے مقدم سمجھے، نہ کوئی ایسا  
 آدمی ملا جو ہر حدیث کو متواتر سمجھے، اہل ظاہر سے ابن حزم کی کتابیں اہل علم کی نظر میں ہیں محلی  
 چھپ چکی، الاحکام بازار میں موجود، جمہور الانساب ملتی ہے۔ ہمیں تو ان دعویٰ کی صداقت  
 مشتبہ معلوم ہوتی ہے اور بچارے اہل ظاہر پر یہ کھلی تہمت ہے۔ مولانا ایسے متین آدمی کے قلم  
 سے ایسے الفاظ نہ نکلتے تو بہتر ہوتا۔ وہ قیاس کے سوا باقی تمام مآخذ کو مانتے ہیں۔

غایت یہی ہے کہ بعض ناموں سے کسی خاص طریق فکر کے ساتھ تعلق اور ایک مسلک  
 کے ساتھ ربط معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص جماعت اسلامی میں داخل ہوتا ہے تو اس  
 کا یہ مطلب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ شخص مولانا مودودی کی قیادت کو موجود قیادتوں سے بہتر سمجھتا  
 ہے۔ ان پر اسے زیادہ اعتماد ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوگا کہ وہ مولانا مودودی کو آنحضرت  
 یا صاحبزادہ یا آئمہ پر ترجیح دیتا ہے اسی طرح ایک اہل حدیث کے متعلق یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ حنفی  
 یا شافعی طریق فکر کی بجائے آئمہ حدیث کے طریق فکر کو ترجیح دیتا ہے۔ عملی زندگی میں آئمہ حدیث  
 پر اعتماد کرتا ہے، مگر یہ بدگمانی کیون کی جائے کہ وہ حدیث ہی کو حجت سمجھتا اور قرآن اور اجتہاد  
 کو نظر انداز کرتا ہے۔ ان صفحات میں مولانا کا طریق بحث بہت دلخراش ہے اور ثقاہت سے  
 گرا ہوا ہمیں متانت اور سنجیدگی سے شکوہ ہے کہ اُس نے مولانا کا ساتھ کیوں چھوڑ دیا۔

استفادہ کی دوسری شرط میں مولانا نے فرمایا ہے کہ ”آنحضرتؐ کے بعد  
 کسی کو معصوم نہ سمجھے“ (در جہان ص ۱۴۲) یا اللہ! یہ کس نے کہا؟

کب کہا؟ کیسے کہا؟ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ آئمہ حدیث نے تنقید حدیث کے متعلق صدیوں  
 محنت فرمائی۔ احادیث کی صحت، ضعف، حسن، ارسال، انقطاع، شاذ اور مقبول کے  
 متعلق کچھ عقلی، کچھ لغوی اور عرفی فیصلے فرمائے، ان فیصلوں کو صدیوں سے اہل علم قبول  
 فرما رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی بلاوجہ مخالفت نہ کی جائے، اگر اختلاف ہو تو دلیل سے  
 کیا جائے، اہل فن کے فیصلوں کی روشنی میں کیا جائے۔ اس کا نام عصمت نہیں، اس



ہنگامی کے لئے آئمہ حدیث میں کوئی گنجائش نہیں۔ پورے وثوق اور پوری ذمہ داری سے گزارش ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کسی کے متعلق عصمت کا خیال تک نہیں محدثین بھی انسان ہیں اور جماعت اسلامی کی قیادت بھی انسان۔ البتہ اسی تعصب سے اختلاف ہے کہ ایک جماعت اپنی عقیدہ بندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا ”رسول کا مزاج شناس“ تصور کر لے پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرے، جسے چاہے رد کر دے یا کوئی عالم قائد بلا وجہ کسی موضوع یا مخلق، مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعویٰ کر دے کہ میں نے اس میں ”ہیرے کی جوت دیکھ لی ہے“ یہ متحکمہ خیز پوزیشن نہیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم ان شاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔

ہمیں معلوم ہے، ہیرا ملے یا اس کی جوت، یہ صرف وہی جوہری جان سکتے ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا سنت ہے اور جن کا شب و روز کا مشغلہ سنت ہے۔ مزاج شناسی بھی انہی کا حصہ ہے۔ مولانا فرمائیں متعصب وہ لوگ ہیں جو قواعد اور اصول کا احترام کرتے ہیں یا وہ حضرات جو مفت میں جوہری بن جائیں یا ان کے دوست انھیں مزاج شناس رسولؐ بنا لیں۔

اِنْ هِيَ اِلَّا اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوَهَا اَنْتُمْ وَاَبَاءُكُمْ مَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ۔  
یہ فن کی قدر اور سہنہ کے احترام کا مسئلہ ہے، اس میں عصمت کی کوئی بات نہیں۔ یہ ترجائی غلط ہے اور بالکل غلط۔ اور انتقامی جذبہ کی پیداوار۔ مولانا نے اس مقام پر اہل فن کے متعلق جن شبہات کا اظہار فرمایا ہے، اخبارِ آحاد کے خلاف جو احتمالات پیدا کئے اور انسانی فہم میں جن غلط فہمیوں کی نشاندہی فرمائی ہے اسے ممکن سمجھنے کے بعد عرض ہے کہ جو لوگ آج صدیوں کے بعد ان اغلاط پر مواخذہ کریں گے، ان اغلاط اور غلط فہمیوں کی ٹو لگائیں گے۔ آیا مولانا اور ان کے رفقاء ان کے متعلق عصمت کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ وہ یقیناً فرما سکتے ہیں کہ ان مواخذات میں کوئی لغزش نہیں؛ یقیناً آپ ایسا فرمائیں گے تو خدا را بتایا جائے کہ آپ ظن کو صدیوں کے ظن سے ٹکرا کر ایک ظنی نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور اسے ”ہیرے کی جوت“ یا ”رسول کی مزاج شناسی“ سے تعبیر فرماتے ہیں لیکن اگر اصحابِ وقت کے بروقت فیصلے اور صدیوں کی محنت کے نتائج پر اعتماد کیا جائے تو اس کا نام آپ کی اصطلاح



میں عصمت کا دعویٰ ہے مَا كُنْكَ مَنَّوْنَ۔ متقدمین ائمہ کی تنقید اور دلائل پر کوئی یقین کرے تو اس پر عصمت کی بھرتی اور آج اپنی معلومات کی روشنی میں صدیوں بعد کوئی ظنی فیصلہ ان قانونی فیصلوں کے خلاف آپ کریں تو اس کا نام "بہرے کی جوت" یہ جراثیم آپ پر تنقید کرنے والوں کے لئے پرگمانی کی راہ کھولتی ہیں۔

فاحفظ وقت فتحت قدمك هوة

کم قدم هوی فیہا من الانسان

**وقت کی ضرورت** | ایسے وقت میں جب حدیث اور سنت کے خلاف لادینی حلقوں میں ایک طوفان بپا ہے، اس قسم کی کمزور اور بے اصل باتیں کرنا مناسب نہیں۔ یہ وقت باہم خطابات کی تقسیم کا نہیں اور نہ ہی بحث سے اس طرح پہلو تہی کرنا اس وقت قریب مصلحت ہے۔ یہ معذرت کا انداز اور چور دروازوں کی طرف رہنمائی نہ حدیث کی خدمت ہے نہ سنت کی حمایت۔ پچھلے دنوں مولانا مودودی کی ایک دو بے محل تقریروں سے اخبارات میں کچھ ہنگامہ ہوا تو ہمارے بعض "اہل حدیث" دوست جواب جماعت اسلامی کے ہو چکے ہیں، مولانا کے نظریہ کی دیانتہ کھلی حمایت تو نہ کر سکے مگر اس طرح پردہ پوشی فرمائی کہ "پہلے علماء میں بھی بعض حضرات ایسا کہتے تھے" بعض حضرات "مزاج شناسی" کے حوالوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، حالانکہ مناسب یہ تھا کہ مسلک اعتدال ایسی تحریروں سے مولانا کو بھی روکا جاتا جماعتی تعلقات کا احترام شک کیا جائے لیکن حق کا احترام اور سنت کی حمایت وقت کی شدید ترین ضرورت ہے جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ دنیا میں اسلامی نظام بپا ہونے کی بھی صرف یہی صورت ہے کہ سنت کے جس محاذ پر حملہ ہو، دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مداخلت کی جائے اپنی انصاف پسندی اور وسعتِ ظرف کے ثبوت میں معذرت کا انداز ضرورت وقت کے بالکل خلاف ہے، خود مولانا کو بھی ایسے خوشامد پسند حضرات سے بچنا چاہیئے جن کو صرف یہی فکر ہو کہ ان کی وفاداری مشتبہ نہ ہو جائے۔

**روایت کی عصمت** | راوی نہ معصوم ہیں نہ آج تک کسی نے ان کی عصمت کا دعویٰ کیا، نہ ایسا ممکن ہے، البتہ مجموعی لحاظ سے فن حدیث پر عصمت کا ظن غالب ہے۔ جس طرح حقائق کو اللہ تعالیٰ نے توفیق عنایت فرمائی کہ وہ قرآن کو محفوظ



رکھ سکیں، یعنی ہر حافظ معصوم نہیں، لیکن قرآن کے حفظ کی اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق دی، اسی طرح حفاظ حدیث کو اللہ تعالیٰ نے توفیق مرحمت فرمائی کہ وہ اس کی حفاظت فرما سکیں۔ اجماع امت میں ہر فرد معصوم نہیں لیکن بحیثیت مجموعی اجماع میں مجتہدین کو عصمت کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ تلقی بالقبول میں بھی یہی صورت ہے۔ اگر حدیث دین ہے تو اس کی حفاظت کا ذمہ دار حق تعالیٰ کو ہونا چاہیے۔ یہ حفاظت، حفاظ حدیث ہی کی معرفت سے ہوئی ہے، اس لئے مجموعی حفاظت اور اجتماعی عصمت سے ان کو یقیناً حصہ ملا ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اگر اس سے کوئی چیز ضائع ہو چکی ہے تو اس کی ضرورت نہ تھی اور جس چیز کی ضرورت تھی اسے محفوظ رکھنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو عطا فرمائی۔ **ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ**۔

اس عنوان کے تحت مولانا **حدیث کو تنقیدی نگاہ سے پڑھنے کا مطلب** نے فرمایا ہے کہ ہر حدیث

پر تنقید ضروری نہیں، تنقید کی ضرورت وہاں پیش آتی ہے جہاں کوئی ایسی حدیث آجاتی ہے جو سنت ہی طبیعت کو کھٹکتی ہے جو دین کے مسلمات اور شریعت کے معروفات کے خلاف معلوم ہوتی ہے جس کو عقل عام قبول کرنے سے اول دہلہ میں آبار کرتی ہے، الحج۔ اس ضمن میں مثال کے طور پر مولانا نے تین احادیث کا ذکر فرمایا ہے: حضرت ابراہیمؑ کے تین مرتبہ جھوٹ بولنے کی روایت۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن کی آیات کے ساتھ تلاۃ الغرانیق العلیٰ کے الفاظ پڑھ دینے کی روایت، یا حضرت موسیٰؑ کے ملک الموت کو تھپڑ مارنے کی روایت،

مولانا نے جو فرمایا ایک حد تک مناسب ہے لیکن مولانا ہر ناپسندیدہ مقام پر بچا رہے اہل ظاہر کا ذکر فرمادیتے ہیں، شاید اس لئے کہ اس طریق فکر کا ہمارے ملک میں کوئی مؤید نہیں۔ جہاں تک اہل ظاہر کی کتابوں کا تعلق ہے ان میں یہ چیز موجود نہیں جسے مولانا اہل ظاہر کی طرف منسوب فرما رہے ہیں۔ اہل ظاہر سے بعض مقامات پر لغزش ہوئی ہے لیکن وہ اتنے گئے گندے نہیں جس طرح جناب کے ارشاد سے ظاہر ہوتا ہے۔ ظاہری سکول فکر کے دوزرگ عام طور پر مشہور ہیں، ابن حزم اندلسی اور امام داؤد ظاہری۔ یہ لوگ قیاس کو حجت شرعی تو بے شک نہیں جانتے لیکن حدیث میں ان کا مقام ہم ایسے مدعیان علم و عقل



سے کہیں بلند ہے۔ اس انداز تنقید احتیاط مناسب ہے جو مولانا اصلاحی نے اختیار فرمایا ہے۔  
جن میں احادیث کے متعلق مولانا نے فرمایا ہے کہ عقل عام ان کو قبول کرنے

**تین احادیث** سے اِبار کرتی ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ ایسی مثالیں ذکر کرنے کی بجائے مولانا اپنے رفکار سے مشورہ فرما کر ایک ایسا مجموعہ شائع کر دیتے جس میں وہ تمام احادیث جمع کر دی جاتیں جو مولانا کی طبیعت کو کھٹکتی ہیں یا عقل عام ان کو قبول کرتے سے اِبار کرتی ہے تاکہ کم عقل لوگ اندازہ کر سکتے کہ ایسی احادیث کی مقدار کتنی ہے اور کس کس عقلمند کی عقل کو یہ احادیث کھٹکتی ہیں؟ ممکن ہے کسی کی سمجھ میں کچھ آتا تو وہ آپ سے کچھ عرض کر سکتا۔ عقل اور احادیث میں جب بھی جنگ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، اہل علم نے تطبیق کی صورت پیدا کر دی اور باہم صلح ہو گئی۔ اعلام الموقعین، تاویل مختلف الحدیث یا مشکل الآثار ایسی کتابیں ان شبہات کے پیش نظر لکھی گئیں اور اپنے وقت میں بہت حد تک کامیاب ثابت ہوئیں۔

مولانا نے جن احادیث کا مثال کے طور پر ذکر فرمایا ہے ان کے متعلق مختصر گزارش مناسب معلوم ہوتی ہے۔ حدیث غرائق باتفاق محدثین، اصول محدثین کے مطابق ساقط الاعتبار ہے اور جن الفاظ سے آئمہ حدیث نے اسے قابل استناد سمجھا ہے وہ نہ طبیعت کو کھٹکتی ہے نہ عقل عام اس سے اِبار کرتی ہے۔ معارض ابراہیم علیہ السلام کی روایت اکثر کتب حدیث میں مروی ہے، اس کی سند اصول محدثین کے مطابق صحیح ہے۔ آئمہ حدیث سے فنی طور پر کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔  
رالف، تعجب ہے آئمہ حدیث میں سے یہ حدیث نہ کسی کی طبیعت کو کھٹکی نہ ان کی عقل عام نے اس سے اِباء کیا۔

(ب) متقدمین فقہار سنت سے بھی کسی نے اس پر اشتباہ کا اظہار نہیں کیا غالباً امام رازؒ پہلے آدمی ہیں جن کے مزاج پر یہ حدیث گراں گزری اور انھوں نے دبے لفظوں میں اس کے انکار کی کوشش کی، لیکن امام نے اس چیز پر غور نہیں فرمایا کہ ان رواۃ سے اور بھی بہت سی روایات مروی ہیں۔ بنا بریں جس عیب کی بناء پر اسے رد کیا جائے گا۔ اس کا اثر باقی احادیث پر بھی پڑے گا۔ اس لئے یہ رد تاج کے لحاظ سے آسان نہیں۔

(ج) ابن قتیبہ (رحمہ اللہ) نے ابراہیم بن سبیا نظام جیسے معتزلی کے شبہات کا ذکر کیا ہے۔ نظام کہتے ہیں کہ اکابر صحابہؓ نے (حنبل بن یمان) حضرت عثمانؓ کے پاس جھوٹ بولا۔



ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ تعریفِ تور یہ ہے اور بعض اوقات جھوٹ کی بھی اجازت ہے۔ اس ضمن میں الزام کے طور پر انھوں نے ابراہیم علیہ السلام کی ان تعارض کا ذکر فرمایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظام ایسے غالی معتزلی کو بھی اس وقت اس حدیث پر اعتراض نہ تھا۔ نہ ہی یہ اس کی عقل کو کھٹکتی تھی۔ (تاویل مختلف الحدیث ص ۴۲-۵۳)

(د) معتزلہ اور متکلمین عقل کی پرستش اصول اور عقائد کے مسائل میں کرتے تھے۔ اور صفات باری کے مباحث میں سنت ان کی عقول پر گراں گذرتی تھی مگر فروع میں ان کی عقلوں سے اس احکام کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مسائل بھی ظنی ہیں۔ ان پر ظنی دلائل سے استدلال صحیح ہے۔ آج کے عقل پرست حضرات نہ اصول میں حدیث کو معاف فرماتے ہیں نہ فروع میں عقل پرستہ اباہ یا کھٹکا دراصل موسم کی بات ہے۔

(ھ) فقہاء حدیث اور ائمہ اور شراح حدیث اس امر پر قریباً متفق ہیں کہ حضرت ابراہیم نے جھوٹ نہیں بولا۔ قرآن و سنت صراحتہ اس پر شاہد ہیں کہ یہ جو کچھ حضرت ابراہیم نے فرمایا تعریفِ تور یہ ہے کہ طور پر فرمایا اور یہ طریقہ گفتگو ادبیات کی جان ہے۔ دینی، سیاسی، کاروباری طبقے سب اس کا کھلے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ حافظ ابن قیم نے جس اختصار اور سنجیدگی سے اس کا تذکرہ فرمایا ہے اہل تحقیق کے لئے اس میں تسکین کا سامان موجود ہے۔ فان قيل كيف سماها ابراهيم كذبا وهي تورية وتعريف صحيح... وقد فتح الله الكريم بالجواب عنه۔ فنقول الكلام له نسبتان نسبة الى المتكلم وقصده وارادته ونسبة الى السامع وافهام المتكلم اياه مضمونه۔ فاذا اخبر المتكلم بخبر مطابق للواقع وقصد افهام المخاطب اياه صدق بالنسبتين فان المتكلم ان قصد الواقع وسـ افهام المخاطب فهو صدق من الجهتين وان قصد خلاف الواقع وقصد مع ذلك افهام المخاطب بخلاف ما قصد بل معنى ثالثا لا هو الواقع ولا هو المراد فهو كذب من الجهتين بالنسبتين معا۔ وان قصد ومعنى مطابقا صحيحا وقصد مع ذلك التعمية على الخلق وافهامه خلاف ما قصده فهو صدق بالنسبة الى قصده كذب بالنسبة الى افهامه ومن هذا الباب التورية والمعارض۔ وبهذا المعلق عليها ابراهيم الخليل صلى الله عليه وسلم اسم الكذب مع انه الصادق في خبره ولم يخبر الا بالحق



فتا مل الخ (مفتاح دار السعادة ص ۳۰ ج ۲)  
 امام کا مطلب یہ ہے کہ سچ اور جھوٹ کی تشخیص میں نفس الامرا اور متکلم کے قصد اور ارادہ کو  
 بھی دخل ہے اس لحاظ سے اس کی تین صورتیں ہوں گی۔ متکلم صحیح اور واقعہ کے مطابق کہے اور  
 مخاطب کو وہی سمجھانا چاہے جو فی الحقیقت ہے۔ یہ دونوں لحاظ واقعہ اور ارادہ سے سچ  
 ہے اور اگر متکلم خلاف واقعہ کہے اور مخاطب کو اپنے مقصد سے آگاہ نہ کرنا چاہے بلکہ ایک  
 تیسری صورت پیدا کر دے جو نہ صحیح ہو نہ ہی متکلم کا مطلب اور مراد ہو، یہ دونوں لحاظ سے  
 جھوٹ ہو گا لیکن اگر متکلم صحیح اور نفس الامر کے مطابق گفتگو کرے لیکن مخاطب کو اندھیرے  
 میں رکھنا چاہے اور اپنے مقصد کو اس پر ظاہر نہ ہونے دے، اسے "تعلیض" اور توریت کہا  
 جاتا ہے۔ یہ متکلم کے لحاظ سے صدق ہے اور تفہیم کے لحاظ سے کذب ہے۔ اسی لئے حضرت  
 ابراہیمؑ نے اسے کذب سے تعبیر کیا۔ درآں حالیکہ حضرت ابراہیمؑ نے جو کچھ فرمایا وہ حقیقت  
 میں صحیح تھا۔ شاعت عامہ سے بچنے کے لئے یہی مناسب طریق تھا۔  
 نامناسب نہ ہوگا، یہاں اگر حافظ ابن قیمؒ کے استاد شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی بھی صدق  
 و کذب خبر سے متعلق نفیس تحقیق پیش کر دی جائے۔

الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح ص ۲۸۸ ج ۲ میں فرماتے ہیں۔  
 والخبر تارة يكون مطابقاً لمخبره كالصدق المعلوم انه صدق  
 وتارة لا يكون مطابقاً لمخبره كالكذب المعلوم انه كذب وقد  
 تكون المطابقة في عناية المتكلم وقد يكون في افهام المخاطب  
 واذا كان اللفظ مطابقاً لماعتاه المتكلم ولم يطابق افهام  
 المخاطب فهذا ايضا قد ليسى كذبا وقد لا ليسى ومنه  
 المعارض لكن يباح للحاجة - لمحضاً

(رو) بعض اہل علم نے دوسری راہ بھی اختیار فرمائی ہے، ان کا خیال ہے کہ کذب  
 ہر حال میں حرام نہیں۔ بسا اوقات ضرورت شائع نے اس کی اجازت دی۔ آنحضرتؐ  
 نے فرمایا: ليس الكاذب الذي يصلح بين الناس (ترمذی) احادیث میں بعض مصالح کا  
 صراحتہ بھی ذکر آیا ہے۔ ابن حزم کا رجحان الفصل میں اسی طرف ہے۔ نئے لوگوں میں سے



حسن احمد الخطیب نے ”فقہ الاسلام“ میں اس مسلک کا ذکر فرمایا ہے :

ومن ذالك اباحتهم الكذب اذا ترتب على الصدق مفسدة عظيمة وقد فصل الحموى في الاشباه الكلام في ذالك فقال ما خلاصته ان الكذب يجوز في ثلاثة مواضع في الاصلاح بين الناس وفي الحرب وعلى الزوجة لاصلاحها الخ، ويراد بذلك استعمال المعارض لا الكذب الصريح ونقل ان الكذب يباح لاهياء حق الخ (صفحہ ۲۳)

کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جب انسان پوری صداقت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اس کے اظہار پر اصرار کرے تو اس کی راہ میں مزید مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں جن میں دیانت کو نقصان پہنچ سکتا ہے، جس کا قائم رکھنا ضروری ہے۔ اپنے ذاتی مقاصد کے لئے تو واقعی اس شخصیت سے استفادہ معصیت ہے لیکن دینی اور ملی ضرورتوں کے لئے یہ گنجائش ناگزیر ہے۔ اذا ابتلى احدكم ببليتين فليختر اهونهما میں بھی یہی اصل کار فرما ہے۔

در، تعریضات کی راہ زندگی کا ایسا لازمہ ہے کہ اس سے بچنا سخت مشکل ہے۔ آپ اپنا یہی مضمون ملاحظہ فرمائیے۔ آپ نے سوال کا جواب دیتے ہوئے معذرت فرمائی ہے کہ ”جماعت اسلامی سنت کی کیوں اب تک کوئی نمایاں خدمت نہیں کر سکی“ جماعت کا کام بہت آگے بڑھ جاتا لیکن جو حضرات اپنے آپ کو حدیث کی خدمت کا ٹھیکے دار سمجھے ہوئے ہیں، ان کو یہ غم کھانے لگا کہ اگر جماعت نے یہ کام سنبھال لیا تو پھر وہ کس چیز کا نام لے کر کچھ لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع رکھ سکیں گے۔

## مولانا کی تعریض :

مولانا! اس سے قطع نظر کہ آپ ایسے متین اور عالم آدمی کے لئے یہ طعن تشنیع کا انداز مناسب ہے یا نہیں، یہ تو جناب کو بھی معلوم ہے اور تم بھی جانتے ہیں کہ اس ملک میں حدیث کی خدمت کا کوئی ٹھیکہ نہیں، جس چیز کو آپ مخاطب سے چھپانا چاہتے ہیں وہ اہم اور نمایاں خدمات ہیں



جو کتاب و سنت کی اشاعت میں جماعت اہل حدیث سے ظاہر ہوئیں، دروس، مکاتیب اور مطابع کے ذریعہ لاکھوں آدمی قرآن اور حدیث کے فیضان سے مستفیض ہوئے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی اس راہ میں لفاظی کے سوا کچھ نہیں کر سکی۔ لیکن آپ سائل کے سامنے یہ ظاہر کرنا پسند نہیں فرماتے بلکہ اسے اندھیرے میں رکھنے کے لئے ”ٹھیکیدار“ کی تعریف اختیار فرمائی ہے، میں تو اسے تعریف ہی کہوں گا۔ لیکن اگر آپ میں جرأت ہے۔ تو حضرت ابراہیمؑ کی طرح اعتراف فرمائیے کہ میں نے جھوٹ بولا ہے۔ تفتن بر طرف تعریضات سے اعراض فرما کر انکار حدیث کے لئے جو دروازے بنانے کی جرأت نہ پیدا کیجئے۔ آپ ایسے اہل علم بزرگوں کو جب آپ کے اتباع یہ جیلے بناتے دکھیں گے تو ان کی جراتیں اور بڑبھ جائیں گی۔

ع زندقہ شکر یانش ہزار مرغ بہ سیخ

ختم نبوت کی تحریک میں آپ حضرات کا موقف عقل عام کی رسائی سے بالاتھا۔ آپ کے بیانات سب اسی نوعیت کے تھے۔ لوگ انھیں جھوٹ دھوکہ کہتے ہیں۔ معلوم ہے کہ عوام کے سامنے اپنی جماعت کو بچانے اور لغزشوں کو چھپانے کے لئے یہ تعریضی بیانات دینے کے لئے آپ مجبور تھے۔ ”عقل عام“ کے تقاضے جب عقل عوام سے ٹکرانے لگیں تو مشکلات سے مخلصی کے لئے تعریضات کی راہ کھلی رہتی چاہیے اور اگر اسے خیالی تصوف اور تصویری زہد و ورع سے روکا گیا تو زندگی میں ایک ایسا خلا نمودار ہو گا جسے پاٹنا ناممکن ہو گا۔

ہجرت کے سفر میں حضرت ابو بکرؓ نے آنحضرتؐ کے متعلق یہ تعریض فرما کر ”رجل یدہدینی السبیل“ دانش مندی کی انتہا کر دی اور زیان اور ادب میں ایک مفید اضافہ فرمایا۔ آپ حضرات بھی عجیب ہیں، ایک طرف تو چاہتے ہیں کہ لوگ کھلے ذہن سے سوچیں لیکن جب سوچنے کا وقت آجاتا ہے تو آپ پر مصنوعی تصوف کا حملہ ہو جاتا ہے۔ اور آپ عقل عام کی گود میں پناہ لیتے ہیں اور دوسروں پر طعن فرماتا شروع کر دیتے ہیں۔

(ح) میرا ذاتی تجربہ معاریض ابراہیمیؑ کے متعلق یہ ہے کہ جب تک بچپن غالب تھا اور عقل نامتھام تھی، کذب کا نام سن کر تشویش ہوتی تھی۔ اساتذہ اور رفقاء سے بحث ہوتی رہی لیکن جب تجربہ کی زندگی میں قدم رکھا، عمل نے تمام شبہات دور کر دیئے۔ تعریض اور توریہ کو عملی دنیا کے ماحول پر محیط پایا۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء نے بوقت ضرورت اسے



استعمال فرمایا، صلحاً رکواس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پس ہماری ”عقل عام“ کو تو اس حدیث سے کوئی کھٹکا محسوس نہیں ہوتا، بلکہ دین کی تکمیل پر مزید یقین ہوتا ہے کہ اس میں اس زاویہ کے لئے بھی رہنمائی کا سامان موجود ہے۔

**حضرت موسیٰ کا تھپڑ** | اس عنوان پر کچھ عرض کرنے سے قبل مولانا اور ان جیسے ”محققین“ کی خدمت میں گزارش ہے کہ یہ مسئلہ بھی کچھ آج نہیں چھڑا، تیسری صدی ہجری میں ”درایت“ کے ہیرو حضرات معتزلہ اس حدیث کو بھی مشکوک بنانے کی کوشش میں مصروف تھے اور حدیث پاک کے محافظ اللہ تعالیٰ نے محدثین کو توفیق دی کہ وہ اس حدیث کا صحیح مطلب بتا کر ان لوگوں کے دانت کھٹے کر دیں چنانچہ اس زمانے کے جن محدثین نے اس حدیث کا جواب دیا، ان میں مشہور محدث حافظ ابوماتم محمد بن حبان (المتوفی ۲۵۶ھ) بھی ہیں۔ آپ نے اپنی صحیح میں یہ عنوان قائم کیا ہے ”ذکر خبر شنع بہ علی منتحلی سنن المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم من حرم التوفیق لا دراک معناه“ یعنی ”اس حدیث کا ذکر جس کو ان لوگوں نے جو اس کے معنی کی حقیقت تک پہنچنے سے محروم ہیں محدثین پر طعن کا ذریعہ بنالیا ہے۔“

پھر حضرت موسیٰؑ کے اس لطمہ والی حدیث کو ذکر کر کے لکھتے ہیں:

”ان الله جل وعلا بعث رسول الله صلى الله عليه وسلم معلماً مخلقه فانزله موضع الابانة عن مراده فبلغ صلى الله عليه وسلم رسالته وبن عن آياته بالفاظ مجملة ومفسرة عقلها عنه اصحابه وبعضهم وهذا الخبر من الاخبار التي يدرك معناه من لم يحرم التوفيق لاصابة الحق، وذاك ان الله جل وعلا ارسل ملك الموت الى موسى رسالة ابتلاء واختبار وامره ان يقول له: اجب ربك۔ امر اختبار وابتلاء لا مريد الله جل وعلا امضاء كما امر خليفه صلى الله عليه وعلى نبينا وعليه، يذبح ابنه امر اختبار وابتلاء دون الامر الذي اراد الله جل وعلا امضاء قلباً عزم على ذبح ابنه وتله للجبين، فداه بالذبح العظيم وقد بعث الله جل وعلا الملائكة الى رسوله في صور لا يعرفونها كدخول



الملكة على ابراهيم ولم يعرفهم حتى اوجس منهم خيفة وكبري  
 جبريل الى رسول الله صلى الله عليه وسلم وسؤاله اياه عن الايمان  
 والاسلام فلم يعرفه المصطفى صلى الله عليه وسلم حتى ولي فكان  
 يحكي ملك الموت الى موسى على غير الصورة التي كان يعرفه موسى عليه  
 السلام عليها وكان موسى غيورا فرأى في دارة رجلا لم يعرفه قتال  
 يده فلطمه، فأتت لطمته على فقي عينه التي في الصورة التي  
 يتصور بها الصورة التي خلقه الله عليها ولما كان المصريح عن نبينا صلى الله  
 عليه وسلم في خبر ابن عباس حيث قال: أمي جبريل عند البيت مرتين فذكر  
 الخبر وقال في آخره هذا وقتك ووقت الانبياء قبلك كان في هذا الخبر البيان الواضح  
 ان بعض شرائعنا قد يتفق بعض شرائع من قبلنا من الامم — ولما كان  
 من شريعتنا ان من فقا عين الداخل دارة بغير اذنه والنظر  
 في بيته بغير امره من غير جناح على فاعله ولا حرج على مرتكبه  
 للاخبار الجمة الواردة فيه كان جائزا لتفاد هذه الشريعة شريعة  
 موسى باسقاط الحرج عن من فقا عين الداخل دارة بغير اذنه  
 فكان استعمال موسى هذا الفعل مباحا له ولا حرج عليه في  
 فعله فلما رجع ملك الموت الى ربه واخبره بما كان من موسى فيه  
 امره ثانيا بامرا خيرا واختبارا ابتلاء كما ذكرنا قبل اذ قال الله  
 له: ان شئت فضع يدي على متن ثور فلن بكل ما عظت يدي لكل  
 شعرة سنة، فلما علم موسى كلام الله صلى الله عليه وسلم على نبينا وعليه  
 انه ملك الموت، وانه جاءه بالرسالة من عند الله، طابت نفسه  
 بالموت ولم يستعمل، وقال فالان فلو كانت المرة الاولى عرفه موسى  
 انه ملك الموت لاستعمل ما استعمل في المرة الاخرى عندتيقنه  
 وعلمه به.

عند قول من زعم ان اصحاب الحديث حمالة المحطب ورعاة الليل!



يجمعون ما لا يستفعون به ويروون ما لا يوجرون عليه ! وليقولون بما  
يطلبه الاسلام ! اجمل آمنه بمعاني الاخبار وترك التفقه في الاثار  
معتمدا في ذلك رايه المنكوس وقياسه المعكوس !!

(تعلیق السنن للإمام احمد ص ۶۶ - ۶۷ - ج ۱۴ - طبع مصر)

یعنی اللہ عزوجل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مخلوق کی تعلیم اور اسے اپنے ارادہ سے آگاہ  
کرنے کے لئے مبعوث فرمایا۔ چنانچہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا اور اس کی آیات  
کی کبھی بالاختصار اور کبھی بالتفصیل ایسی وضاحت فرمائی جسے تمام یا بعض صاحب فہم  
و ذکاوت صحابہؓ نے سمجھ لیا۔ یہ حدیث بھی منجملہ ان احادیث کے ہے جن کا معنی ہر وہ شخص سمجھ  
سکتا ہے جو معرفت حق کی توفیق سے محروم نہیں ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی  
علیہ السلام کے پاس بطور آزمائش ملک الموت کو یہ کہہ کر بھیجا کہ موسیٰؑ سے کہو ”موت کے  
لئے تیار ہو جائے۔“ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نافذ کرنے کے لئے نہیں بلکہ محض آزمائش اور امتحان  
کے لئے تھا۔ ایسا ہی ایک آزمائشی حکم اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے حضرت ابراہیم خلیلؑ کو  
بھی دیا تھا کہ وہ اپنے جان سے زیادہ عزیز بیٹے کو ذبح کر دیں۔ وہ حکم بھی نافذ کرنے کے  
لئے نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے مسہ کے  
بل زمین پر گرایا تو خداوند کریم نے ان کی بجائے ایک دنبہ بھیج دیا۔ علاوہ ازیں بعض اوقات  
اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو انبیاء علیہم السلام کے پاس ایسی صورت میں بھیجا جسے وہ نہیں  
پہچانتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس فرشتے مہمان انسانوں کی شکل میں آئے  
اور ان کے کھانا نہ کھانے سے حضرت خلیل الرحمنؑ خوف زدہ بھی ہوئے۔ اسی طرح  
ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جبریل علیہ السلام مسافر آدمی کی  
صورت میں حاضر ہوئے اور آپ سے ایمان، اسلام اور احسان کے متعلق سوالات  
کئے۔ آپ نے چلے جانے کے بعد انھیں پہچانا۔ اسی طرح ملک الموت موسیٰ علیہ السلام  
کے پاس غیر معروف شکل میں آئے۔ موسیٰ علیہ السلام ایک اجنبی آدمی کو یوں بلا اجازت  
اندرا آتے دیکھ کر برداشت نہ کر سکے اور غیرت طبعی سے متاثر ہو کر اس کے منبر پر  
طمانچہ دے مارا جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی جو اس کی حقیقی آنکھ نہ تھی بلکہ ظاہری



صورت کی عارضی آنکھ تھی۔ امامت جبریلؑ کی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمائی ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد جبریلؑ نے کہا:

”هَذَا وَقْتُكَ وَوَقْتُكَ الْاَنْبِيَاءُ قَبْلَكَ“ ”آپ کے علاوہ آپ سے پیشتر و انبیاء کی نماز کے اوقات بھی یہی تھے“

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ اس شریعت کے بعض احکام پہلی شریعتوں کے احکام سے موافق ہیں جیسے ہماری شریعت میں بلا اجازت گھر میں داخل ہونے یا بلا اذن مکان میں جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑنے پر کوئی گناہ اور مواخذہ نہیں، بہت ممکن ہے موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی بلا اجازت گھر میں داخل ہونے والے کی آنکھ پھوڑنا جائز ہو اور اس بارہ میں صاحب مکان پر کوئی گناہ اور ملامت نہ ہو اور موسیٰ علیہ السلام نے اس شرعی حکم کی تعمیل میں یہ فعل کیا ہو۔ پھر جب فرشتے نے ان کے اس سلوک کی التماس کے پاس جا کر شکایت کی تو دربار الہی سے اسے ایک دوسرا آزمائشی حکم دے کر بھیجا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام سے کہو ”اگر آپ مرنا نہیں چاہتے تو بیل کی بیٹھ پر ہاتھ رکھیے، جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں، ہر بال کے عوض آپ کی عمر میں ایک سال کا اضافہ ہو جائے گا۔ اب کلیم اللہ کو معلوم ہوا کہ یہ ملک الموت ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام موت لے کر حاضر ہوا ہے۔ چنانچہ اب آپ برضا و رغبت مرنے کے لئے تیار ہو گئے اور فرمایا۔ میں ابھی واصل بحق ہونا چاہتا ہوں۔“

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ موسیٰ پہلی دفعہ ملک الموت کو نہیں پہچان سکے۔ اگر انھیں معلوم ہو جانا کہ یہ ملک الموت ہے تو یقیناً ان کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو دوسری مرتبہ کیا۔

یہ ہے اس حدیث پاک کا مطلب جسے اپنی الٹی سمجھ اور معکوس قیاس پر اعتماد کرنے کی وجہ سے احادیث اور آثار نبویہؐ (علی صاحبہا الف الف تجتہ) کو سمجھنے کی توفیق سے محروم شخص نہ سمجھ سکا اور الٹا محدثین کرام پر ”رطب و یابس“ جمع کرنے اور رات کی تاریکی میں ٹامک ٹوٹیاں مارنے کا الزام لگا دیا۔

حضرت موسیٰؑ سے متعلق یہ حدیث معتزلہ کی طرح ہمارے مولانا کو بھی ”عقل عام“ کے خلاف



معلوم ہوئی، حالانکہ بقول حافظ ابن حبانؒ وہ ایک ابتلا تھا جسے یوں ہی ختم ہونا تھا۔

ظاہر ہے کہ موت کا وقت کم و بیش نہیں ہوتا اِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِرُونَ ۱۰: ۴۹) ملک الموت آئے اور کھڑکھا کر چلے گئے پھر اللہ کے پاس شکایت کی اور اتنی دیر موسیٰ علیہ السلام زندگی کی بہاریں گزارتے رہے اس حدیث سے یہ مفہوم اخذ کرنا صحیح نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ملک الموت قبل از وقت آزمائش کے لئے انسانی شکل میں آئے تھے اور انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے ایک مطالبہ اس وضع میں رکھا جس کا ان کو حق نہ تھا، اس کی پاداش ملی، یہی قدرت کا منشا تھا۔ انبیاء کی زندگی میں ایسے مراحل آتے ہیں جو عقلِ عام کی رسائی سے بالا ہوتے ہیں جو شخص ان کو عقلِ عام کے پیمانوں سے ناپنا شروع کر دے گا وہ ناکام ہوگا۔ اس کی تسکین اسی صورت میں ملے گی کہ وہ متعلقہ واقعہ کا انکار کرے اور عقل کے لئے تسکین کا بے حقیقت سامان پیدا کرے۔ انبیاء کے معجزات اور مدارِ اعلیٰ کے ساتھ ان کے تعلقات یہ عقلِ عام کا مسئلہ نہیں، یہاں خواص کی عقلیں بھی حیران رہ جاتی ہیں، لہذا اگر طبیعت مطمئن ہو سکے تو شارع کے الفاظ میں ہی اسے قبول فرمائیے ورنہ جو جی میں آئے فیصلہ کیجئے، اسے اگر عقل کی سان پر چڑھایا گیا تو سان ٹوٹے گی یہ واقعات قائم رہیں گے۔

**مؤدبانہ گذارش** مولانا کے ارشادات کا جب یہ مقام سامنے آیا جس میں تین احادیث پر شبہ فرمایا گیا ہے تو مجھے بے حد دکھ ہوا اور مولانا کے ان ارشادات کے متعلق جب کچھ لکھنے کی کوشش کی تو طبیعت رنج اور افسوس کے جذبات سے لبریز ہو گئی اس لئے قلم رکھ دیا، میں نہیں چاہتا تھا کہ مولانا کے احترام کے خلاف نوکِ قلم سے کوئی فقرہ نکل جائے آج مدت کے بعد قلم اٹھایا۔ سنتِ نبویؐ کے متعلق جذبات میں آج بھی دکھ اور قلق موجود ہے افسوس ہے کہ اتنی پوزیشن کے لوگ کس بے پروائی سے سنت کے متعلق جو منہ میں آئے کہہ جاتے ہیں۔ اس وقت اگر کوئی ناخوشگوار لفظ قلم سے نکلا تو صمیمِ قلب سے اس کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔ مقصد طعن و تشنیع نہیں۔ اس دورِ فتن میں سنت اور علومِ نبویہ کے خلاف ایسے الفاظ فی الواقع ناگوار ہیں۔ مولانا پر طنز قطعاً مقصود نہیں۔ سنت کے ساتھ محبت اور قلب کا سنت کو سے ربط ان پر لیسان خیالات کے اظہار کا موجب ہوا۔

گفتگوئے عاشقانِ دربابِ رب      جذبہٴ عشق است نے ترکِ ادب



مولانا کے ارشادات کے بعض حصص اور مودودی صاحب کا ”مسلب اعتدال“ قطعاً اس قابل نہیں کہ ان کی اشاعت کی جائے، ان میں جو کچھ صحیح ہے وہ بھی غلط انداز سے کہا گیا ہے اور مسلب اعتدال میں تو دماغ کے کبار خانہ نے خیالات اس بے اعتدالی سے اُگل دیئے ہیں کہ کوئی منکر حدیث بھی لکھتا تو یہی کچھ لکھتا۔

مولانا نے محدثین کے باہمی مناقشات کو اہل قرآن سے

**ائمہ حدیث کے مناقشات** بھی زیادہ نمایاں فرمایا ہے اور اس انداز سے فرمایا ہے

کہ شاید مولانا ملت کو کوئی عجیب اور نئی چیز عنایت فرما رہے ہیں۔ مولانا غور فرمائیں یہ انسانی مزاج کی ایک کمزوری ہے، فنِ رجال کو چھوڑیئے، کوئی فن اس سے خالی نہیں۔ شعر و سخن، ادب، نحو اور لغت، معانی، بیانِ فقہ اور اصولِ فقہ کس فن میں یہ مناقشات نہیں؟ بقول جناب ائمہ تفسیر میں بھی یہ کمزوری موجود ہے اور آپ کی جماعت اور علماء کے مناقشات بھی اس کی ایک کڑی ہیں تو کیا اس بنا پر آپ اور تمام علماء کے افادات سے دست بردار ہو جانا چاہیئے؟ جب سے علمِ رجال وضع ہوا ہے اس قسم کا ذخیرہ موجود ہے اور اس کے باوجود اس میں حق و باطل کا امتیاز غیر ششہ طور پر کیا جاسکتا ہے اور کیا گیا ہے۔ پھر اس بے ضرورت مواد کو حدیث کے دفاع کے موقع پر ذکر کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی؟ جہاں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ کہنے کا موقع تھا وہاں اپنے شرم سے نظر نیچی فرمائی، جہاں تن کر چلنے کا موقع تھا آپ سر بسجود ہو گئے۔ عبداللہ چکڑالوی، خواجہ احمد دین امرتسری، مستری گوجرانوالہ، محبوب شاہ گوجرانوالہ، سید عمر شاہ گجرات، شیخ عطاء اللہ ویل، مفتی محمد دین ویل گجرات، ملتان کے منکرین حدیث، ڈیرہ غازی خاں کے اہل قرآن اور ادارہ طلوع اسلام کے ارباب قیادت، اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے محدثین کے نظریات میں بعد المشرقین اور ان کا باہمی برسوں کا جوت پیرا کسے معلوم نہیں لیکن کبھی انھوں نے آپ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا؟ نماز، زکوٰۃ، حج کے متعلق جو پرانگندہ خیالی اور اس کے متعلق جو بد عمل اساطین الحاد و فسق میں موجود ہے اس کا کبھی انھوں نے اعتراف کیا؟ پھر مولانا مودودی کو کیا مصیبت ہے کہ امام ابن اسحاق اور امام مالک کی شکر رنجی کا بلا ضرورت تذکرہ چھیڑ دیں۔ علماء عراق اور امام مالک کے بعض مخالفانہ آراء و افکار کا اشتہار دیں، امام ابو حنیفہؒ اور اعمش کی چشمک کا نوہ فرمائیں۔ اس سے اصل فن اور اس کی خوبیوں پر آخر کیا اثر پڑتا ہے اور ان مقدسین میں جن کی



تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، اگر سوچاں میں کسی وقت بشرطِ صحتِ سند کوئی شکر رنجی یا مناقشہ ہوا بھی ہو تو پورے فن پر اس کا کہاں تک اثر پڑ سکتا ہے؟ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اول تو آپ حضرات سنت کے دفاع کی ذمہ داری لیتے ہی کیوں ہیں، آپ کے ہاں مولوی عبد الغفار حسن صاحب ایسے دو ایک حضرات اور بھی موجود ہیں جو غالباً آپ کی جماعت کے مزاج اور اس کے نظم کے احترام کی وجہ سے خاموش ہو جاتے ہیں، انھیں اجازت مرحمت فرمائیے، وہ اس موضوع پر لکھیں اور اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق لکھیں۔ جماعت کے اجتماعی مزاج سے انھیں مستثنیٰ فرمایا جائے۔ میرا خیال ہے وہ یہ فریضہ بہتر طور پر ادا کر سکتے ہیں۔ یہ فرض کفایہ اچھا ہے اُن پر ڈال دیا جائے۔

## احاد کے متعلق اختلاف اور خرابی کا پہلا دور

یوں تو زمانہ نبوت ہی میں ایسا عنصر موجود تھا جو آنحضرتؐ کی تفصیلی ہدایات، تربیت اور آپ کے احتساب سے گھبراتا تھا، کبھی غنائم کی تقسیم کے سلسلہ میں ذہن نمایاں ہوتا، ان ہذا قسمة لم یرد بہ وجہ اللہ داحد، کبھی آنحضرتؐ کی طرف غلوں کی نسبت کرتے، مختلف طور پر وہ آنحضرتؐ سے تنفر پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ رَأَيْتُ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا۔ منافق آپ کی خدمت میں آنے سے گھبراتے اور بدکتے ہیں لیکن دانش مندار مسلک بھی ہوئی طبائع کی موجودگی میں اس ذہن کو ابھرنے کی توفیق نہ مل سکی۔ حضرت علیؑ کی خلافت میں ان لوگوں کو کچھ کھل کر کہنے اور اجتماعی طور پر شرارت کرنے کا موقع ملا، اس کی تفصیل احادیث اور ادب کی کتابوں میں ملتی ہے۔

## اس ذہن کی تنظیم

لیکن دوسری صدی میں معتزلہ کی وجہ سے اس ذہن نے ایک باقاعدہ انکار نہ کر سکے۔ فضائل اہل بیت کا انکار خوارج نے کیا اور احادیث صفات کا انکار حضرات معتزلہ نے کیا اور احادیث مناقب کا انکار شیعہ نے کیا۔ اس کے علاوہ یہ حضرات احادیث کا پورا پورا احترام کرتے تھے۔ معتزلہ فروع میں شیعہ ہیں، بعض حنفی اور شافعی۔ وہ اپنے اپنے اماموں کی طرح فروع میں احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔ اسی طرح خوارج میں آج بھی حدیث پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ ”الجامع الصغیر“ کے نام سے حکومتِ مسقط کی طرف سے حدیث کی ایک کتاب خوارج میں موجود ہے جسے وہ بڑی عقیدت سے پڑھتے ہیں۔ خوارج کے اس جزوی انکار کا تذکرہ سنت کی کتابوں



میں بھی ملتا ہے۔ اعتزال کی سرپرستی عباسی حکومت نے کی۔ اس فتنہ نے قریباً دوسری صدی میں سر اٹھایا۔ اس لئے انکارِ حدیث کے متعلق یہ چور دروازہ قریباً دوسری صدی میں کھلا، ان کا زیادہ زور ان احادیث پر تھا جو صفاتِ باری تعالیٰ کے متعلق ان کے مزعومات کے خلاف تھیں اور حدیث کے متعلق ان کے ذوق کی ”سلامتی“ کا یہ حال ہے کہ وہ متواتر احادیث کو بھی آحاد کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ نصوصِ قرآنیہ کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ بھی اسے سُن پائیں تو اُنھیں حیرت ہوے

ولے تاویلِ شاں در حیرتِ انداخت

خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

یہ لوگ قرونِ خیر میں تو موجود  
آحاد پر اشتباہ دوسری صدی کے شروع میں نہ تھے، ان کی نشاندہی وہی

لوگ کر سکتے ہیں جن کو ان سے سابقہ پڑا۔ ابنِ حزم فرماتے ہیں :

”وایضاً فان جميع اهل الاسلام كانوا على قبول خبر الواحد الثقة

عن النبي صلى الله عليه وسلم بجري على ذلك كل فرقة في

علمها كاهل السنة والخارج والشيعة والقدرية حتى

حدث متكلموا المعتزلة بعد المائة من التاريخ فخالفوا الاجماع

في ذلك ۱۶۔ (الاحکام ص ۱۱) ”تمام مسلمان اگر راوی ثقہ ہو تو خبرِ واحد کو قبول کرتے

تھے، اہلِ سنت، خارجی، شیعہ، قدریہ کا یہی خیال تھا۔ ہاں پہلی صدی کے بعد

معتزلہ متکلمین کی جماعت پیدا ہوئی اور انھوں نے اس اجماعِ اُمت کی مخالفت کی“

امام احمدؒ اور اسحاق بن راہویہؒ خبرِ واحد صحیح سے جو کچھ ثابت ہو اس سے انکار کو کفر سمجھتے تھے

ابنِ قیمؒ ایک مقام پر ان لوگوں پر اس طرح سے تعجب فرماتے ہیں : ”یہ لوگ آنحضرتؐ کی احادیث

کو اس لئے نہیں مانتے کہ وہ آحاد ہیں، ان سے علم حاصل نہیں ہوتا، اور ذہنی خیالات اور باطل

شبہات کو قبول کر لیتے ہیں جو معتزلہ، جہمیہ اور فلاسفہ سے منقول ہیں اور ان کا نام براہینِ عقلیہ

رکھ لیتے ہیں“ (صواعق، ج ۲، ص ۳۷)

ابنِ قیمؒ نے صواعقِ مرسلہ کی دوسری جلد کے قریباً ایک سو سے زائد صفحات معتزلہ

کے اسی نظریہ کے خلاف لکھے ہیں جو انھوں نے خبرِ واحد کے متعلق ظاہر کیا اور اسی نظریہ کے



ہمارے پریکٹروں سنن صحیحہ کا انکار کیا حتیٰ کی جستجو کرنے والوں کو اس طرف توجہ کرنی چاہیئے حدیث کے متعلق تحقیقی مطالعہ کے لئے موافقات کا باب السنۃ، احکام ابن حزم کا باب السنۃ اور مواصلہ مسئلہ کا یہ مقام ضرور دیکھنا چاہیئے۔

**دوسرا دور** معتزلہ کے اس حملہ سے صرف اہل حدیث اور حنابلہ محفوظ تھے۔ احناف، مالک، شوافع اور شیعہ میں سے بعض اہل علم اعتزال سے متاثر ہو گئے تھے۔ وہ فروغ میں احادیث کو مانتے، احاد کی ظنیت پر یقین کرتے تھے۔ احناف میں سے بشر میسی (متوفی ۲۸۴ھ) تو کھلے معتزلہ ہیں۔ قاضی عیسیٰ بن ابان (متوفی ۳۲۸ھ) امام محمد کے شاگرد ہیں۔ مولانا عبدالحی نے نوادر البہیہ میں ان کا مختصر ترجمہ لکھا ہے، ابن ندیم نے فہرست میں لکھا ہے کہ ان کا تعلق سپاہی خاندان سے تھا۔ پھر علمی شغل اختیار فرمایا خطیب نے صراحت کی ہے کہ وہ خلق قرآن کے قائل تھے۔

۱۔ قاضی عیسیٰ بن ابان کا مسلک متقدمین ائمہ احناف میں مقبول نہ تھا جیسے اصول بروہی اور اس کی شرح سے ظاہر ہے۔ متاخرین احناف بھی اسے اپنا نظریہ سمجھ کر اس سے استفادہ کرتے رہے اور مطرۃ وغیرہ کی روایات کو رد کرتے رہے۔ آج کل بعض نوآموز اور کم سواد حضرات اس غلط اور منحوس نظریہ کو حضرت امام سیدنا ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس نظریہ کی کچھ آبرورہ جائے۔ یہ روایت ابو مطیع بلخی سے مروی ہے۔ روایت بالکل من گھڑت اور وضعی ہے۔ اس کی نسبت حضرت امام کی طرف بالکل جھوٹ ہے۔ ابو مطیع بلخی ائمہ نقد کے نزدیک ناقابل اعتماد ہیں۔ ذہبی فرماتے ہیں وہ آثار کے ضبط میں ڈاہی ہیں، ابن معین نے فرمایا وہ راشی ہیں، نسائی نے انھیں ضعیف کہا، امام احمد نے فرمایا ان سے روایت درست نہیں۔ ابوداؤد نے کہا یہ متروک الروایۃ اور جہی ہیں۔ ابن عدی نے کہا ان کا ضعف ظاہر ہے۔ ابن جبان نے فرمایا یہ مرجہ کا سردار ہے، اسے سنت سے بغض ہے اور اس میں غلط بیانی کرتے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۹۵ھ میں ہوا۔ (میزان الاعتدال، ایضاً تاریخ خطیب ص ۲۲۶) یہ نسبت قطعاً غلط وضعی اور مخلق ہے۔ آج کل کے بعض توخیر طلبہ العلم نے اسے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس اثر کے متعلق باقی مباحث کسی دوسرے وقت مذکور ہوں گے۔ میر دست اس قدر اظہار مقصد ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ کی طرف اس جہی نظریہ کی نسبت غلط ہے۔



مصنف کتاب التحقیق شرح حسامی نے ان کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے ”قال عیسیٰ بن ابان وعبد الجبار من المعتزلة رخصا ان قرآن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی عیسیٰ بن ابان کا رجحان بھی اعتزال کی طرف تھا۔ ان کی وجہ سے فروع میں بھی اخبارِ آحاد کو اشتباہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ چنانچہ عادل و ضابط راوی اگر فقیہ نہ ہو تو اس کی روایت مقبول نہیں ہوگی۔ بلکہ قیاس کو اس کی روایت پر ترجیح دی جائے گی۔ واما روایۃ من لم یعرف بالفقہة ولكنه معروف بالعدالة والضبط مثل ابی ہریرۃ والنس بن مالک فان وافق القیاس عمل به وان خالف لم یترک الا بالضرورة اصول بزودی ص ۱۶۹، احکام آمدی، ص ۱۶۹) ”عادل اور ضابط راوی اگر فقیہ نہ ہو جیسے ابو ہریرہؓ اور انس بن مالکؓ تو ان کی روایت اگر قیاس کے موافق ہو تو قبول کی جائے ورنہ اسے ضرورۃً ترک کر دیا جائے گا۔“

قاضی عبدالعزیز بن احمد شارح اصول بزودی فرماتے ہیں: ”حدیث کو قیاس پر مقدم کرنے کے لئے ہم نے جو فقہ راوی کی شرط لگائی، یہ صرف عیسیٰ بن ابان کا مذہب ہے اور قاضی البزید دہلوی نے اسے پسند کیا اور مصراۃ اور غرایا کی حدیث کو اسی اصول پر تخریج کیا ہے اور بہت سے متاخرین نے اسے اپنا لیا۔ امام ابوالحسن کرخي اور باقی قدامہ احناف اس کے خلاف ہیں وہ فرماتے ہیں، عادل اور ضابط راوی کی حدیث بہر حال قیاس پر مقدم ہوگی اور اکثر علماء کا یہی خیال ہے۔ خود حضرت امام ابو حنیفہؒ ضعیف حدیث کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں کشف الاسرار ص ۱۲ ج ۲ یہ قاعدہ اصول فقہ کی قریباً تمام کتابوں میں مرقوم ہے اور قدامہ احناف نے بھی اسے پسند نہیں فرمایا کہ ضعیف حدیث پر قیاس کو ترجیح دی جائے۔ ویسے بھی یہ قول غلط ہے، قاضی عیسیٰ بن ابان ایسے بزرگ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انسؓ جیسے بزرگوں کو جو برسوں آنحضرتؐ کی خدمت میں رہے، جن کی مادری زبان عربی ہے، غیر فقیہ کہہ دیں تو بڑی عجیب بات ہے۔ حالانکہ وہ خود نہ عرب ہیں نہ علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر حضرت ابو ہریرہؓ کا تفقہ معلوم ہے اکابر صحابہ مسائل میں ان کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ گورنر تک کے عہدوں پر فائز رہے خود آئمۃ احناف نے ان کی احادیث کو خلاف قیاس قبول فرمایا۔ کشف الاسرار، کتاب التحقیق وغیرہ مبسوطات میں اس کی تفصیل مل سکتی ہے۔ اس کے باوجود متاخرین احناف میں انکار کے لئے جزوی طور پر یہ چور دروازہ کھولا گیا۔ آحاد کو ترک کرنے کے لئے ایک راہ پیدا ہوئی۔ لیکن اس



میں اس قدر احتیاط رکھی گئی کہ وہی احادیث متروک ہوں گی جن کے راوی فقہ نہ ہوں گے دیہاں فقہ سے مراد یہ ہے کہ وہ راوی عربی زبان کو اچھی طرح جانتا ہو تاکہ روایت بالمعنی میں غلطی نہ کرے فقہ روایت کی روایات رائے کے موافق ہوں یا مخالف، قاضی عیسیٰ بن ابان اور ان کے اتباع اسے قبول کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ رائے کا دروازہ بند نہیں ہونا چاہیے، کہیں نہ کہیں اس کے لئے گنجائش نکلتی چاہیے۔ اس احتیاط کے باوجود ان کا یہ مذہب قدما بر احناف میں قبولیت نہ کر سکا امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور حضرت امام کے مشہور تلامذہ کو قاضی عیسیٰ بن ابان سے ان کی اس احتیاط کے باوجود اختلاف ہے صحیح راہ وہی ہے جسے جمہور ائمہ سنت نے اختیار فرمایا۔ قاضی عیسیٰ بن ابان کے مسلک میں سے اعتزال کی بڑھتی ہے، اور ائمہ حدیث کا نقطہ نظر تو قدما اور اکابر احناف سے بھی مختلف ہے۔

**تیسرا دور** متاخرین احناف میں قاضی عیسیٰ بن ابان کے مسلک پر عمل ہونے لگا۔ فقہ اور اصول فقہ میں اسی کی بنیاد پر فروع اور اصول تخریج کئے گئے بعض جگہ صریح احادیث کی بھی بعید از کار تاویلات کی گئیں۔ عینی شرح کنز میں نکاح حلالہ کے فائدہ تحلیل کا ذکر فرما کر حدیث لعن اللہ المحلل والمحلل لہ کی تاویل اس طرح فرمائی گئی لعلہ اراد باللعنة الرحمة، یعنی بر حاشیہ کنز کشوری، یعنی حدیث میں لعنت سے شاید رحمہ مراد ہو غرض متاخرین کی تصانیف میں اعتزال کو کافی دخل ہو گیا۔ اصول فقہ میں سب سے پہلی تصنیف امام شافعیؒ نے کی۔ اول من صنف فیہ الاہام الشافعی رکشف الظنون ص ۹۰ ج ۱ اس کے بعد جب اصول فقہ فن کی صورت میں مدون کیا گیا تو اس میں اہل حدیث اور معتزل نے بہت کچھ لکھا۔ و اکثر التصانیف فی اصول الفقہ لاهل الاعتزال المخالفین لنا فی الاصول ولاہل الحدیث المخالفین لنا فی الفروع رکشف الظنون ص ۱۰۰ ج ۱۔ ابجد العلوم ص ۲۵ ج ۲) ”اصول فقہ میں معتزلہ نے زیادہ کام کیا، وہ اصول اور عقائد میں ہمارے مخالف ہیں، یا پھر اہل حدیث نے تصانیف کیں، وہ فروع میں ہم سے مختلف ہیں۔ معتزلہ کا اثر عقائد میں تو تھا ہی، فقہیات بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ درجۃ اللہ ص ۶ ج ۱) بعضهم یزعم ان بناء المذهب علی هذه المحاورات الجدلية المذكورة فی مبسوط السرخسی والهدایة والتبیین ونحو ذلك ولا ان



اول من اظهرا ذالك فيهم المعتزلة وليس عليه بناء مذهبهم۔ ”بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہدایہ تبیین، مبسوط سرخی میں جو جدلی مباحثات پائے جاتے ہیں، حنفی مذہب کی بناء پر ہے، انھیں معلوم نہیں کہ یہ معتزلہ کی مہربانی ہے۔ حنفی مذہب ان پر مبنی نہیں۔ غرض دوسرے دور میں فروع اس سے متاثر ہوئے اور عقائد کے بعد اعمال پر اس کا اثر پڑا۔

## فقہ راوی:

دوسرے مقام پر شاہ صاحب نے فرمایا ”محققین کی یہ پختہ رائے ہے کہ عدل اور ضبط کے بعد راوی کے لئے فقہ کی شرط یہ صرف عیسیٰ بن ابان کا مذہب ہے اور بہت سے متاخرین بھی اس میں ان کے ساتھ ہیں، امام کرخیؒ اس کے خلاف ہیں اور قدامہ احناف سے بھی یہ مذہب منقول نہیں۔ ان کی رائے ہے کہ حدیث بہر حال مقدم ہے۔“ (حجۃ اللہ ص ۱۱ ج ۱)

غرض رائے اور قیاس کی دھاندلی متاخرین میں ہے۔ یہ قدامہ میں نہ تھی۔ قدامہ کی اس احتیاط کے باوجود آئمہ حدیث نہ متقدمین کی روش پر مطمئن تھے نہ متاخرین کے طریق پر، یہ حضرت دونوں جگہ حدیث اور سنت کے صافی چشموں کو مکدر پاتے تھے۔ شعبیؒ فرماتے ہیں۔ لقد بغض الی ہؤلاء الا راۓون المسجد حتی انہ لا بغض الی من کنا سۃ داری قالوا من ہم قال المحکم وحماد واصحابہ اھ۔ (مختصر بیان العالم ابن عبد البر ص ۱۲ ج ۲۔ القول المفید

للسوکانی)

جو لوگ اُس وقت اس محتاط روش پر مطمئن نہیں وہ آج کل نیچر پرستی پر کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ آج کے اہل حدیث حضرات سب کچھ دیکھتے ہیں اور ان کی سلفیت پر کوئی آپخ نہیں آتی۔

اکل امرء تحسین امراء

ونار توقد باللیل نارا

ہمیں یقیناً معلوم ہے کہ آئمہ اربعہ حدیث کو حجت مانتے ہیں، اسے دین کا ماخذ سمجھتے ہیں اور اسی تعریف سے حجت سمجھتے ہیں جو آئمہ سنت اور عاتقہ المسلمین میں مسلم ہے اور ایک دوسرے کو مسلمان سمجھنے کے باوجود اہل حدیث کو احناف، شوافع، مالک اور حنابلہ کی فقیہات



سے اختلاف ہے، وہ ان سکول ہائے فکر میں حدیث اور سنت کی تقدیس کو اس قدر محترم اور محفوظ نہیں سمجھتے جس قدر اہل حدیث اور سلفی سکول فکر میں اسے محترم اور محفوظ پاتے ہیں۔

انگریز کی آمد کے بعد جب ملک میں تعلیمی نظام تقسیم ہوا، دینی تعلیم عصری تعلیم سے الگ ہو گئی۔ سکولوں اور کالجوں کا طریقی فکر مذہبی مدارس سے مختلف ہو گیا۔

عیسائی مبلغ اپنی حکومت کی سرپرستی میں ہندوستان میں چھا گئے۔ علماء اور مذہبی مدارس تو ان سے کیا متاثر ہوتے، انگریزی تعلیم اور اس کی حمایت کرنے والے ان سے بہت حد تک متاثر ہوئے۔ سید احمد خاں مرحوم سے لے کر سکولوں کے طلبہ اور اساتذہ تک اس کے اثر سے بچ سکے ان میں سے بعض حضرات کی اسلام سے وابستگی واقعی خلوص پر مبنی تھی اور ان لوگوں نے عیسائی شبہات کے جواب میں پورے زور سے قلم اٹھایا مگر ذہن چونکہ متاثر تھا، قلم لڑکھڑکیا۔ ”امتیاز المؤمنین“، ”خطبات احمدیہ“، ”تفسیر احمدی“ مصنفہ سید احمد خاں (میں یہ چیز نمایاں ہے۔ جو حدیث مقاصد کے خلاف آئی اُڑادی گئی۔ جہاں کسی آیت کا مفہوم یا کوئی معجزہ نیچر سے منحرف ہوا اس کا حلیہ اس طرح بگاڑا اور تاویل و تحریف میں ایسا تراوٹ پیدا کیا جس پر ملائکہ بھی حیران ہو گئے۔ حکومت کو بھی اس سے فائدہ ہوا، ۱۸۵۷ء کے مظالم سے جن دلوں میں انتقام کی آگ جل رہی تھی انھیں ایک وقتی مشغلہ ہاتھ آگیا۔ اس طریقی فکر کے اثرات ملک میں مختلف انداز میں ظاہر ہوئے۔ ارباب قادیان پر تاویل کا فیضان ہوا۔ مولوی عبداللہ عظیم الدی کو انکار حدیث کا سبق ملا۔ مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی رحمہما اللہ ایسے اساطین علم و فضل بھی تھوڑے بہت اس سے متاثر ہوئے۔ مولانا فراہی کی تفسیر کے جو اجزاء عربی میں شائع ہوئے ہیں ان میں حدیث سے بہت کم استفادہ فرمایا گیا ہے مگر تورات اور انجیل کے رائج الوقت نسخوں سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔

**درایت اور تفقہ** مولانا شبلی رحمہ اللہ نے ”سیرۃ النعمان“ میں محدثین کے طریقی فکر پر کڑی تنقید فرمائی، فقہائے کوفہ رحمہم اللہ کے طریقی فکر کی اس عنوان سے حمایت فرمائی کہ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو شاید اس جدید انداز کی وکالت کو کبھی پسند نہ فرماتے۔ مولانا نے حدیث کا انکار نہیں فرمایا لیکن عقل کو ”درایت“ اور ”تفقہ“ کے نام سے اس قدر اہمیت دی جس سے حدیث اور ائمہ حدیث کے مسلک کو انکار کے قریب قریب نقصان



پہنچا، اور چند ایک اہل علم کے استثناء کے ساتھ تمام ندوہ کے متعلقین میں یہ مرض پایا جاتا ہے۔ اس حلقے میں یہ غلطی عام ہے کہ ائمہ حدیث فقیہ نہ تھے، تنقید حدیث کے لئے جو اصول وضع کئے گئے ہیں ان میں درایت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اصول درایت کے مطابق تنقید فقہانہ نے فرمائی اور اب بھی ہر ایک کو حق ہے کہ اس نقطہ نظر سے حدیث پر تنقید کرے، جسے چاہے رکھ لے اور جسے چاہے ردی کی ٹوکری میں ڈال دے۔ اتالہد پھر درایت کا مفہوم ایسا عام بیان فرمایا جس سے حدیث کا قتل عام ہو سکتا ہے۔ سیرۃ النعمان میں مولانا فرماتے ہیں:

”درایت کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو اس پر غور کیا جائے کہ وہ طبیعت انسانی کے اقتضاء، زمانہ کی خصوصیات، منسوب الیہ کے حالات اور دیگر قرائن عقلی کے ساتھ کیا نسبت رکھتا ہے۔“

وہ اقتضاءئے طبیعت“ وہی نیچر کا ترجمہ ہے۔ سرسید کا بھی یہی خیال تھا کہ نیچر کے خلاف کوئی چیز مقبول نہیں ہو سکتی۔

اس میں درایت کا مفہوم اس قدر آزاد کر دیا گیا ہے کہ اس پر کوئی پابندی نہیں رہی۔ اقتضاء طبیعت کی حد؟ اور اس اقتضاء کا معیار کیا ہے؟ اور عقلی قرائن کی تعیین کون کرے، کیسے کرے؟ زمانہ کی خصوصیات نصوص کی راہ میں حائل ہو سکتی ہوں تو پرویز کے جرم پر بھی نظر ثانی ہو جانی چاہیے۔

عقل کو اس قدر وسیع اختیارات نہ قاضی عیسیٰ بن ابان نے دیئے تھے نہ معتزلہ کو یہ حوصلہ ہوا تھا۔ یہ گنوار کے ہاتھ کسوٹی اور پاگل کے قبضے میں تلوار دے دی گئی ہے، جو ان کے جی میں آئے کریں۔ دین کا خدا حافظ۔

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ درایت کا مفہوم اہل علم کی زبان سے بھی سن لیا جائے تاکہ آج کی درایت اور پرانی درایت میں فرق ظاہر ہو سکے۔ العلم بدرایۃ الحدیث هو علم بأحت عن المعنی المفہوم من الفاظ الحدیث وعن المراد منها مبیناً علی قواعد العربیۃ وضوابط الشرعیۃ ومطابقاً للاحوال النبی صلی اللہ علیہ وسلم (المجد العلوم ص ۴۳ ج ۲)۔ ایضاً مفتاح السعادة ومصباح السیادة، تاشکبری زاہد صاحب ”کشف الظنون“، اصول حدیث



اور درایتِ حدیث کو ایک ہی فن تصور فرماتے ہیں روضۃً ج ۱۱ درایتِ حدیث میں حدیث کے مطلب اور مراد سے عربی قواعد اور شریعت کے ضوابط اور آنحضرتؐ کے حالات کے مطابق بحث کی جاتی ہے۔

اس درایت میں، اور جو درایت آج کل ہمارے بازار میں بیک رہی ہے بڑا فرق ہے۔ مصطلح درایت میں علم ہے اور بصیرت ہے جب کہ ہمارے بازار کی درایت میں ذہنی آوارگی ہے اور پریشان خیالی ہے۔ شریعت میں عموماً اور حدیث میں خصوصاً اس قسم کی بے قاعدگی اور آوارگی کو جگہ نہیں دی جانی چاہیے۔ سرسید احمد خان مرحوم نے اسی درایت کے حوصلہ پر جھٹکے اور حلال کو برابر کر دیا تھا۔ وہ دونوں کو حلال سمجھتے تھے۔

مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی | مولانا اشبلی اور سرسید کے سکول فکری تنازعہ ہے

یہ حضرات بھی تفقہ اور درایت کے غائبانہ عاشق ہیں، مگر یہ ظاہر نہیں فرماتے کہ ان کے ہاں درایت کا کیا مفہوم ہے۔ مولانا اشبلی نے جب درایت کی بحث چھیڑی تو اہل حدیث علمائے ان کا اس طرح تعاقب فرمایا کہ اُس بحث کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہا۔ فقہاء اور محدثین کی خدمات کو پوری طرح واضح فرمایا۔ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادیؒ کی ”حسن البیان“، مولانا ابوبکی شاہجہاں پوریؒ کی الاثر اور مولانا عبدالسلام مبارک پوریؒ کی ”سیرۃ البخاری“ میں یہ موضوع اس طرح چھان پھٹک کر رکھ دیا گیا کہ آئندہ اس پر تفصیلاً لکھنے کی کسی کو جرأت نہ ہو سکی۔

مودودی صاحب نے ”دانشمندی“ سے کام لیا، درایت کو گول مول کر دیا، کچھ نہیں فرمایا کہ درایت سے ان کی کیا مراد ہے اور وہ کون سے اصول ہیں جو فقہاء نے اس کے متعلق وضع فرمائے۔ البتہ محدثین پر تنقید فرماتے ہوئے ارشاد ہے:

”وہ محدثین زیادہ سے زیادہ ہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظن غالب ہے، مزید برآں یہ ظن غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا۔ وہ بلحاظ روایت تھا بلحاظ درایت، ان کا نقطہ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا، فقہان کا اصل موضوع نہ تھا

الخ (مسلب اعتدال ص ۳۱۹)

مولانا اصلاحی مدظلہ تنقیدِ حدیث کے منصب کو اور بھی کھلا رکھنے کی کوشش فرماتے ہیں



”وہ (نقادِ حدیث) اخلاقی اعتبار سے بھی اتنا بلند ہو کر اس نے دین بازی کو اپنا

مشغلہ نہ بنا رکھا، وہ حدیث پر نقد و تبصرہ کا اہل ہو۔ یہ منصب نہ ہر ملائے مکتبی کا ہو سکتا

ہے نہ دفتر کے کلرکوں کا۔“ (ترجمان جلد ۴۵ عدد ۲ ص ۱۴۸)

پھر فرماتے ہیں، مشائخ کی اسانید، رسمی علوم کی تحصیل، مدارس کی تعلیم سبھی یہ اہلیت حاصل نہیں ہوتی کہ حدیث پر تنقید کر سکے بلکہ:

”میرے نزدیک آدمی کے علم و فضل کی بہترین سند اور بہترین شہادت اس کے اپنے

کارنامے اور اس کی دینی خدمات ہیں۔“

اصولاً کارناموں کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن اس معیار کے خطرات کو مولانا نے محسوس نہیں

فرمایا۔ مرزا غلام احمد، عنایت اللہ خاں المشرقی اور پرویز وغیرہ حضرات تنقید کا حق اور حدیث کے

رد و قبول میں حکم کی حیثیت اپنے کارناموں ہی کی بناء پر منوانا چاہتے ہیں۔ آپ رسمی علوم اور مشائخ کی

اسانید کو نظر انداز فرما کر بعض اعتراضات سے بچ گئے ہیں مگر کارناموں اور خدمات کے عموم سے

ایک دوسری مصیبت کی ذمہ داری آپ نے اپنے سر لے لی ہے۔ یہ آوارہ مزاج حضرات ”کارناموں

اور خدمات“ کو اس طرح پھیلائیں گے کہ عوام کو ان کی گرفت سے بچانا مشکل ہو گا۔ مودودی صاحب کو

بچا کر سارے فن کو مصیبت میں ڈالنا مناسب نہ ہو گا۔ حَفِظْتَ شَيْئًا وَغَابَتْ عَنْكَ أَشْيَاءُ۔

معیار اگر ”کارنامے اور خدمات“ ٹھہرا تو ان کی نوعیت ہر پانچ دس سال بعد ہمیشہ بدلتی رہتی ہے

خدمات اور کارنامے اگر حدیث پر تنقید کا معیار قرار دیئے

خدمات اور کارنامے جائیں تو ان کے لئے کوئی پابندی ہونی چاہیئے۔ ہمارے آخری

دور میں نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ، مولانا عبدالحی لکھنوی، مرزا غلام احمد، مولوی احمد رضا

خاں صاحب تصنیف و تالیف کے لحاظ سے مشہور ہیں، کیا ان سب کو حدیث پر تنقید کا حق دیا

جائے گا؟ درس و تدریس کے مشاغل میں سید احمد خاں مرحوم، مولانا سید زبیر حسین صاحب رحمہ اللہ

اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ کے کارنامے اور خدمات دنیا کو معلوم ہیں لیکن

تنقید کا حق کونسی خدمات اور کارناموں کے بعد دیا جائے گا؟

”درایت“ اور ”کارناموں“ کو اگر کھلا اور آزاد کر دیا گیا تو یہ انکارِ حدیث کا پیش خیمہ ہو گا۔



مولانا مودودی اور آپ کی روشنی سے حدیث پر نقد میں ایسی فوضویت اور آوارگی کا راستہ کھول دے گی جس کی مضرت انکار حدیث سے کم نہیں ہوگی۔ اس آوارگی کا اندازہ اُن چند پڑھے لکھے حضرات سے نہیں لگانا چاہیئے جو آپ کے آگے پیچھے پھرتے پھرتے رہتے ہیں اور نہ اُن چند اہل حدیث رفقاء سے جو جماعتی پابندیوں کی وجہ سے منقار زیر پر رکھنے پر مجبور ہیں، جماعتی مصالح کی بناء پر وہ اپنا عندیہ کھل کر نہیں کہہ سکتے۔ اس کا اندازہ اُن عوام سے لگانا چاہیئے جو ملک کے اطراف و اکناف میں آپ کا لٹریچر پڑھتے ہیں۔ جب وہ حریم قیادت سے یُسین گئے کہ ائمہ حدیث اصول درایت سے محروم تھے۔ ان کا نقطہ نظر اخباری تھا، فقہی نہ تھا، جب انھیں معلوم ہوگا کہ مشائخ کی اسانید، مدارس کی تعلیم سے تنقید حدیث کی اہلیت پیدا نہیں ہوتی تو وہ اپنے ذہن میں ائمہ اور دینی تعلیم کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ وہ جب آپ کی زبان سے سنت کی محتاط اور سگری ہوئی تعریف سُنیں گے، اخبارِ آحاد کی ظنیت کا وظیفہ سُنیں گے تو اُس ماخذ کے متعلق اُن کے حُسن ظن کو کس قدر ٹھیس پہنچے گی۔ حریم قیادت میں آنے کے بعد آپ کی ذمہ داریاں دو مکتبی ملّا سے کہیں زیادہ ہو گئی ہیں جو فرمانا ہوا سے بہت سوچ کر فرمائیے۔

نہ ہر درایت سے فن حدیث میں مہارت حاصل ہوتی ہے نہ ہر کارنامے اور محدث سے انسان ”رسول کا مزاج شناس“ بن سکتا ہے۔ اس کے لئے وہی لوگ موزوں ہو سکتے ہیں جن کے شب و روز کا مشغلہ حدیث ہے، جن کے عزیز اوقات قال اللہ و قال الرسول میں بسر ہوتے ہیں۔ قیادت پیشہ حضرات نہ ”ہیرا پھپھاتے“ ہیں نہ ”جوت“۔

مولانا مودودی نے ”مسلك اعتدال“ میں اصول **مزاج شناسی اور جوت** حدیث اور ان کے قواعد کو ظنی اور انسانی ساعی کا نتیجہ کہہ کر ان کے مقام کو ہلکا کر کے ”دین کے سسٹم“، ”مزاج شناسی“ اور ”ہیرے کی جوت“ پر نقد حدیث کا انحصار فرمایا اور پھر اسے ذوقی کہہ کر حدیث اور اس کی تنقید کو اس قدر بے اصول کر دیا کہ اس مسکین فن پر ہر نیچلا زبان درازی کر سکے اور مولانا اصلاحی تے کارناموں اور خدمات کو معیار قرار دے کر اسے اور بھی کھلا کر دیا۔ یہ کشادگی نہ قاضی عیسیٰ بن ابان کے مسلک میں تھی نہ متاخرین فقہاء میں، اس کی ”جوت“، کچھ تو معتزلہ سے ملتی ہے اور کچھ سربید کی نیچر پرستی



سے۔ پچارے اہل حدیث جو متاخرین فقہار اور قاضی عیسیٰ بن ابان سے شاکی تھے۔ وہ آپ کے اس تنقیدی جوہر و سخا پر کیسے مطمئن ہوتے۔ آپ حضرات کی یہ ساری کوششیں اس لئے تھیں کہ آپ ظن سے محفوظ رہ سکیں لیکن جہاں آپ اس وقت تشریف فرما ہیں وہاں ظن ہی ظن ہے۔ درایتِ ظنی، قیاسِ ظنی، علتِ ظنی، اس کا طرد و عکسِ ظنی، مزاج شناسی ظنِ محض اور سہرے کی جوتِ ظنی، محدثین کا با اصول فنِ آپ کی نظر میں اس لئے نہ چج سکا کہ یہ انسانی کوشش ہے جو اپنی فطری حدود سے آگے نہیں جاسکتی، لیکن ”درایت“ اور ”دین کا سسٹم“ اور شریعت کا مزج“ قیاس اور اس کی علل، یہ بھی تو انسانی مساعی کے نتائج ہوں گے۔ باقاعدہ ظن سے بھاگ کر آپ ذوقی اور بے قاعدہ ظن کے زیر سایہ آگئے اور مسلکِ اعتدال کی تلاش میں بے اعتدالی کا شکار ہو گئے۔ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ۔

### احادیث میں یقین اور ظن

ائمہ حدیث کی نظر میں قرآنِ عزیز اور متواتر احادیث سے یقین حاصل ہوتا ہے اور متواتر احادیث کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، تو اترِ لفظی، تو اترِ معنوی، تو اترِ عملی کی تعداد سنت کے دفاتر میں کثرت سے موجود ہے لیکن دین کے تمام شعبوں میں تو اتر نہیں پایا جاتا بلکہ اس کے لئے احادیث کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ احادیث سے جو علم حاصل ہوتا ہے اسے بعض اہل علم نے ظن سے تعبیر کیا۔ گویا تو اتر سے دوسرے مرتبہ پر جو علم حاصل ہوتا ہے اسے اصطلاحاً ظن کہا جاتا ہے۔ ظن زندگی کے تمام شعبوں میں پایا جاتا ہے۔ دینی اعمال کا فائدہ ظنی ہے۔ دنیا کے کاروبار اور ان کے نتائج ظنی ہیں، لغتِ ظنی ہے الفاظ کی دلالتِ ظنی۔ ہے کعبہ کی سمت کا فیصلہ بعض اوقات ظن سے کیا جاتا ہے، جس ظن پر پوری زندگی کا انحصار ہے اسے نہ شرع نظر انداز کر سکتی ہے نہ عرف اور رواج۔ قرآن مجید نے اس ظن کو مستند سمجھا اور اس پر احکام مرتب کئے۔ حضرت موسیٰ نے ایک ظنی اطلاع پر مصر سے ہجرت کی، ایک لڑکی کی اطلاع پر مصر میں اسی جگہ پہنچے جہاں مدت تک قیام فرمایا، واپسی پر طور کا نظارہ ایک ظن کی بناء پر دیکھا اور نبوت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے محض امید کی بناء پر فلسطین میں قیام فرمایا اور ایسے ہی گمان کے پیش نظر حضرت اسمعیلؑ کو مع حضرت ہاجرہ حجاز کے ویرانہ میں اقامت کا حکم دیا۔ حضرت یوسفؑ کو خواب کی تعبیر کے صلہ میں جیل سے رہائی ملی اور اس کے ظنی عواقب کے پیش نظر حکومت سے سرفراز ہوئے۔ کنعان سے حضرت یعقوبؑ



نے خبر واحد کی بناء پر مصر کے سفر کی تیاری فرمائی۔ حضرت موسیٰؑ نے تمہیں کی زندگی اس گمان پر اختیار فرمائی کہ بنی اسرائیل کو کسی وقت آرام ملے گا۔ غرض قرآن حکیم نے اخباراً آمداً و ظنی اطلاعات کو اس اسناد کے ساتھ بیان فرمایا گویا اس میں وثوق اور یقین پایا جاتا ہے۔ عز بن عبد السلام نے فقہ اہل الکبریٰ کے شروع میں وضاحت سے لکھا ہے کہ دنیا اور آخرت کے معاملات کا بہت حد تک ظن پر انحصار ہے، اس لئے اُمت نے ظن کی اصطلاح استعمال فرمانے کے باوجود آحاد اور ظنیات کو دین میں اسی قدر اہمیت دی ہے جس طرح ایک مستند چیز کو اہمیت دیجانی چاہیے۔ ظن کے اس اصطلاحی مطلب کو سمجھ لینے کے بعد یہ خیال کرنا کہ شریعت میں ظن کیلئے کوئی گنجائش نہیں، غلط ہے اور محض ایک وہم۔ بلکہ منظونات کو ”غیر ثابت شدہ“ کہنا یا سمجھنا بھی غلط ہے البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ظنیات کا مقام تو اتر کے بعد ہے یا ظنون مصطلحہ تو اتر سے متعارض نہیں ہو سکتے۔

**فن حدیث اور عقل** یہ بھی صحیح نہیں کہ احادیث کی تنقید میں درایت کو اہمیت نہیں دی گئی، یا محدثین کا نقطہ نظر اخباری تھا، فقہی نہ تھا بلکہ جہاں تک عقل اور درایت کا مقام ہے اس کا پورا پورا احترام فرمایا گیا ہے۔ اہل حدیث اور فقہاء کے طریق فکر میں اختلاف کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ ائمہ حدیث تفقہ سے بے خبر تھے، اختلاف تو خود فقہائے عراق میں بھی موجود ہے۔ علامہ دیوسی کی ”تاسیس النظر“ سے ظاہر ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ میں اصولی اختلاف موجود ہیں۔ یہ سب طریق فکر کا نتیجہ ہے، نہ فقہاء حدیث سے بے بہرہ ہیں نہ ائمہ حدیث فقہ سے بے خبر۔ اختلاف کی وجہ صرف طریق فکر میں اختلاف ہے، اور نہ درایت اور پیرے کی جوت سے یہ جوہری کوئی بھی بے خبر نہ تھا۔ رحمہم اللہ و رحمۃ ابن قیم اپنے شیخ حافظ ابن تیمیہ سے نقل فرماتے ہیں: قال وقد تدبر ما امکنی عن ادلة الشرع فما رأیت قیاساً صحیحاً یخالف حدیثاً صحیحاً کما ان المعقول الصحیح لا یخالف المنقول الصحیح بل مثی رأیت قیاساً یخالف اشرافاً لا بد من ضعف احدھما الخ (اعلام الموقعین ص ۲ ج ۲) ”حسب امکان میں نے شرعی دلائل پر غور کیا ہے، میں نے صحیح قیاس کو صحیح حدیث کے خلاف نہیں پایا، جس طرح عقل صحیح نقل صحیح کے کبھی خلاف نہیں ہوتی۔ جب قیاس کسی اثر کے خلاف ہوتا ہے تو ان



میں سے ایک ضرور ضعیف ہوتا ہے، لیکن قیاس صحیح اور فاسد میں تمیز کرنا آسان نہیں۔  
 اسی قسم کی صراحت امام شافعیؒ اور شاہ ولی اللہ سے بھی منقول ہے جسے طوالت کی وجہ سے  
 نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قیاس اور عقل ایک چیز نہیں ہے، قیاس  
 بھی عقل کے خلاف ہو سکتا ہے، اس لئے اصول فقہ کے قواعد کو عقلی اصول سمجھنا قطعاً غلط ہے۔  
 یہ اصول ایک خاص طریق فکر کی ترجمانی کرتے ہیں جس کی وضاحت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ انصافاً  
 اور عقد الجید وغیرہ میں فرمائی ہے اس لئے اصول فقہ کو اصول عقلیہ سمجھنا کم فہمی ہے اور سادگی۔  
 ابن جوزیؒ فرماتے ہیں: ما احسن قول القائل اذا رأیت الحدیث یباین المعقول او یخالف

المنقول او یناقض الاصول فاعلم انه موضوع اه (تدریب شرح تقریب ص ۱)  
 ابوبکر بن طیب نے فرمایا، ”وضع کی یہ بھی نشانی ہے کہ وہ عقل کے خلاف ہو اور اس کی کوئی توجیہ نہ  
 ہو سکے اور جو حدیث حس اور مشاہدہ کے خلاف ہو وہ بھی موضوع ہوگی، قرآن مجید اور سنت متواترہ  
 کے خلاف ہو، یہ بھی موضوع ہوگی اور جو اجماع کے خلاف ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔“ (تدریب ص ۱۴۶)  
 سخاوی نے بھی ”فتح المغیث“ میں اس کے قریب قریب ارشاد فرمایا ہے۔

مولانا اصلاحی اور مودودی صاحب کے مضامین میں نقد حدیث کے متعلق جن نکات کی طرف  
 توجہ دلائی گئی ہے، محدثین کی نظر اس سے بہت آگے ہے۔ یہ کس مسخرے نے آپ حضرات کو بتایا  
 کہ محدثین نے اصولِ درایت کو نظر انداز کر دیا یا ان کا نقطہ نظر صرف اجاری تھا۔ پورے وثوق سے عرض  
 کروں گا کہ نقد حدیث کے متعلق فقہاء عراق نے عقل کی روشنی میں آج تک کوئی اصل وضع نہیں کی۔  
 یہ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا مودودیؒ کا ایک ایسا خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ یہ ایک ایسا تخیل  
 ہے جس کا نفس الامر سے کوئی تعلق نہیں۔ تنقید حدیث کے متعلق آج تک جو کچھ ہے عقلی ہو یا نقلی،  
 روایت کے نقطہ نظر سے ہو یا درایت کے لحاظ سے، سب ائمہ حدیث کی مساعی کا مرہونِ منت  
 ہے، یہ میرا ہی خیال نہیں بلکہ آج سے چند سال قبل مولانا عبد الجبار عمر پوری، مولانا محمد حسین صاحب  
 بٹالوی، مولانا عبد العزیز رحیم آبادی، مولانا عبد السلام مبارک پوری نے پوری آواز سے اس کا  
 اعلان کیا۔ یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ ان کے اتباع و احقاد یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہیں لیکن  
 خاموشی پر مجبور ہیں۔ ان اللہ و اتانا الیہ راجعون۔

اصول اور قیاس میں ائمہ عراق کی کوششیں قابلِ صد ہزار تحسین ہیں، ان کی موافکات



علمی حلقوں سے داد حاصل کر چکی ہیں، لیکن معلوم ہے کہ وہ عقل کے اصول نہیں بلکہ وہ ایک خاص طریق فکر کی تشریحات ہیں جن کی غیر معقولیت جماعت اسلامی کے حلقوں میں بھی مسلم ہے۔ حال ہی میں مولانا اصلاحی کا ایک پُر مخزن مقالہ زکوٰۃ کی تملیک کے متعلق شائع ہوا جس میں احناف کے مسلک پر کھلی اور کڑی تنقید فرمائی گئی تھی اور مولانا مودودی نے بھی اپنے رسالہ پرودہ میں بعض فقہی مسائل پر بڑی بے لاگ تنقید کی تو یہ خیال ہمارے اور آپ کے حلقوں میں مسلم ہے، اس لئے اس بحث میں آپ حضرات کا وقت ضائع کرنا مناسب نہیں۔

**اصل نزاع** | بحث اس میں نہیں کہ فہم اور تنقید حدیث میں محدثین کے نزدیک عقل اور درایت کو دخل ہے یا نہیں کیونکہ پورے دین کا خطاب عقلمندوں سے ہے بلکہ اس میں ہے کہ آیا ہر ندی عقل کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ کتاب و سنت کو اپنی عقل کی سان پر رکھ کر پرکھنا شروع کر دے اور جو حکم اس معیار پر پورا نہ اتر سکے اس کا انکار کر دیا جائے یا اسے ناخذ کے لئے تعصب سے تعبیر فرما کر حقارت کی نگاہ سے ٹھکرا دیا جائے آیا عقل و درایت کو احادیث اور سنت کے اس قتل عام کی اجازت ہونی چاہیے؟ اور حفاظِ حدیث اور آج کے گنہگار اہل حدیث اس کے مخالف ہیں اور انشاء اللہ رہیں گے، الفاظ کی تعبیر میں تنوع اور اسالیبِ کلام میں ہیرا پھیری سے حقائق نہیں بدل سکتے۔

جدید قیادتوں کے طریق فکر اور اہل حدیث کے طریق فکر میں بین اور کھلا اختلاف ہے، قلم اٹھانے سے پہلے پوری طرح سوچنا چاہیے اور جدید نظریات کے احتساب سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ مسائل چھان بھٹک اور بحث و نظر سے حل ہوتے ہیں، زبان درازی سے نہیں میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلک اہل حدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ حدیث کے بھی خلاف ہیں۔ ان میں آج کے جدید اعتراف و تجہم کے جراثیم مخفی ہیں۔

## آخری گزارش

مولانا نے مسائل کا جواب نمبر وار دیا ہے، میں نے ضروری مباحث کو لے لیا ہے اور اپنے مسلک کی حسب ضرورت وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ نمبر ۶، ۷ کے متعلق بعض چیزیں کہی جاسکتی تھیں، لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ اس میں جماعت اسلامی کی



تعریف میں مبالغہ آمیزی ہے جماعتی پراپیگنڈا اور دعایت ہے، اس کا مولانا کو حق حاصل ہے  
 حضری دعوت اور دعایت کا یہی طریق ہے اور بعض حصص میں مولانا مودودی صاحب سے  
 عشق اور ان کے محاسن کا تذکرہ، اُن کے علم، طریق کار اور جرأت کا اشتہار ہے۔ گو اس میں کتنا  
 ہی مبالغہ اور تماوج ہو مگر کسی نظم کے ساتھ وابستگی کا یہ لازمی نتیجہ ہے، اس کا مولانا کو پورا حق  
 ہے۔ اصل موضوع پر بقدر ضرورت گزارش کرنے کے بعد یہ چیزیں میرے موضوع سے باہر  
 ہیں۔ اللہم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

ان گزارشات کو یہاں ختم کرتے ہوئے طویل سمع خراشی کے لئے معذرت خواہ ہوں انتہائی  
 اختصار کے باوجود گزارشات خاصی طویل ہو گئی ہیں اور مکرر گزارش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ  
 میرے دل میں دونوں برہرگوں کے لئے پورا احترام ہے لیکن میں نے اپنے مسلک کو واضح  
 کرنے کی کوشش کی ہے اگر کوئی لفظ آپ حضرات کی شان کے خلاف ہو تو بصمیم قلب اس  
 کے لئے معافی چاہتا ہوں لیکن اپنے مسلک کو کسی مصلحت پر قربان کرنا میرے لئے مشکل ہے  
 وَأَمَّا حُبُّ لَيْلَى فَلَا أَتُوبُ۔



## عقائد و افکار مودودی

بقول مولانا مودودی صاحب تحریک کے لیڈر کے خیالات  
**عقائد و افکار مولانا مودودی صاحب** | افکار پوری تحریک کی جان ہوتے ہیں اس لئے ہم چاہتے  
 ہیں کہ مولانا موصوف کے عقائد و افکار اور مزید روشنی میں آجائیں۔ تاکہ ناظرین کرام تحریک  
 جماعت اسلامی کے مزاج سے روشناس ہو جائیں۔ کسی انسان کے عقائد و افکار کو معلوم کرنے کا  
 بہترین طریقہ اس کی خود نوشت کتابیں ہی ہوتی ہیں۔ ان ہی سے مصنف کے افکار روشن  
 ہوتے ہیں۔ مولانا صاحب موصوف صاحب تصانیف کثیرہ ہیں اور اس میں بھی شک نہیں  
 کہ بعض موضوعات پر مولانا نے اہم ترین قلمی نوادرات مہیا فرمائے ہیں۔ مگر مثل مشہور ہے کہ  
 سوار ہی ٹھوکر کھایا کرتے ہیں۔ مولانا نے اپنی کتابوں میں اپنے انکارِ بیش فرماتے ہوئے بعض  
 جگہ بڑی خطرناک ٹھوکریں کھائی ہیں، اگر مولانا کو ان کا احساس ہو جاتا تو شاید ان میں اور علماء  
 اسلام میں یہ موجودہ ”علمی جنگ“ برپا نہ ہوتی مگر ہوا یہ کہ مولانا نے جو کچھ لکھ دیا وہ کالوجی من  
 السماء قرار پایا۔ اور یہی خیال بنائے فساد ٹھہرا۔ بہر حال ہم مختصر لفظوں میں مولانا کے کچھ افکارِ رائے  
 جو محلِ نزاع ہیں درج ذیل کر کے انصاف پسند حضرات سے علم و دانش کے نام پر انصاف  
 کی اپیل کرتے ہیں، مشہور قول ہے اور صحیح بھی کہ ”الرجال یعرفون بالحق لا یعرفون  
 بالرجال“ حق کی پڑتال کے لئے شخصیتیں کسوٹی نہیں بلکہ شخصیتوں کی پڑتال کے لئے حق کسوٹی ہے۔  
 بھول خطا انسانی فطرت ہے صرف انبیاء اللہ کی مقدس جماعت ہے جن کی اللہ پاک خود  
 براہِ راست اغلاط سے حفاظت فرماتا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی انسان کتے ہی بڑے روحانی  
 درجے والا ہو اس سے یقیناً غلطی کا امکان ہے جب بزرگانِ دین ائمہ کرام پر تنقید کی جاسکتی  
 ہے تو مولانا مودودی کے غلط افکار پر ان کا یا ان کے اصحاب ارادت کا تنقید سے نہ صرف  
 گھبرانا بلکہ اس کی وجہ سے مغلوب الغضب ہو کر تحریروں و تقاریر میں ”اول فول“ پر اتر آنا



انتہائی کمزوری کی دلیل ہے جس کے ثبوت میں اس تحریک کے لڑکچہ سے کافی مواد پیش کیا جاسکتا ہے۔

مولانا مودودی صاحب اپنے مہینہ کردہ لڑکچہ کی ایہ باتیں اسلام میں عبادت کا تصور | تفہیمات ص ۲۴ میں اسلام میں عبادت کا تصور بیان فرماتے ہوئے ارقام لکھتے ہیں :-

”انسان خواہ وہ خدا کا قائل ہو یا منکر خدا کو سجدہ کرتا ہو یا پتھر کو خدا کی پوجا کرنا ہو یا غیر کی چاہے وہ اپنے اختیار سے کسی اور کی پوجا کر رہا ہو وہ خدا ہی کی عبادت ہے۔“ الی آخر۔

مولانا صاحب یا ان کے کوئی حواری اس عبادت کی خواہ کچھ بھی تاویل کریں اس کو امر مکیوبی کے تحت لے آئیں یا کھینچ بان کر کچھ اور بنانے کی سعی فرمائیں مگر اس عبادت کے مذکورہ بالا الفاظ اس قدر بھونڈے ہیں کہ قرآن مجید کی پیش کردہ توحید اور جملہ انبیائے کرام کے پیش فرمودہ ارشادات کی روشنی میں ان الفاظ کے مطابق عقیدہ و عمل اکبر الکبائر گناہ کی فہرست میں آجاتا ہے اگر مولانا کے اس ”تصور“ کو صحیح مان لیا جائے تو دہریت اور شرک و بت پرستی کو گناہوں سے تعبیر کرنا ایک سراسر حماقت آمیز خیال بن کر رہ جائے گا۔ اسی لئے مولانا کی اس تشریح پر مشہور صحافی و انقلابی بزرگ حافظ علی بہادر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ :-

”اسلام میں عبادت کا تصور“ کے عنوان سے انھوں نے جو مقالہ تفہیمات میں شائع کیا ہے وہ غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ اسلام میں عبادت کا تصور وہ نہیں ہے جو مولانا مودودی نے پیش کیا ہے، انھوں نے عبادت کی ایک خود ساختہ تشریح کر کے بت پرستی تک کو اللہ کی عبادت میں شامل کر لیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ کے نزدیک عبادت ابھی بھی ہوتی ہے اور بُری بھی، اور ان کے نزدیک چوری، زنا کاری، قمار بازی سب عبادت کے تصور میں آجاتے ہیں۔ قرآن مجید کی جو آیات انھوں نے پیش کی ہیں ان میں سے ایک سے بھی عبادت کا یہ تصور ثابت نہیں ہوتا۔“ الی آخر۔

دہلالِ نور - مجریہ ۴ جون ۱۹۵۷ء

مزید افسوسناک چیز یہ ہے کہ مولانا اپنے غلط مضمومات کے سانچے میں قرآن پاک کو دھاتے



کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ ان کی موفقات میں جگہ جگہ یہ رنگ نمایاں ہے۔  
شاید ایسے ہی حضرات کے لئے کہا گیا ہے۔

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

**فرشتوں کے متعلق** | اس حقیقت پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں کہ وجود ملائکہ پر

ایمان و یقین لانا اسلام میں ایمانیات کا ایک رکن اعظم ہے۔  
قرآن پاک و احادیث ذکر ملائکہ سے بھری ہوئی ہیں اور یہ بھی یقینی امر ہے کہ ملائکہ اللہ پاک کی  
نورانی مخلوق ہیں ان کی شان یہ ہے لَا یَعْصُونَ اللہَ مَا أَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُونَ مَا یُؤْمَرُونَ وہ اللہ  
کی نافرمانی نہیں کرتے بلکہ ہر وقت اطاعت الہی میں سرگرم رہتے ہیں اب ملائکہ کے بارے  
میں مولانا مودودی صاحب کا عقیدہ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں :-

”اسلامی اصطلاح میں جنس کو فرشتہ کہتے ہیں وہ تقریباً وہی چیز ہے جس کو ہندوستان  
دیونان وغیرہ ممالک کے مشرکین نے دیوی دیوتا قرار دیا ہے۔“

(تجدید و احیائے دین ص ۱۸)

مولانا نے ”اسلامی فرشتہ“ مشرکین کے مزعومہ دیوی دیوتاؤں کو قرار دیا ہے۔ مولانا کے  
اس خیال باطل کے مطابق فرشتے مذکور و مؤنث ہر دو قسم کے ہیں، کیونکہ وہ دیوی اور دیوتا ہیں۔  
الغرض یہ اسلامی فرشتے کی ایسی تعبیر ہے جو مولانا ہی جیسے مجددِ دین و مزاج شناس رسول و کبر  
کی جوت پتھر میں پالنے والے بزرگ کی قلم سے سرزد ہو سکتی ہے۔ مزید تفصیلات کا یہاں  
موقع نہیں۔ مولانا کے مزعومات باطلہ پر صرف چند اشارے کرنا مقصود ہیں۔  
تاسیہ روئے شود ہر کہ دروغش باشد۔

احادیث واردہ کی بناء پر قرن اول سے آج تک  
**مہدی موعود کے بارے میں** | جملہ اہل اسلام اوصاف مخصوصہ کے ساتھ

ایک مہدی موعود کے وجود پر جو آخر زمانہ میں ظاہر ہونا ہے عقیدہ رکھتے ہوئے چلے آئے ہیں۔  
مولانا مودودی صاحب اس مہدی موعود کا تعارف بایں طور کرتے ہیں۔

”وہ بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا، وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اس کو  
مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی (دالی) مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی جدتوں کے خلاف



مولوی دھونی صاحبان ہی پہلے شورش برپا کریں گے (دالی) شاید اُسے ہی خود بھی  
 مہدی موعود ہونے کی خبر نہ ہوگی اور اس کی موت کے بعد اس کے کارناموں  
 سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی خلافت کو منہاج النبوت پر قائم کرنے والا تھا۔ مہدی  
 دعویٰ کرنے کی چیز نہیں کر کے دکھانے کی چیز ہے (دالی) وہ خالص اسلام کی  
 بنیادوں پر ایک مذہب فکر پیدا کرے گا۔ ذہنیوں کو بدلے گا۔ ایک زبردست  
 تحریک اُٹھائے گا۔ (تجدیدِ دین ص ۲ تا ص ۳)

حضرت مولانا مودودی صاحب نے جس طور پر بھی مہدی موعود کا تعارف کرایا ہے  
 ناظرین کرام کے سامنے ہے یہ بھی خوب کہا کہ مہدی موعود دنیا میں تشریف فرما ہوں گے اور  
 تمام عمر تحریک چلاتے ہوئے انتقال بھی فرما جائیں گے مگر حال یہ ہوگا کہ خود ان کو بھی خبر نہ ہوگی  
 کہ میں ہی مہدی موعود ہوں اور نہ لوگوں کو اطلاع ہو سکے گی، ہاں ان کے انتقال فرما جانے  
 کے بعد لوگ جان لیں گے کہ یہی مہدی موعود تھا وغیرہ وغیرہ اب ایک طرف آپ مہدی موعود  
 کے بارے میں احادیث واردہ کو رکھ لیجئے دوسری طرف مولانا مودودی کے پیش کردہ تعارف  
 کو آپ کو آسمان وزمین جتنا فرق نظر آئے گا۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ مولانا کے یہ جملہ اشارے  
 ”خود مابدولت“ کی طرف ہیں مگر موصوف پر واضح ہونا چاہیے۔

ہر مدعی کے واسطے دار و رس کہاں

مرزا غلام احمد قادیانی کو بھی ایسے ہی خواب نظر آنے لگے تھے کہ بعد میں پھلانگ  
 لگا کر تخت نبوت ہی پر قابض ہونے کا پروپیگنڈہ کرنے لگے مگر ہوا یہ کہ

نہ خدا ہی ملانہ وصالِ صنم

گئے دو جہاں سے خدا کی قسم

مستقبل کا مورخ دیگر مدعیانِ مہدویت کے متعلق بھی کچھ ایسا ہی بیان لکھنے پر مجبور  
 ہوگا۔ متبدیٰ ہذا الایام مانت جاہلا ۛ ویاتیک بالانخبار من لم تذوق

یہ عقیدہ کہ آخر  
 ”دجال“ کے بارے میں احادیث واردہ کی تکذیبِ زمانہ میں قریب

قیامت ایک ”کانا دجال“ پیدا ہوگا جو دجل کی اشاعت میں سرگرم ہتھیاروں سے لیس ہوگا



جہور اُمت کا مسلمہ عقیدہ ہے دجال کی حدیث صحیح بخاری شریف میں آٹھ مرتبہ آئی ہے اور صحیح مسلم شریف میں سترہ مرتبہ آئی ہے۔ نماز کی دُعاؤں میں ایک مُستند مشہور دُعا ہے جو آخر تشہد میں پڑھنی مستون ہے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَالِ۔ گویا شارع علیہ السلام نے ہر نماز میں صبح و جہاں کے فتنے سے بچنے کی دُعا سکھلائی ہے۔ ان جملہ حقائق کے باوجود مولانا مودودی صاحب جیسے ”مزاج شناس رسول“ کی جہارت دیکھتے بڑے دھڑکتے کے ساتھ آپ فرماتے ہیں :-

”یہ کاناد جال وغیرہ افسانے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے، ان چیزوں کو تلاش کرنے کی ہیں کوئی ضرورت بھی نہیں۔ عوام میں اس قسم کی جو باتیں مشہور ہیں، ان کی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے اور ان میں سے کوئی چیز اگر غلط ثابت ہو جائے تو اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ (ترجمان القرآن رمضان و شوال ۱۳۶۲ھ)

افسانہ وہ ہوتا ہے جو غیر معتبر غیر محقق چیز لوگوں کی زبانوں پر گشت کرنے لگ جائے۔ مولانا مودودی صاحب کاناد جال کو افسانہ قرار دیتے ہیں بخاری و مسلم وغیرہ کتب احادیث میں ۲۵ مرتبہ یہ احادیث جو متعلق دجال منقول ہیں سب محض افسانے ہیں۔ اس سے بھی آگے مزید جہارت ملاحظہ ہو جس میں خود رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کی ”اصلاح“ فرمانے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

”حضور کو اپنے زمانے میں یہ اندیشہ تھا کہ شاید دجال آپ کے عہد ہی میں ظاہر ہو جائے یا آپ کے بعد کسی قریبی زمانے میں ظاہر ہو، لیکن کیا ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ نے یہ ثابت نہیں کر دیا کہ حضور کا یہ اندیشہ صحیح نہ تھا اب ان چیزوں کو اس طرح نقل و روایت کئے جانا کہ گویا یہ بھی اسلامی عقائد ہیں نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی ہے اور نہ اسے حدیث ہی کا صحیح مفہوم کہا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اس قسم کے معاملات میں نبی کے قیاس و گمان کا درست نہ نکلنا ہرگز منصب نبوت پر طعن کا موجب نہیں ہے۔“

(ترجمان القرآن ربیع الاول ۱۳۶۵ھ)

”مزاج شناس رسول“ کی یہ جہارت کہ دجال کی آمد کے بارے میں حضور کا یہ اندیشہ صحیح نہ تھا ایسی نہیں ہے کہ اسے یوں ہی نظر انداز کر دیا جائے۔ مولانا ایک مذہبی آدمی ہیں اور آپ کا



دعویٰ ہے کہ جس چیز کو لے کر ہم اُٹھے ہیں وہ عین اسلام اور اصل اسلام ہے (بخاری سنیم ۲۲ جمادی الاول ۱۳ھ) مولانا کی یہ جسارت پتہ دے رہی ہے کہ مذہب اسلام کے بارے میں آپ ایسے مقام پر ہیں جہاں آپ کو خود پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اصلاح کا بھی حق پہنچتا ہے مولانا نے اپنی اس جسارت کو ایک دفعہ نہیں بلکہ متعدد مرتبہ بڑی جرأت و دلیری کے ساتھ حوالہ نقل کیا ہے۔ ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۷ء میں آپ فرماتے ہیں:-

”ان امور کے متعلق مختلف باتیں حضور سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے“

لیجئے مولانا نے ایک ایسا چور دروازہ کھول دیا کہ اب تعلیمات اسلام کے بارے میں ارشادات رسول جو کسی کے مزاج کے خلاف ہوں ان سب کو ”آپ کے قیاسات“ کہہ کر رد کیا جاسکتا ہے۔ قرآن مقدس میں رسول اللہ کی شان یہ بیان کی گئی ہے۔ وما یطق عن الہوی ان ہو الا وحیؕ ہمارے رسول اپنی خواہش اور قیاسات سے نہیں بولتے، ان کا ہر قول وحی الہی پر مبنی ہوتا ہے ”دجال موعودہ“ کے بارے میں آپ کے ارشادات بہت واضح ہیں۔ روایت ان کی صحت کا اقرار خود مولانا مودودی صاحب کو بھی ہے۔ آیت بالا کے تحت حضورؐ نے یہ ساری خبریں وحی الہی کے تحت دی ہیں، مگر مولانا صاحب موصوف جو پتھر میں ہیرے کی جوت ملاحظہ فرمالیا کرتے ہیں ان سب کو آپ کے ”غلط قیاسات“ قرار دے رہے ہیں۔ ناظرین کرام خصوصاً وابستگان تحریک انصاف سے بتلائیں کہ شان رسول کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے کیا عدل کا یہی تقاضا ہے کہ مولانا کے ان ملحدانہ نظریات کو یوں ہی نظر انداز کر دیا جائے اور کیا یہی وہ اصلی اسلام ہے جسے لیکر مولانا اُٹھے ہیں؟ اور کیا الہی حکومت ایسے ہی الحاد پرور خیالات پر تعمیر ہوگی؟ کیا نظام ہائے باطلہ سے ٹکڑے لینے کے یہی ”لچھن“ ہیں۔

آپ ہی اپنے ذرا جو رستم کو دکھیں  
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

حدیث مجدد کی تکذیب | پہلے حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے جناب نبی کریم صلی اللہ

الامۃ علی راس کل مائۃ من یجد دلہا دینہا۔ (رواہ ابو داؤد) یعنی بیشک اللہ عزوجل اس



امت کے لئے ہر صدی کے سرے پر ایک ایسا شخص کھڑا کرے گا جو اس امت کے لئے دین اسلام کی تجدید کرے گا۔ اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں اس حدیث کی شرح میں علمائے اسلام لکھتے ہیں کہ وہ مجددِ سنت کو بدعت سے جدا کرے گا۔ علمِ دین کو پھیلانے کا اہل علم کی مدد کرے گا، اہل بدعت کی کمر ہمت کو توڑے گا وہ علومِ دین کا جامع ہوگا۔ اس حدیثِ رسول کا اولین مصداق الشریاک نے امیر المؤمنین خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو بنایا اور پھر ان کے بعد ہر صدی میں مجددِ دین پیدا ہوتے رہے جیسا کہ علمائے اسلام و مؤرخینِ عظام نے ہر صدی میں نام بنام ان کو مع ان کے حالات اور خدمات کے تحریر فرمایا ہے۔ اس بارے میں مولانا مودودی صاحب کی گل افشانی ملاحظہ ہو ارشاد ہوتا ہے:-

”تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجددِ کامل نہیں پیدا ہوا ہے۔

قریب تھا کہ عمر بن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے، ان کے

بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے ان میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبے یا چند شعبوں ہی میں کام

کیا اور مجددِ کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے۔ (تجدید و احیائے دین ص ۱۷ طبع چہارم)

مولانا کا ارشاد صاف بتا رہا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز اور بعد کے جملہ مجددین سب ناقص تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہر صدی کے سرے پر ایک مجدد کی پیشگوئی فرمائی تھی وہ آج چودہویں صدی تک مجددِ کامل کی شکل میں صحیح ثابت نہ ہو سکی یہ تجدید و احیائے دین کے جذبات میں غالباً ”تفوق“ کا خواب ہے تاریخ کے جملہ مجددین کا مقام گرا کر ہی تو یہ خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا تھا جس کے لئے مولانا نے یہ جرات فرمائی، سچ ہے یہ

بت کریں آرزو حُدا کی

شان ہے تیری کبریائی کی

ایک متعین مدت کے لئے مقررہ رقم کے عوض کوئی مرد کسی عورت سے **جوازِ متعہ** اس کی عصمت کا سودا کر لے یہ متعہ کہلاتا ہے اور شریعتِ اسلامیہ میں

اہل السنۃ والجماعت کے ہاں یہ ”متعہ“ قطعاً حرام ہے اس کے جواز کے لئے کوئی بھی گنجائش

قطعاً نہیں ہے مگر ہمارے محترم مولانا مودودی صاحب نے ایک مرتبہ اس کے جواز کا بھی

فتویٰ دے ڈالا۔ مولانا موصوف نے اس سلسلہ میں جو انداز اور دلچسپ دلائل پیش فرمائے ہیں



وہ ”الاعتصام“ لاہور کی روایت سے ہمارے سامنے ہیں۔ اس لئے بجائے اس کے کہ ہم تفصیلات کو پیش کریں مناسب جانتے ہیں کہ مولانا موصوف کے دلائل کو ادارہ ”الاعتصام“ لاہور کے تبصرہ سمیت ذیل میں درج کر دیں۔ مثل شہور ہے ”صاحب البیت اذری بمافیہ اہل پاکستان مولانا کو جس قدر سمجھ سکتے ہیں ہم دور دراز رہتے والے بھلا کہاں سمجھ سکتے ہیں۔ بہر حال اخبار مذکور مجریہ ۱۸ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ میں بشرخی ”مزاج شناس رسول“ کی جسارت۔ ”متعہ کے جواز پر ڈرامائی استدلال“ منجانب ادارہ مندرجہ ذیل تفصیلات حوالہ قلم کی گئی ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کچھ دنوں سے عجیب عجیب اور پُر لطف تحقیقات فرماتے لگے ہیں۔ چند روز ہوئے ہیں انھوں نے صحیح بخاری کی صحت و استناد کے بارے میں یہ انکشاف کیا تھا کہ :-

”کوئی شریف آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں جو چھ سات ہزار احادیث درج ہیں وہ ساری

کی ساری صحیح ہیں۔“

اب اگست کے ترجمان القرآن میں انھوں نے اپنی ”ترجمانی تفسیر“ تفہیم القرآن میں سورہ مومنون کی ابتدائی آیات کی تشریح و تفسیر کرتے ہوئے فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ نَأْيًا هُمُ الْعَادُونَ کے ذیل میں ”متعہ“ کے جواز کا فتویٰ ارشاد فرمایا۔

آگے بڑھنے سے پیشتر مناسب ہو گا کہ سورہ مومنون کی ابتدائی آیات پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ مولانا مودودی کے ”جواز متعہ“ کا موقف واضح ہو سکے۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝  
وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلرُّكُوعِ  
فَاعِلُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝ إِلَّا عَلَىٰ  
أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝  
فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۝

ترجمہ :- یقیناً کامیاب ہو گئے ایمان والے جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں، جو نکستی باتوں پر

دھیان نہیں دیتے، جو رکوع ادا کرتے ہیں، جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سو ان کے

اپنی بیویوں کے اور اپنی لونڈیوں کے جو لوگ ان (دو ذرائع) کے سوا کوئی اور ذریعہ



راپنے جنسی تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے اختیار کریں، وہ (حدود شریعت سے) تجاوز کرنے والے ہیں۔

ایک بار آپ یہاں پھر رکئے اور پیش نظر آیات پر دوبارہ غور فرمائیے۔ بالخصوص آخری آیت کے معنی و مطلب کی وسعتوں کو ذہن و فکر کے زاویوں میں لائیے اور پھر بتائیے کہ کیا یہ آیت اس امر کی قطعی وضاحت کناں نہیں ہے کہ بیوی ”اور ملکِ کمین“ کے سوا قرآن نے جنسی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اور تمام دروازے مسلمان پر کلیتہً بند کر دیئے ہیں، خواہ وہ مُتْعہ ہو یا کچھ اور!

لیکن داد دیجئے ”مزاج شناسِ رسول“ کی ”درایت“ کی کہ اُن کے نزدیک قرآن کی یہ نصِ صریح تحریمِ مُتْعہ پر کوئی دزنی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ اُن کے خیال میں مُتْعہ کے ساتھ بعض ایسی چیزیں بھی جائز ہیں جن کا نام لیتے ہوئے بھی کسی بھلی مجلس میں شرم آتی ہے۔ معلوم نہیں، مولانا مودودی کو ”مُتْعہ“ سے کیا دلچسپی ہے کہ اس کو ثابت کرنے کے لئے انھوں نے اجتہاد و فکر کا پورا سرمایہ میدانِ تحقیق میں جھونک دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ شریعتِ مطہرہ سے اس کا جواز ثابت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ مگر قربان جائیے اُن کی محنت و کاوش کے کہ اس کے باوجود انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور اس وقت تک میدانِ نہیں چھوڑا جب تک کہ ایک وسیع سمندر میں مسافروں سے بھرا ہوا ایک جہاز توڑ کر انھوں نے مُتْعہ کے جواز کی صورت پیدا نہیں کر دی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

”فرض کیجئے کہ ایک جہاز سمندر میں ٹوٹ جاتا ہے اور ایک مرد و عورت کسی تختے پر بہتے ہوئے ایک ایسے سُنانِ جزیرے پر جا پہنچتے ہیں جہاں کوئی آبادی موجود نہ ہو، وہ ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہیں اور شرعی شرائط کے مطابق ان کے درمیان نکاح بھی ممکن نہیں، ایسی حالت میں ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ باہم خود ہی ایجاب و قبول کر کے اس وقت تک کے لئے عارضی نکاح کر لیں جب تک کہ وہ آبادی میں نہ پہنچ جائیں یا آبادی اُن تک نہ پہنچ جائے۔ کم و بیش ایسی ہی اضطراری صورتیں اور بھی ہو سکتی ہیں۔ مُتْعہ اسی اضطراری حالتوں کے لئے ہے“ (ترجمان القرآن بابۃ ماہ اگست ۱۹۷۷ء ص ۳۷)

لے خدا اس اضطراری حالت سے ہر مسلمان کو بچائے، اس لفظ کے مہارے کتنے حضرات کہاں کہاں بھٹک گئے، غفر اللہ لہم ۱۲ راز



دیکھا آپ نے مولانا مودودی کو متعہ کا جواز ثابت کرنے کے لئے کتنا دُور کا چکر کاٹنا پڑا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں ایک واقعہ بھی اس قسم کا نہیں ملتا کہ پورا جہاز سمندر کی سرکش لہروں کی نذر ہو گیا ہو، اور صرف ایک تختہ محفوظ رہا ہو۔ جس میں کہ ایک غیر محرم مرد اور عورت بیٹھے رہے ہوں۔ مسلمانوں نے جنگیں بھی لڑیں، تجارت بھی کی، بادشاہت بھی کی، سفارت بھی کی، انھوں نے مختلف حالات میں طویل طویل سفر بھی اختیار کئے، جو بحری بھی تھے، بری بھی تھے اور فضائی بھی۔ لیکن کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملتی جو مولانا مودودی نے پیش فرمائی ہے۔ گزشتہ چودہ صدیوں کی اسلامی تاریخ میں نہ کوئی اس انداز سے جہاز ٹوٹا نہ کوئی غیر محرم مرد اور عورت اس طرح تختے پر بہتے ہوئے کسی سُنان جزیرے میں پہنچے اور نہ کسی نے اس صورتِ حال سے مضطرب قرار ہو کر متعہ کیا۔

اس مثال کا وجود خارج میں تو کہیں دستیاب نہیں ہوتا، ہاں البتہ مولانا مودودی کے ذہن کے سمندر میں سفر کرتے ہوئے اگر کوئی جہاز ٹوٹا ہو اور کچھ یہ صورت حال پیدا ہوئی ہو تو واقعی یہ دُور حاضر کا ”اصولی اور بنیادی مسئلہ“ ہے۔ اس کا حل اگر ”پورے کا پورے اسلامی نظام برہا کرنے کا داعی“ پیش نہ کرتے تو یہ اسلامی نظام میں ایک بہت بڑا خلل رہ جاتا۔

مولانا مودودی اور ان کی جماعت فقہ کی مخالفت میں ایک دلیل یہ بھی دیا کرتے ہیں کہ فقہ دورِ زکاۃ باتوں کا مجموعہ ہے۔ اور اس میں ایسے ایسے مفروضوں کو جمع کیا گیا ہے جو پوری انسانی زندگی میں پیش نہیں آسکتے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں جماعتِ اسلامی کے خردمندوں سے، کیا متعہ کے جواز کی یہ مثال کبھی پیش آئی ہے؟ اور خارج میں کہیں اس کے وجود کا پتہ نشان ملتا ہے۔

فرض کیجئے اگر یہ صورت پیش آ بھی جائے اور سمندر کی دو دو تین تین سو فٹ کی بے پناہ لہر کسی مضبوط جہاز کو اس طرح توڑ دیں کہ اس کا صرف ایک ہی تختہ محفوظ رہ سکے جس پر ایک مرد اور ایک عورت بہتے ہوئے کسی سُنان جزیرے میں پہنچ جائیں، تو اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ بقول مولانا مودودی کے ایسی جگہ پہنچے ہیں جہاں آدم ہے نہ آدم زاد، وہ ایک بے آباد اور سُنان جزیرہ ہے، ظاہر ہے کہ وہاں ان کو کھانے کی ضرورت بھی ہوگی، پہننے کی بھی ہوگی۔ پہننے پہننے کی بھی ہوگی اور گرمی و سردی سے محفوظ رہنے کے لئے مکان کی حاجت بھی ہوگی۔ کیا وہ ان چیزوں کے حصول پر کوئی توجہ نہیں دیں گے؟ تختے سے اترتے ہی سب سے پہلے ان



کا ذہن اسی طرف منتقل ہوگا کہ چلو پہلے متعہ تو کریں، باقی پھر دیکھا جائے گا۔

یہ عجیب تضاد ہے کہ ایک طرف تو مولانا متعہ ثابت کرنے کے لئے مرد اور عورت کو ایسی جگہ پہنچاتے ہیں جہاں زندگی اور اس کے لوازمات ہی ختم ہیں۔ دوسری طرف جنسی اعتبار سے ان میں وہ اس قدر اضطراب کی کیفیت پیدا کرتے ہیں کہ وہ متعہ کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں۔

کیا عقل سلیم اس بات کو مانتی ہے کہ جس مرد و عورت کے پاس نہ کھانے کو روٹی کا ٹکڑا ہے، نہ پینے کو پانی کا قطرہ۔ نہ پہننے کو کپڑا ہے، نہ رہنے سہنے کو مکان لیکن ان میں جنسی بھوک کی تیزیاں اور شدتیں ناقابل برداشت ہیں؟۔ اس قسم کا ذلیل آدمی مولانا مودودی کے ذہن میں کوئی ہوتا ہو، اس دنیا میں تو کم از کم نہیں پایا جاتا جب کوئی شخص اس ہولناک صورت حال سے گزرتا ہو ایک ایک بے سرو سامان ہو گیا ہو، اور آبادی کو چھوڑ کر جنگل بیابان میں جا پڑا ہو، آپ ذرا غور فرمائیے وہاں اس کے جنسی تقاضے باقی بھی رہیں گے۔ اور وہ اس لائق رہے گا کہ متعہ کے لئے مضطرب رہے۔  
قرار ہو۔؟

مولانا کے سامنے غالباً متعہ کی پوری تعریف نہیں ہے۔ اگر متعہ کی پوری تعریف سے وہ باخبر ہوتے تو شاید تفسیر قرآن کے نام سے یہ لغزش ان سے سرزد نہ ہوتی۔

جو لوگ متعہ کی اباحت کے قائل ہیں، ان کے نزدیک اس کا مصرف محض جنسی تقاضوں کو پورا کرنا نہیں ہے بلکہ ایک مقصد ان کے سامنے یہ بھی ہے کہ وہ سفر میں جائیں تو انھیں ایک ایسے رفیق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو ان کی ضروریات کو سمجھنے اور ان کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ یہ چیز ہمیشہ آبادیوں میں پیش آتی ہے جہاں آدمی کو کھانے پکھانے اور رہنے سہنے کے لئے کئی قسم کے تکلفات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ان کو پورا کرنے کے لئے وہ ایک رفیق کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ شیعہ مسلک نے ایسی صورت میں متعہ (عارضی نکاح) کرنے کی اجازت دیدی ہے۔ اس عارضی نکاح میں مرد و عورت کو کچھ روپے بھی دیتا ہے یعنی باقاعدہ یہ ایک سودے کی صورت میں طے پاتا ہے۔

متعہ کی اس ضرورت اور تعریف کی روشنی میں مولانا مودودی بتائیں کہ کیا ایک انسان جنگل میں بھی یہ ضروریات پیش آسکتی ہیں جہاں کہ زندگی اور اس کے لوازمات ہی ناپید ہیں؟۔  
متعہ کے جواز میں مولانا کا یہ مضمون پڑھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کوئی فلم



دیکھ رہے ہیں جس میں ایک وسیع و عریض سمندر دکھایا گیا ہے اور اس میں مسافروں سے لدا ہوا ایک جہاز سطح سمندر پر تیرتا ہوا چلا جا رہا ہے کہ ناگہاں سمندر میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے اور سمندر کی متمر د لہروں کے زوردار تھپیڑے جہاز کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ صرف ایک تختہ بچ جاتا ہے جس پر ایک مرد اور ایک عورت سوار ہیں۔ اور مولانا دیکھ رہے ہیں کہ وہ تختہ بہت بہتے بہتے ایک جزیرے میں پہنچ جاتا ہے جہاں کوئی آبادی نہیں ہے۔ وہاں پہنچ کر ادھر وہ تختے سے نیچے اترتے ہیں ادھر جنسی بھوک کی شدت انھیں ستانے لگتی ہے۔ یعنی مولانا دیکھ رہے ہیں کہ ان کے سامنے سوائے جنسیت کے اور کوئی مسئلہ مشکل نہیں ہے۔ کھانے پینے کا سامان اور پہننے کے لئے کپڑے وہ تختے پر لاد کر ساتھ لے آئے ہیں۔ اب صرف ایک مسئلہ ان کے سامنے ہے۔ اور وہ ہے

متعہ۔ !!

متعہ کا جواز ثابت کرنے کے لئے مولانا کو کتنے مفروضے قائم کرنا پڑے ہیں کہ عورت میں جاذبیت بھی ہو، اور وہ متعہ کے لائق بھی ہو، پھر وہ دونوں مضطر اور بے قرار بھی ہوں۔

سوال یہ ہے کہ اگر مرد تو مضطر ہو مگر عورت مضطر نہ ہو، یا عورت مضطر ہو اور مرد مضطر نہ ہو تو کیا اس صورت میں مولانا اس بات کا ذمہ لیتے ہیں کہ ان دونوں میں سے جو مضطر نہ ہو، اس کو وہ اضطراب و شہوت رانی کے انجکشن دیں گے تاکہ دونوں میں توازن قائم رہے اور وہ متعہ کے لئے تیار ہو سکیں ؟

(الاعتصام ۴ نومبر ۱۹۵۷ء)

**سُنّتِ نبویؐ کے متعلق** اسوۂ رسول و سُنّتِ نبویؐ کے متعلق ہر نیک دل مسلمان اپنے دل میں بہترین عقیدت رکھتا ہے اور کیوں نہ ہو محبت رسول

کی یہی علامت ہے، اللہ کے رسولؐ کا فرمان ہے۔ من احب سنتی فقد احببني ومن احبني كان معي في الجنة (مشکوٰۃ شریف) جس نے میری سُنّت کو دوست رکھا اس نے مجھ کو دوست رکھا اور جس نے مجھے دوست رکھا وہ قیامت کے دن جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ اسوۂ رسول و سُنّتِ نبویؐ کا کوئی ایسا منطقی مفہوم نہیں ہے جسے عوام و خواص مجاہدان رسولؐ نہ جانتے ہوں اور نہ سمجھ پاتے ہوں۔ مولانا مودودی صاحب کی اس میدان میں ”گل افشانی“ ملاحظہ ہوں۔ آپ کے خیال شریف میں سُنّت کا مفہوم مصطلح ہی سرے سے غلط ہے اسی کو کہتے ہیں کہ ”نہ رہے بانس نہ بچے بانسری“ چنانچہ آپ کا ارشاد شریف یہ ہے:-



”میں اُسوہ اور سنت اور بدعت وغیرہ اصطلاحات کے ان مفہومات کو غلط بلکہ دین میں تحریف کا

موجب سمجھتا ہوں، جو بالعموم آپ حضرات کے ہاں رائج ہیں“ (ترجمان مئی جون ۱۹۷۵ء)

**دارھی کے متعلق** چونکہ آج کل فیشن پرست مسلمانوں کے لئے دارھی بھی ایک وبال جان بنی ہوئی ہے، اسی لئے حضرت مولانا مودودی صاحب جیسے ”مزاج شاس رسول“ کا اولین کام یہی ہونا تھا کہ ”دارھی رکھنا“ جیسے ناقابل برداشت سنت کے کاموں کے سنت ہونے ہی سے انکار کر دیں۔ بس پھر میدان صاف ہے۔ چنانچہ دارھی کے متعلق خصوصیت سے ارشادِ مودودیت یہ ہے :-

”آپ کا یہ خیال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی دارھی رکھتے تھے اتنی ہی بڑی دارھی رکھنا سنتِ رسول یا اُسوہ رسول ہے یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عاداتِ رسول کو بعینہ وہ سنت سمجھتے ہیں جس کے جاری اور قائم کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء علیہم السلام مبعوث کئے جاتے رہے ہیں مگر میرے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ سنت کی صحیح تعریف نہیں ہے بلکہ میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس (دارھی جیسی) قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور خطرناک تحریفِ دین ہے۔ (ترجمان القرآن مئی جون ۱۹۷۵ء)

دارھی کا بوجھ نہ برداشت کر سکنے والے نازک طبع حضرات کو مولانا کا بہت بہت مشکور ہونا چاہیئے، آپ نے نہ صرف دارھی کے جھنجھٹ سے ان کو نجات دلائی بلکہ ”الٹا پور کو تو ال کو ڈٹے“ آپ نے غریب دارھی رکھنے والے عاشقانِ سنتِ رسولؐ ہی کو بدعتی اور دین کے محرف قرار دے دیا۔ مولانا کو اس خدمت و اقامتِ دین پر جس قدر بھی مبارکباد دی جائے کم ہے جن دنوں مولانا صاحب نے اپنے ان فتاوؤں کو شائع فرمایا آپ کے بہت سے مقلدین نے اُن پر عمل کرتے ہوئے اپنی اچھی خاصی دارھیوں کو کانٹ چھانٹ کر کے مختصر کر لیا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خطابِ مودودیؒ ۲۵ ایسا کرنے پر وہ مجبور بھی تھے اس لئے کہ

بے سجادہ رنگیں کن گرت پر مغال گوید

کہ سالک بے خبرِ نودِ راہ و رسم منتر لہا

**انکارِ حدیث کے لئے چور و رازوں کی تلاش** تحقیقِ سنت کی منزل کو طے کرنے



کے لئے انکارِ حدیث کا مرحلہ طے کرنا ضروری ہے مگر جمہور کے خلاف کھلے لفظوں میں حدیثِ رسولؐ کا انکار کر دینا کوئی آسان کام نہیں اور جن لوگوں نے یہ حرکت کی وہ اُمتِ اسلام میں مردودِ مطعون و ملعون قرار پائے اور دونوں جہان میں خائب و خاسر ہوئے ان ہی ضروری وجوہات کی بنا پر حضرت مولانا مودودی صاحب نے ”بینِ بین“ یعنی درمیانی راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ ایک طنز آپ حضرات محدثینِ کرام کی ان لفظوں میں تعریف فرماتے ہیں۔

”حق یہ ہے کہ مسلمانوں پر ان محدثین کا اتنا بڑا احسان ہے کہ وہ قیامت تک اس بارے میں سکدوش نہیں ہو سکتے۔“ (تفہیمات ص ۲۷۶)

دوسری طرف ان ہی بزرگانِ اسلام محدثینِ کرام کی بابت مولانا کا ارشاد یوں ہے :-  
 ”وہ حضرات (محدثین) ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو لاعلم، کذاب اور دجالِ الدجاجلہ تک کہہ ڈالتے تھے۔ پھر ان کی بیان کردہ حدیث میں کون سی چیز ایسی ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔“ (تفہیمات ص ۲۹۲)

مولانا موصوف کے ہر دو بیانات کو انصاف کی ترازو میں رکھ کر وزن کیجئے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ مولانا صاحب کا رخ کس منزل کی طرف ہے۔

اس عقیدہ مودودیّت  
ایک بھی حدیث ایسی نہیں جس پر یقین کیا جاسکے  
 کے متعلق کسی اور تفصیل

کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے اسے مبالغہ آمیزی سے تعبیر کیا جائے اس لئے خود مولانا مودودی صاحب ہی کے الفاظِ مبارکہ نوٹ فرمائیے۔ آپ کا ارشاد گرامی یوں ہوتا ہے۔

”احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آتی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ محض گمانِ صحت ہے نہ کہ علمِ یقین۔“

(ترجمان القرآن ربیع الاول ۱۳۶۵ھ)

مولانا کے اس قسم کے گمراہ کن ارشادات پر آگے تفصیلی تبصرہ جات آرہے ہیں، اس لئے ہم یہاں اتنا ہی عرض کرتے ہیں کہ جس احتمال سے آپ انکارِ حدیث کے لئے چور دروازہ ڈھونڈنے کی کوشش میں ہیں، اسی دروازہ سے ایک آپ جیسا محققِ قرآن کا بھی تو انکار کر سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ موجودہ قرآن چند انسانوں سے چند انسانوں تک ہی تو نقل ہوتا چلا



آ رہا ہے، پھر اس علم یقین کیسے حاصل ہو۔ نقل کرنے والے سب انسان ہی تو تھے ان سب سے غلطی کے امکانات ہیں۔ اب بتلائیے خود علامہ مودودی صاحب یا ان کے حواری اس منکر قرآن کی تشفی کے لئے کون سا راستہ اختیار کریں گے؟ کیا صحابہ و تابعین و ائمہ دین میں کوئی بھی بزرگ ایسا نہیں جس کی نقل پر بھروسہ کیا جاسکے؟۔

محدثین کرام کے متعلق مزید بے اعتمادی آپ ان لفظوں میں پیدا کرنے کی کوشش فرماتے ہیں:-

”کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے وہ بہر حال تھے تو انسان ہی۔“ (تفہیمات ص ۲۹۲)

مولانا کا یہ اصول اتنا خطرناک ہے کہ دنیا میں کوئی بھی انسان خواہ وہ کسی بھی درجہ پر فائز ہو قابل اعتماد نہیں رہ سکتا۔ اس حد تک بے اعتمادی سے دنیا کا نظام ہی سارے کا سارا معطل ہو سکتا ہے۔ مگر مولانا صاحب ہیں کہ بے کھٹکے اُمت کو اس خطرناک ”بے اعتمادی“ کی تلقین فرما رہے ہیں۔ مولانا مُعاف فرمائیے؟ آپ بھی تو انسان ہی ہیں پھر کلیتہً آپ کی ذاتِ گرامی پر اعتماد کر لینا کہاں تک صحیح ہوگا؟ اور آپ پر اس طرح اعتماد کرنے والوں کے حق میں آپ کا کیا فتویٰ ہوگا؟ بیٹو! تو جروا

اسی سلسلہ کی آپ کی ایک اور گہرا فاشانی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:-

”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ ”محدثین کرام“ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی

صحیح ہے۔ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔“ (تفہیمات ص ۲۹۲)

مولانا مودودی صاحب کی یہ وہ خطرناک چوٹ ہے جس سے اسلام کا سارا شیرازہ درہم برہم ہو سکتا ہے۔ محدثین کرام کو اگر اپنی نقل کردہ صحیح روایات پر خود ہی یقین نہیں تھا تو کیا جھک مارنے کے لئے انھوں نے اس فن کی تدوین میں عرص صرف کیں؟ یوں ہی بے کار انھوں نے اس فن کی تکمیل کے لئے قابلِ اساتذہ کی تلاش میں صد ہا میل کا سفر کیا؟ یوں ہی یہ ہزار ہا صفحات سیاہ کر کے اُمت کے ہاتھوں میں دیئے گئے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ علامہ مودودی اگر کھلے ہوئے منکر حدیث ہو کر ایسی باتیں کہہ جاتے تو افسوس نہ ہوتا حدیث پر ایمان و یقین کا دعویٰ کرتے ہوئے چور دروازوں سے ذخیرہ احادیث پر ہم بربانا کوئی مقبولیت نہیں ہے۔



مسٹر پرویز "غالباً ان ہی حالات کے تحت فرماتے ہیں

مسٹر پرویز "کیا فرماتے ہیں؟" کہ مولانا مودودی صاحب بھی تو میری ہی طرح منکر ہیں۔  
ہیں۔ پھر مجھ ہی کو کیوں برا بھلا کہا جاتا ہے۔ پرویز صاحب کی اصل عبارت جو ان ہی کے لفظوں  
میں نقل ہے، درج ذیل ہے۔

"حدیث کے متعلق بعینہ ہی مسلک جو مودودی صاحب کا ہے (طلوع اسلام کا ہے اس  
فرق کے ساتھ کہ وہ کسی ایک فرد کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ جس بات کو اس کی نگاہ جو ہر شناس  
سنت رسول قرار دے دے اس کی اتباع ساری امت پر لازم قرار دیا جائے۔ اس کا کہنا  
ہے کہ یہ حق امت کے صرف قرآنی نظام کو حاصل ہے کہ وہ روایات کو اس ذخیرے کو چھان بھٹک  
کر دیکھے کہ اس میں کون سی چیز صحیح ہو سکتی ہے اور کون کون سی جزئیات ایسی ہیں کہ جن میں کسی  
تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں لیکن آپ دیکھئے گا کہ اس کے باوجود جماعت اسلامی طلوع اسلام  
کو مسلسل اور ہمیشہ منکر حدیث اور منکر شان رسالت ٹھہرا کر ایک بہت بڑے فتنے کا موجب  
قرار دیتی ہے اور اپنے امیر کو حدیث کا سب سے بڑا حامی اور سنت کا جتید متبع قرار دیتی  
ہے۔ الخ (رسالہ حق پرست علماء الخ مولانا احمد علی صاحب ص ۵۵ بحوالہ)

(طلوع اسلام کراچی ۲ اپریل ۱۹۵۵ء)

جہاں تک اپنی معلومات کا تعلق ہے مودودی صاحب نے آج تک پرویز صاحب کے اس  
چیلنج کا کوئی جواب نہیں دیا۔

حضرت امام بخاریؒ اور آپؐ کی "الجامع الصحیح" پر حملے

علامہ مودودی صاحب کی اس  
روش کے پیش نظر حضرت امام بخاریؒ اور ان کی "الجامع الصحیح" کے بارے میں جو کچھ آپ نے یا آپ  
کے حواریوں نے کہا یا لکھا ہے وہ کچھ بعید از قیاس نہیں ہے۔ مولانا صاحب یا ان کے حواریوں  
کی ایسی جملہ تحریروں کو جمع کیا جائے جو ان "اقامت دین" کے دعویداروں نے حوالہ قلم کی  
ہیں تو ایک خاصا دفتر تیار ہو جائے۔ مگر ہمارے زیر قلم مقالہ میں اتنی گنجائش نہیں ہے،  
اس لئے ہم مولانا کی وہ تازہ ترین تقریر جو آپ نے ۱۵ مئی ۱۹۵۵ء کو برکت علی ہال میں ارشاد

۱۶ یہ مولانا مودودی صاحب کے نظریہ کی طرف اشارہ ہے ۱۲



فرمایا بحوالہ اخبار الاعتصام مجریہ ۲۷ مئی ۱۹۵۵ء اور ۲ جون ۱۹۵۵ء معتبصرہ اخبار موصوف کے درج ذیل کر دیتے ہیں اس سے صحیح بخاری شریف کے بارے میں مودودی موقف معلوم ہوگا۔ اور پھر ادارہ کا علمی منصفانہ تبصرہ اس قابل ہے کہ اُسے بار بار پڑھ کر علم و ایقان پر ور بصیرت حاصل کی جائے۔ مولانا موصوف کی اس تاریخ والی تقریر کا موضوع سنتِ رسول اور حدیث تھا بہت کچھ امین و ان کے بعد مولانا صاحب نے بخاری شریف کے بارے میں اپنے موقف کا یوں اعلان فرمایا :-

”کوئی شریف آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حدیث کا جو مجموعہ ہم تک پہنچا ہے وہ قطعی طور پر صحیح ہے، مثلاً بخاری جس کے بارے میں اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے، حدیث میں کوئی بڑے سے بڑا غلو کرنے والا بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں جو چھ سات ہزار احادیث درج ہیں وہ ساری کی ساری صحیح ہیں۔“

مولانا مودودی نے اپنے اس عقیدہ یا نظریہ کی تشریح ایک مضمون ”مسک اعتبار“ میں بھی کی ہے جو ان کے مجموعہ مضامین ”تفہیمات“ میں شائع ہو چکا ہے۔  
مولانا نے یہ بھی فرمایا :-

”کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ جس حدیث کو تحقیق سے اس نے صحیح جان لیا ہے، وہ دوسروں کو بھی مجبور کرے کہ اس کی تحقیق کو قبول کریں، ہر شخص اپنی جگہ تحقیق کرنے کا حقدار ہے۔“

اس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نخواستہ احادیث کی صحت ایسی ہے کہ ہر شخص اس کو چیلنج کر سکتا ہے اور اپنی تحقیق اور صوابدید سے ٹھکرایا تسلیم کر سکتا ہے۔ تلقی بالقبول جس کو محدثین نے بجائے صحت کے ایک معتمد علیہ پیمانہ قرار دیا ہے۔ کوئی چیز نہیں۔ کیا اس سے اس انتشار و فوضویت کو تقویت نہیں ملتی جس کے ازالہ کے لئے مودودی صاحب کوشاں ہیں؟ اور کیا اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ احادیث کی صحت و عدم صحت کا معاملہ ان کے نزدیک سراسر شخصی ہے۔ اور کوئی کسی کو حدیث کی کسی تشریح اور تفسیر کے بارے میں مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ اس کو صحیح تسلیم کر لے۔ ہم مولانا سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس انداز استدلال سے کہیں خود ہماری اپنی پوزیشن کمزور تو نہیں ہوتی؟ اور لوگ اس نتیجے پر تو نہیں پہنچتے کہ جس حدیث کو صحیح سمجھیں گے مانیں گے، جس کو صحیح نہیں سمجھیں گے، نہیں مانیں گے۔ علاوہ ازیں



مولانا نے جس انداز میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا وہ ہمیں نہیں بھایا۔ اس سے بہتر اور زیادہ دروازہ پر ایسا بیان اختیار کیا جاسکتا تھا۔ مثال کے طور پر احادیث کے مجموعوں کا ذکر کرتے ہوئے صحیح بخاری کے بارے میں انھوں نے جن خیالات کا اظہار فرمایا وہ حدودِ درجہ غیر ذمہ دارانہ ہیں۔ تعجبِ خیر بات یہ ہے کہ ان کی تقریر کا یہ حصہ ”تسلیم“ میں شائع نہیں ہوا۔ حالانکہ اگر مولانا نے یہ فرمایا ہے ”تسلیم“ کو اس کی اشاعت سے گریز نہیں کرنا چاہیے تھا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے صحیح بخاری سے متعلق جو اظہارِ خیال فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی ترتیب و تدوین کے پس منظر اور اس کی تصنیف کے اسباب و عوامل سے واقف نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اُمت میں صحیح بخاری کو صحت و قطعیت کے لحاظ سے کیا درجہ حاصل ہے اور علماءِ اہل سنت میں یہ کتنی وقعت سے دیکھی جاتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے صحیح بخاری کی تصنیف کا پس منظر بیان کر دیا جائے تاکہ مولانا مودودی اور دیگر حضرات پر یہ واضح ہو سکے کہ صحت و قطعیت کے اعتبار سے اس کا مقام کتنا بلند ہے۔

حافظ ابن حجر مقدمہ ”فتح الباری“ میں فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے جب احادیث کے مجموعوں پر نظر ڈالی، ان میں ان کو صحیح اور ضعیف باہم ملی جلی احادیث نظر میں آئیں تو انھوں نے صحیح احادیث کے جمع کرنے کا عزم کیا۔ حافظ ابن حجرؒ کے الفاظ یہ ہیں:-

حرکت ہمتہ لجمع الحدیث الصحیح الذی لا یرتاب فیہ امین۔

(مقدمہ فتح الباری ص ۱ طبع مصر)

یعنی ”امام موصوف نے ایسی صحیح احادیث کا مجموعہ مرتب کرنے کا ارادہ کر لیا، جس کی صحت کے متعلق کسی دیاندار آدمی کو شبہ نہ ہو“ اور یہ ارادہ انھوں نے اپنے استاد محترم امام اسحاق بن راہویہؒ جو محدثین میں امیر المومنین فی الحدیث والفقہ کے معزز خطاب سے معروف ہیں، کے ایک ارشاد کی تعمیل اور ان کی ایک خواہش کی تکمیل میں کیا جسے حافظ ابن حجرؒ نے اس طرح ذکر کیا ہے کہ ایک دفعہ امام اسحاق بن راہویہؒ نے اپنے تلامذہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:-

لو جمعتم کتاباً مختصراً بالصحیح لسنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم



”کاش تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا ایک صحیح مجموعہ کتابی صورت میں جمع کرو“  
امام بخاری فرماتے ہیں کہ حضرت الاستاذ کا یہ ارشاد میرے دل میں اتر گیا اور اخذت  
فی جمع الجامع الصحیح (مقدمہ فتح الباری ص ۵ طبع مصر) میں نے صحیح بخاری کی تدوین شروع کر دی۔  
حضرت امام بخاری نے اپنے استاذ کے اس ارشاد کی کس طرح تعمیل کی اس کے بارے  
میں خود انھیں کے الفاظ ہیں۔

صنفت کتابی الجامع فی المسجد الحرام وما ادخلت فیہ حدیثا حتی  
استخرت اللہ تعالیٰ و صلیت رکعتین و تيقنت صحته (مقدمہ فتح الباری ص ۴۹)  
”میں نے اپنی یہ کتاب مسجد حرام میں تصنیف کی اور میں نے ایک ایک حدیث استخارہ  
کر کے اور دو رکعت نفل پڑھ کر اس میں درج کی جبکہ مجھے اس کی صحت کا کامل یقین ہو گیا۔  
اسی یقین کی وجہ سے امام بخاری نے اس کا نام

الجامع المسند الصحیح المختصر من  
امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
وسننہ وایامہ“ ————— بخویر فرمایا۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی اس فقیہ المثال خدمت حدیث سے متعلق —  
— علامہ اُمت میں اس کو جو وسعت پذیر اور ہمہ گیر قبولیت حاصل ہوئی، مناسب معلوم  
ہوتا ہے کہ اس کا مختصر تذکرہ کر دیا جائے۔ تاکہ مولانا مودودی صاحب کو معلوم ہو جائے  
کہ صحیح بخاری کو تلقی اُمت بالقبول کا جو درجہ حاصل ہے، وہ مولانا مودودی یا اُن کے  
عقیدت مندوں کے اس خیال کو کہ

”کوئی شریف آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حدیث کا جو مجموعہ ہم تک پہنچا ہے وہ قطعی طور پر  
صحیح ہے۔ مثلاً بخاری جس کے بارے میں اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے، کوئی  
بڑے سے بڑا غلو کرنے والا بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں جو چھ سات ہزار احادیث درج  
ہیں وہ ساری کی ساری صحیح ہیں“

ائمہ دین، علماء سلف، اور فن کے ماہرین و محققین کی تصدیحات کے مقابلہ میں کیا حیثیت



حاصل ہے۔

۱۔ امام نسائی فرماتے ہیں:-

اجود هذه الكتب كتاب البخاري واجمعت الامة على صحة  
هذين الكتابين ووجوب العمل باحاديثهما (مقدمہ صحیح البخاری)

ترجمہ:- حدیث کی تمام کتابوں میں سے بہترین کتاب صحیح بخاری ہے اور اس پر اُمت کا اجماع ہے  
کہ یہ دونوں کتابیں ربخاری و مسلم صحیح ہیں اور ان پر عمل کرنا واجب ہے۔

۲۔ مشہور محدث حافظ ابن الصلاح صحیح احادیث کی اقسام بیان کرتے ہوئے

فرماتے ہیں:-

واعلاها الاول وهو الذي يقول فيه اهل الحديث كثيراً صحيح

متفق عليه۔

یعنی صحت کے لحاظ سے سب سے اونچا مقام ان احادیث کا ہے جن کے متعلق محدثین  
اکثر فرماتے ہیں ”صحیح متفق علیہ“ پھر فرماتے ہیں:-

معنی تو اس کا یہی ہے کہ امام بخاری و مسلم نے اس کی صحت پر اتفاق کیا اور یہ نہیں  
کہ اُمت نے اس پر اتفاق ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:-

لكن اتفاق الامة عليه لازم من ذلك وحاصل معه لاتفاق

الامة على تلقي ما اتفق عليه بالقبول

اس قسم کی احادیث تمام تر قطعی الصحت ہیں اور ان سے علم یقینی اور نظری حاصل  
ہوتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:-

وهذا القسم جميعه مقطوع بصحة والعلم اليقيني النظري واقع به۔

یہ اُن کی تصریح تو متفق علیہ کے متعلق ہے لیکن الگ الگ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بارے  
میں ان کا فرمان یہ ہے کہ:-

امام بخاری جس طرح روایات میں متفرد ہیں اسی طرح امام مسلم جن روایات میں متفرد  
ہیں وہ احادیث بھی قطعی الصحت ہیں۔ اس لئے کہ اُمت نے اُن میں سے ہر ایک کتاب کو قبولیت  
کا مقام بخشا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:-



ما الفردبہ البخاری او مسلمہ مندرج فی قبیل ما یقطع بصحتہ لتلقی

الامة کل واحد من کتابیہما بالقبول۔ (مقدمہ ابن الصلاح - ۲۹-۲۵ طبع مصر)

۳۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی کتاب "اختصار علوم الحدیث" میں حافظ ابن الصلاح کی مذکورہ بالا تصریحات درج کر کے ان سے امام نووی کا اختلاف ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-  
 "میں اس باب میں حافظ ابن الصلاح کی تائید کرتا ہوں، اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ صحیح ہے۔"

اس کے بعد شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-  
 "احادیث کے وہ مجموعے جن کو ائمہ نے قبولیت کا مقام بخشا ہے، ان کی احادیث کے قطعی الصحت ہونے کا فتویٰ ائمہ دین کی متعدد جماعتوں سے ثابت ہے، جیسا کہ قاضی بیلون، مالکی اور شوافع میں سے شیخ ابو حامد الاسفرائینی، قاضی ابوطیب طبری، شیخ ابواسحاق شیرازی اور حنابلہ میں ابن حامد البلیلی، ابن الفراء، ابوالمختار ابن الزاغونی اور علماء حنفیہ میں سے شمس الاممہ سرخسی کا فرمان ہے۔ نیز اشعریہ میں اکثر علماء کلام اور ان کے سوا ابواسحاق اسفرائینی اور ابن فورک وغیرہ کا یہی مذہب ہے۔" آخر میں فرماتے ہیں:-

وهو مذهب اهل الحديث قاطبة ومذهب السلف عامة وهو

معني ما ذكره ابن الصلاح استنباط فوافق فيه هؤلاء الائمة

(ص ۸-۹ - طبع مصر)

یعنی "تمام اہل حدیث اور سلف کا بالعموم یہی مذہب ہے اور حافظ ابن الصلاح کے قول کا یہی معنی ہے۔ پس حافظ ابن الصلاح کا قول ان تمام ائمہ کے مطابق ہو گیا۔"  
 ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہم عرض کر رہے ہیں، وہ مولانا مودودی کے اس نازیبا حملے کے خلاف ہے کہ "حدیث کے بارے میں بڑے سے بڑا غلو کرنے والا بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ صحیح بخاری کی ساری احادیث صحیح ہیں۔" ہم سمجھتے ہیں کہ یہ الفاظ نہ صرف یہ کہ علمی پایہ تحقیق سے گھرے ہوئے ہیں بلکہ ائمہ دین، ماہرین علم حدیث اور بزرگان سلف کی تحقیر پر مشتمل ہیں۔ اب آپ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بزرگوں کے اقوال ملاحظہ فرمائیے۔



۴۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں :-

الصحيحان فقد اتفق المحدثون علي ان جميع ما فيهما من المتصل المرفوع صحيح بالقطع وانهما متواتران الي مصنفيهما وانه من هون امرهما فهو مبتدع متبع غير سبيل المومنين (ص ۱۳۲ جلد ۱)

ترجمہ :- صحیحین کی ساری کی ساری روایات متصلہ مرفوعہ پر محدثین کا اجماع ہے اور وہ اس پر متفق ہیں کہ وہ سب کی سب قطعی طور پر صحیح ہیں جو شخص ان کی اس اہمیت کو گرانہ چاہتا ہے - وہ بدعتی ہے - اور اہل ایمان کی راہ سے دُور جا رہا ہے -

۵۔ زمانہ قریب کے مشہور محقق حضرت علامہ سید انور شاہ دیوبندی کا ارشاد 'فیض الباری' میں مذکور ہے کہ :-

”حافظ ابن حجر - علامہ سرخسی حنفی - شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور امام ابن الصلاح وغیرہم محققین کی جماعت کی یہ تحقیق ہے کہ صحیحین کی حدیثیں قطعی الثبوت ہیں“

ان بزرگوں کی آراء کا ذکر کرنے کے بعد علامہ دیوبندی اپنا فیصلہ صادر فرماتے ہیں :-  
ان رائیہم هو الراي دمقدمه فیض الباری ص ۴۵ جلد اول یعنی ان کا فیصلہ ہی صحیح ہے -

۶۔ زمانہ حاضر کے مصری علماء میں سے علامہ احمد شاہ لکھتے ہیں :-

عند اهل العلم الحديث من المحققين ولمن اهتدى هديهم وتبعهم على بصيرة ان احاديث الصحيحين صحيحة كلها ليس في واحد منهما مطعن ولا ضعف (حاشیہ الباعث الخیث ص ۲)

”یعنی محققین علم حدیث اور اصحاب بصیرت کے نزدیک بخاری مسلم کی سب حدیثیں صحیح ہیں اور ان میں کوئی ضعف نہیں ہے“

ہم اس مسئلہ پر اظہار رائے کے لئے اس بنا پر مجبور ہوئے ہیں کہ - صحیح بخاری کے باب میں اُمتِ مسلمہ کے احساسات نہایت نازک ہیں، اور مولانا مودودی صاحب ایسے ذمہ دار محض کا جلسہ عام میں اس کو غیر ذمہ دارانہ طور سے موضوع بنانا قطعی طور پر ناقابل برداشت ہے -



ہیں اگرچہ حدیث کے بارے میں مودودی صاحب کی علمی و فکری کمزوریوں کا احساس ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ اس ضمن میں کن افکار کے حامل ہیں اور اہل سنت سے ان کی راہ کتنی مختلف ہے۔ تاہم حالات کی نزاکت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس باب میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے اور کوئی ایسا اقدام نہ کرتے جس سے کہ ہمارے مشترک مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ لاحق ہوتا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ۔

”یعنی اس وقت جبکہ تمام مکاتیب فکر سے متعلق جماعتوں کا اتحاد عمل میں لانے کی کوششیں ہو رہی ہیں انھوں نے ایک ایسے انداز سے کتب حدیث کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے جس سے منکرین حدیث کے مفاد کو تقویت پہنچتی ہے۔“

اور ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ بڑے سے بڑے منکر حدیث کو بھی یہ جبرارت نہیں ہو سکتی کہ وہ بالکل جلسہ میں یہ کہے کہ:-

”کوئی شریف آدمی بخاری کی ساری احادیث کو صحیح نہیں کہہ سکتا۔“

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝

ہم شاید خاموش رہتے اگر مولانا کی یہ رائے ان کی ذاتی رائے ہوتی۔ لیکن یہ بات انھوں نے جماعت اسلامی کے ایک اجتماع عام میں کہی اور اس میں انھوں نے اپنے نقطہ نظر کو اپنی تصنیفات کے ذریعے سے سمجھنے کے لئے لوگوں سے اپیل کی کہ۔۔۔ وہ ان کے لطیف کا مطالعہ کریں۔

اس لئے مولانا صاحب کی اس تقریر کو جو تہذیب و منانت اور علمی پایہ تحقیق سے گری ہوئی ہے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر واقعی مولانا مودودی صاحب کی یہ ذاتی رائے ہے اور جماعت اسلامی کا اس سے کوئی تعلق نہیں تو کیا جماعت اسلامی میں کوئی ایسا رجل رشید نہیں جو اس غلطی پر مولانا صاحب کو آگاہ کر سکے۔ اور انھیں جبرأت کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ وہ اس قسم کے خیالات کی اشاعت کے لئے جماعت کا پلیٹ فارم استعمال نہ کریں اور نہ ایسے لطیف کو جماعت اسلامی کے لطیف سے تعبیر کریں۔



# جماعت اسلامی کے دین کا خلاصہ

## از صوفی نذیر احمد کاشمیری

راقم نے سال گزشتہ ”حقیقتِ دین“ تجدیدِ دین اور تفرقہ فی الدین کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی اس میں ان تینوں کے فرق کو واضح کیا تھا چونکہ جماعت اسلامی کے بانی نے۔ بنیادِ دین سے اس کے شاخ و برگ تک کو موجودہ دور کے کلی سٹیٹ (TOLITARIAN STATE)

کے نمونے پر مرتب کرنے کی کوشش کی ہے جس کے سبب دین کا ہر جز و اپنا مقام و معنویت کھو کر کچھ سے کچھ ہو گیا ہے، لہذا اس کتاب میں راقم نے اس ہمہ جہتی تحریفِ دین کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے اس پر ضروری تنقید بھی کی تھی، اور اس جماعت اور اس کے بانی کو دعوت دی تھی کہ وہ اس تنقید کی روشنی میں اپنے دین اور اس کی معکوس ترتیب پر غور کریں۔ امید تھی کہ جماعت اسلامی اور اس کے بانی اپنی فکری کجی کا اعتراف کرتے ہوئے اصل دین کو سرِ نو بنا کر قبول کر لیں گے اور دین کی نئی تعمیر کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ جماعت اسلامی کی طرح گزشتہ سو دو برسوں میں متعدد فرقے نے اُمتِ اسلامیہ کے اندر لٹکے ہیں اور انھوں نے اُمت سے باہر ہو کر اپنا اپنا آزاد مقام بنانے کی کوشش کی تھی۔

**اسلام** اسلام سابقہ مذاہب کی طرح، پہیلیوں، ضرب الامثالوں، استعارات، و اشارات و رموز کنایات میں چھپا ہوا مذہب نہیں ہے، جسے ہر بدلے ہوئے ماحول میں نئے نئے شارحین و متکلمین کی ضرورت ہو، جو بدلے ہوئے حالات و ماحول کے مطابق دین کی نئی سے نئی شرح کرتے رہیں۔ مخالفِ دین، ماحول کی ترمیم و تیجہ اور کانٹ چھانٹ کر کے اسے دین کے غیر متبدل اور ابدی اصولوں کے مطابق کرتے رہنا ایک بات ہے اور وہ مسلسل جہاد فی سبیل اللہ کا حصہ ہے وہ تجدیدِ دین کا تسلسل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خود دین کو بدلتے ہوئے ماحول سے مطابق کئے جانے کی کوشش کی جائے، یہ تحریفِ دین کا تسلسلہ ہے۔



اسلام تو دینِ بینات و محکّات ہے جس نے دین کے ایک ایک اصول کو وہ بین صورت دی ہے کہ جو تمام عوام و خواص کو یکساں سمجھ آ سکے۔ حضرت رسول پاک نے اسلام کی اسی حیثیت کو واضح کرنے کے لئے اسلام کو *مِلَّةٌ سَهْلَةٌ سَهْلَةٌ* (سہل و سہل) ایک آسان، یا مروت اور روشن ملت ہے، فرمایا ہے۔ یورپ کے ایک شہرہ آفاق مصنف (سپینگلر) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب *BECLINE OF THE WEST* میں اسلام کی قبولیت عالمگیر کا سبب اس کے اسی صاف ستھرے پن اور عام فہم ہونے کو بتایا ہے، وہ اسلام کو بزرگ و شمشیر پھیلانے کا انکار کرتا ہے۔ پھر رسول پاک نے اسی دین کا جو عملی اسوہ حسنہ قائم کیا ہے اور جس کا ایک ایک حرف اس طرح محفوظ کر دیا گیا ہے کہ اب اس دین کے نئے نئے احوال میں نئی تعبیرات و تشریحات کرنے کی کوئی بھی گنجائش نہیں ہے، اب تو صرف اتباع کا راستہ کھلا ہے۔ ”لَوْ كَانَ مُؤَسَّسِي حَيَاتًا مَّا وَسَعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِي“، موسیٰ بھی اگر زندہ ہوتے تو ان کے لئے میرے اتباع کے سوا کوئی گنجائش نہ ہوتی۔“ (الحديث)، اتباع تو طے شدہ عملی نمونے کا ہوتا ہے۔ وہ غیر متعین المابیت کے پیچھے ٹامک ٹوٹیاں کھانے کا نام نہیں، اتباع طے شدہ راستے پر چلنے کا نام ہے۔

**اجتہاد کی ضرورت اور اس کی حدود** بلاشبہ ہر دور میں معاشرہ انسانی کے لئے نئے نئے معاشرتی و معاشی سوالات پیدا ہوتے رہیں گے اس لئے کہ جس کائنات آب و گل میں ہم اپنا سفر حیات طے کر رہے ہیں وہ مبادیاتِ دین کی طرح غیر متبدل اور ابدی دیرنگ نہیں ہے، وہ تو دُنیا ئے تغیر و انقلاب ہے، لہذا انسانی زندگی کے جس پہلو کا دُنیا ئے تغیر و انقلاب سے تعلق ہے اس پہلو کے سامنے نئے سوالات کا آنا ایک طبعی حقیقت ہے اور ان سوالات کے جوابات مہیا کرنا علمائے ملت کا فرض ہے مگر اس کے یہ معنی نکالنا یا یہ گنجائش پیدا کرنا کہ ان چیزوں اور فروعی نوعیت کے سوالات کے پیش نظر ساری غیر متبدل اساساتِ دین و ایمان کی نئی سے نئی تعبیر و تشریح کی جائے جیسا کہ جماعتِ اسلامی کے بانی کا اندازِ فکر ہے، وہ یکسر باطل ہے جو دین کی غیر متبدل و یقین پرور بنیادوں کو ایک سفسطہ بنا ڈالتا ہے اور یقین و ایمان و اذعان کے سوتوں کو بند کر دیتا ہے۔ سابقہ مذاہب کے ساتھ اہل ہوانے یہی کچھ کیا تھا۔ اور دینِ بینات و محکّات کے ساتھ جماعتِ اسلامی اور اس کے بانی یہی کچھ کر رہے ہیں۔ سابقہ مذاہب میں تو اس کی کسی نہ کسی حد تک گنجائش تھی اس لیے کہ اس کا اندازِ بیان، رموز و کنایات، اشارات و استعارات کا تھا مگر



جب دین حق کو نزات و حکمت کی شکل میں اپنی کامل شکل میں پیش کر دیا اور اس کے عملی اسوہ حسنہ کو خاتم الانبیاء نے اپنے عمل سے بھی معین شکل و صورت دیدی اور اس سب ذخیرے کو ساری شیطانی بددیانتیوں کے مقابل الشریک نے ہمیشہ کے لئے محفوظ بھی کر دیا اور اس کے ساتھ ہی "لا تزال طائفة من امتی ظاہرین علی الحق" سے سبیل کرتے ہوئے بحیثیت عمل متواتر کے بھی اسے محفوظ کر دیا تو اب ہر نئے دور کے لئے پورے دین کی نئی سے نئی تعبیر و تشریح کی گنجائش نکالنا قطعاً اغوائے شیطانی ہے، اھل حق ہے اور تحریف دین ہے، دین حق کو چھپانا ہے۔

جماعت اسلامی کے بانی نے تمام انبیاء کے متفقہ و متحدہ اور غیر متبدل دین کو موجودہ دور کے کلی سٹیٹ کا مترادف بتا کر اور اُمت اسلامیہ

کو ابی و غیر متبدل دین سے ہٹا کر سابقہ امتوں کی طرح اغوائے شیطانی اور "سبیل متفرقہ" پر ڈالنے کی جو کوشش شروع کر رکھی ہے وہ بالکل گمراہ ہے۔ پھر اسی دین کو ایک غیر منقسم کلیت قرار دے کر یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ "اس دین کو یا تو کل کا کل قبول کرنا ہو گا یا کل کا کل رد کرنا ہو گا۔ اس کے علاوہ کوئی تیسری راہ موجود نہیں ہے۔" اور ساتھ ہی اُمت اسلامیہ کو لٹکا کر کھلے اسٹیج پر یہ بھی کہہ دیا ہے کہ دین کی اس مخصوص تعبیر اور صورت کو رد کرنے کا نتیجہ ہو گا کہ اسے الشریک مغضوب یہود کی طرح اپنے عذابِ ذلت و رسوائی کے پیر کر دے گا۔ (ردود جماعت اسلامی حصہ دوم ص ۱۷۱)

مگر مندرجہ صدر تحریفات کے مقابل علمائے سنت و آثار کا متفقہ طریق عمل اُمت کے ظاہر و باطن کی طہارت و پاکیزگی و سادگی کو بحال رکھنے میں ایک موثر کام کرتا رہا ہے، اور ان کی وہی روش برابر جاری ہے۔

کیا توحیدِ خدا، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، ایمان بالآخرت و ایمان بالرسالت و ایمان بالملائکہ اور تمام اخلاقی اقدار آج بھی اسی طرح مشہور و معروف اور سب کو معلوم

نہیں ہیں جس طرح وہ دور رسالت و دور صحابہ و دور تابعین و تبع تابعین میں مشہور و معروف و معلوم تھیں؟ کیا یہ سب کے سب وہ غیر متبدل اصول دین نہیں ہیں جنہیں ہر دور میں نہ صرف علمائے اُمت نے بلکہ خود اُمت نے اجماعی حیثیت سے فرائض مانا ہے اور انشاء اللہ تاقیامت مانا جائے گا حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام بینات و محکمت کا وہ دین ہے جس کے اصول اور ان کا عملی اسوہ حسنہ کبھی بھی خفا میں نہیں رہے گا۔ اگرچہ لاتعداد اہل ہوا و دجالین نے اپنی تشکیک و تذلیل و تحریف سے انہیں چھپانے اور بدل دینے کی اُن تھک کوششیں بھی ہمیشہ جاری رکھیں۔ آج اُمت کی اکثریت مطلقہ دین کے



ہم پر اور دینی حسن عقیدت کے ساتھ جن بدعات میں الجھادی گئی ہے وہ سب کے لئے ایک معلوم حقیقت ہے لیکن وہ بائے عام کے ہوتے ہوئے بھی نوے فیصد ایسے ہوں گے جنہیں نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ و شتر شرک کی فرضیت کا علم نہ ہو، لہذا اس دین تینات و محکمت و فطرت انسانی کی آبیاری کرنے والے دین میں نئے نئے شارحین کی نہ تو ضرورت ہے نہ گنجائش۔ اس کے لئے صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کے اصول و مبادی کی بدابست و وضاحت میں فرق نہ آئے پائے۔ اور اس پر اُمت کو عمل پیرا رکھنے کے لئے ایک صاحب استقامت گروہ ہر وقت موجود ہے۔ "وَلَا تُكُونُوا مِثْلَهُمْ يُدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ"

**مرکزی سوال** اب مرکزی سوال یہ ہے کہ مندرجہ صدر عالم آشکارا حقائق کی موجودگی میں وہ کون سا دین ہے جسے بانی جماعت اسلامی کے سر نو دریافت کر کے اس پر سر نو ایمان کو تازہ کیا تھا اور پھر اس کی تفصیلات معلوم کر کے اور اس پر مطمئن ہونے کے بعد ان کی طرف خود اُمت اسلامیہ کو قبول و رجوع کرنے کی دعوت دی تھی۔ یہ دعوت تو مبارکات دین سے تمسک کی دعوت ہرگز نہ تھی۔ بلکہ اس دعوت نے تمام مبادیات و اصول دین کو اُمت کو قرار داد مقاصد سے خارج کر کے انہیں حکومتِ ناہرہ کے لئے صرف ذرائع کا مقام دیا ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ اگر وہ اصولِ قیام حکومت کے واحد نصب العین سے علیحدہ ہو کر کام کرتے ہیں تو عند اللہ ان کا کوئی اجر نہ ہوگا۔ (تجدید و احیائے دین ص ۱۲) اور وہ جماعت اسلامی حصہ سوم

ان کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ اُمت کے روایتی و نسلی دین میں ان کے لئے کوئی رہنمائی موجود نہ تھی، لہذا انہیں اس روایتی و نسلی ذخیرے کو نظر انداز کر کے دین کو بطور خود دریافت کرنا پڑا۔ اور بہت م مبادیات و اصول دین کے اظہار و بیان اور عالم آشکارا ہونے کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس پر نظر رکھ لی جائے اور بانی جماعت اسلامی کے اس دعوے کو غلط قرار دیا جائے۔

**خاتم الانبیاء کا ایک صاف اعلان** اسلام صرف اسی حیثیت سے دینِ ظاہر

الاصول اور اس کا عملی اسوۂ حسنہ تاریخ دین و مذہب کا محفوظ ترین ریکارڈ ہے بلکہ اس کے عملی تسلسل اور عمل متواتر کے متعلق بھی خاتم الانبیاء نے یہ اعلان کر کے تمام دنیا میں مدلیں و مفرقین اور متشککین کا راستہ بند کر دیا ہے کہ "لا حول ولا قوة الا باللہ العلیّ العزیز"



لايضراهم من خضالهم“ دیری اُمت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم و ثابت رہے گا۔ (الحديث)  
 مد لا يجتمع اُمتی علی الضلالة“ میری اُمت کبھی گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔“ (الحديث)  
 دین کا سب اصولی ریکارڈ اور اس کا سارا عملی اسوہ حسنہ محفوظ اور اسے لے کر چلنے والا ظاہرین  
 علی الحق گروہ موجود، اس کے تمام اصول و مبادیات سورج چاند کی طرح روشن۔ ان سب حقائق کی  
 موجودگی میں کسی شخص کا اعلان کرنا کہ اسے نسلی و روایتی دین میں حق کا کوئی پتہ نہیں چلا، لہذا اُس  
 نے بطور خود کتاب و سنت کو سامنے رکھ کر دین کو دریافت کیا اور اسی دین کی طرف دوسروں کو دعوت دینے  
 کا آغاز کیا، سوائے اغوائے ابلیس کے اور کیا ہو سکتا ہے؟

یہاں پر بانی جماعت اسلامی کا ایک دوسرا بیان  
بانی جماعت اسلامی کا کھلا اعلان نقل کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کے بطلان کے متعلق

کسی شک کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ ”اس موقع پر میں نہایت وضاحت کے ساتھ ایک بات کہہ دینا  
 چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس قسم کی دعوت کا، جیسے ہماری دعوت ہے، کسی مسلمان قوم میں اُٹھنا  
 اس کو ایک بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیتا ہے جب تک حق کے بعض منتشر اجزاء باطل کی آمیزش  
 کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ایک مسلمان قوم کے لئے اسے قبول نہ کرنے اور اس کا ساتھ نہ دینے کا  
 ایک معقول عذر موجود رہتا ہے اور اس کا عذر قبول ہوتا رہتا ہے، مگر جب پورا حق بے نقاب ہو کر اپنی  
 خالص صورت میں اس کے سامنے رکھ دیا جائے اور اس کی طرف اسلام کا دعویٰ رکھنے والی قوم کو دعوت  
 دی جائے تو اس کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا تو اس کا ساتھ دے اور اس خدمت کو انجام دینے کے  
 لئے کھڑی ہو جائے جو اُمت مسلمہ کی پیدائش کی ایک ہی غرض ہے، یا نہیں تو اسے رد کر کے وہی پور  
 اختیار کرے جو اس سے پہلے یہود قوم اختیار کر چکی ہے۔ اس صورت میں ان دو راہوں کے سوائے  
 کسی تیسری راہ کی گنجائش اس کے لئے باقی نہیں رہتی۔“ (ردود جماعت اسلامی حصہ دوم ص ۷۱)

ضروری بات بانی جماعت اسلامی کے اس بیان میں جس چیز کو واضح کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ  
 آج تک اسلامی دعوتیں چونکہ حق و باطل کی آمیزش کو لیکر چلتی تھیں لہذا اُمت مسلمہ  
 انھیں رد کرنے کے باعث عند اللہ ماخوذ ہونے سے بچ جاتی تھی لیکن بانی جماعت اسلامی نے حق  
 کو اس طرح بے نقاب کر دیا ہے کہ اسے دین خالص کے سوائے کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا  
 لہذا اگر اسے اُمت مسلمہ رد کرتی ہے تو اس کا انجام یہود کی طرح ہوگا۔ اس بیان کے بعد چند سطور



ایسی لکھی ہیں کہ جن سے وہ اپنی پیشین گوئی کو جھوٹا ہونے سے بچاتے محسوس ہوتے ہیں مگر پھر پوری تعلی کے ساتھ وہ ذیل کا توضیحی اضافہ کرتے ہیں: ”اب چونکہ یہ دعوت ہندوستان میں اٹھ چکی ہے اس لئے ہندی مسلمانوں کے لئے آزمائش کا وہ خطرناک لمحہ آئی گیا ہے دوسرے ممالک کے مسلمان تو ہم ان تک اپنی دعوت کو پہنچانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اگر ہمیں اس کوشش میں کامیابی ہو گئی تو جہاں جہاں یہ پہنچے گی تو وہاں کے مسلمان بھی اس آزمائش پڑ جائیں گے۔“ (ردودِ جماعت اسلامی حصہ دوم ص ۱۸)

یہ حضرت دینِ بینات و محکمات کو اس کے عالم آشکارا اُسوۂ حسنہ کو اور سارے اصول و مبادی کو نظر انداز کرتے ہوئے انھیں مبہم اور بے معنی قرار دیتے ہوئے اپنے باطل مزعوامات کو اُمتِ مشککہ کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ وہ یا تو اسے قبول کرے یا مغمضوب یہود کے گھڑے میں عذابِ الہی کے انتظار میں کھڑی ہو جائے اس کے لئے ان دُوراہوں کے سوائے اور کوئی راستہ کھلا نہیں ہے۔

اب راقم اس خانہ ساز دین کے بانی اور اس کی اُمت کے سامنے اس دعوے کا جواب دیکھو پیش کرتا ہے اور وہ یہ ہے۔ ان الذین فتنوا المؤمنین والمؤمنات ثم لا يتوبوا فلهم عذاب جہنم ولهم عذاب اب الحریق ”جن لوگوں نے مومنین و مومنات کو آزمائش میں ڈالا پھر وہ اس سے تائب نہ ہوئے ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے، جلانے والا عذاب ہے۔“

جسے قرآن مجید نے بیان کر دیا ہے جس خدائے واحد نے دینِ حق کے تمام اصول و مبادی کو ہمیشہ کے لئے خود محفوظ کر دیا اور تاقیامت اسے عملِ طور پر زندہ رکھنے اور چلانے کے لئے ایک ”ظاہرین علی الحق“ گروہ کو بھی معین کر دیا ہے۔ اس سب سلسلے کو نسلی و روایتی دین قرار دیکر ایک طرف پھینک دینا اور بطور خود دین کے نام پر کچھ تحیلات و اہیمہ جمع کر کے ان کی طرف اُمت کو اور عالمِ انسانی کو دعوت دینا رسول کی مخالفت اور غیر سبیل المومنین کے اتباع کے علاوہ کیا ہے جس طرح تو نے اپنے خود ساختہ بطلان کو دینِ خالص کا نام دیکر اور اس کی دعوت دیکر اپنی حجت و اجفہ کو بخیاں خود پور کیا تھا اب تیرے سامنے دینِ بینات و محکمات کے سارے عالم آشکارا اصولوں کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے اللہ پاک کی حجت بالغہ کو پورا کیا جاتا ہے، لہذا اٹھ اور سنتِ آبا کے مطابق ”رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ“ اور لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ مُسَبِّحُكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ”کہتا ہوا اور خود ساختہ بطلان سے تائب ہوتا ہوا اصل دین ظاہر و باہر سارے علماء و صلحا بلکہ کل اُمت کے نزدیک مسلم دین سے تمسک کر بلا شک و شبہ



اُمت کے عمل میں اس دین سے تمسک کے بارے میں نہایت درجہ ضعف و اضمحلال پیدا ہوا ہے اور اس کا علاج صرف یہ ہے کہ تمام مسلمات دین و ملت پر اُمتِ اسلامیہ کو عمل پیرا کرنے کی صورت کی جائے نیز کہ دین کے نام پر کچھ نئی قسم کی پہیلیاں، استعارات و رموز و کنایات گھڑ لی جائیں اور وقتاً فوقتاً ان کی نئی سے نئی تشریحات کی جائیں اور مغالطات کا ایک اٹوٹ سماں باندھ دیا جائے۔ اور اس کا نام اُصل و حقیقی و بے نقاب دین رکھا جائے۔

کئی سال پہلے کا واقعہ ہے کہ میں نے PLATOS, CRITRIM OF LIFE ایک واقعہ نام کی ایک کتاب پڑھی تھی۔ کتاب کے مصنف کا دعویٰ تھا کہ افلاطون الہی ساری انسانیت کا ہمیشہ کے لئے رہنما ہے مگر ضرورت اس کی ہے کہ ہر دور میں اس کی فکر کی رُوح کو سمجھ کر اس کی نئی تعبیر کر دی جائے، جماعتِ اسلامی کے بانی کا اسلام کے متعلق بھی ایسا ہی خیال معلوم ہوتا ہے، ان کا دعویٰ تو یہ ہے کہ اسلام جوں کا توں قائم کرنا چاہتے ہیں مگر ان کا عمل — یہ ہے کہ وہ اس کے سارے حقائق ثابتہ پر ایک دبیر پردہ ڈال کر اس کی ایسی تشریح کرتے ہیں کہ وہ سب تخیلاتِ فاسدہ کا ایک ذخیرہ محسوس ہوتا ہے۔ پھر جس قدر اس سے کسی کا رابطہ بچتے ہوئے جاتا ہے اسی قدر وہ بینات و محکاتِ دین سے بے ذوق ہوتا جاتا ہے اور اُسے ہونا ہی چاہیے، اس لئے کہ اب یہ بینات و محکات و ناقابلِ تغیر دینی اصول ان کی کتابِ دین میں قراردادِ مقاصد سے خارج ہو کر ذرائعِ دورِ سائل کے خزانے میں چست کئے گئے ہیں۔

ع۔ بود صاحب خانہ مامیہماں نامید ہش

وہ تھا تو مالکِ مکانِ مگر میں نے اُسے میہماں کی حیثیت دے دی۔

قادیانیت کا خروج قادیانی صاحب کا اُمت و دین سے خروج اس وقت مکمل ہوا جب کہ ان کے خلیفہ دہم نے ۱۹۱۳ء میں جماعت کا ایک اجلاسِ عام کر کے یہ اعلان کیا کہ جو شخص مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوے کو بلا تاویل قبول نہیں کرتا وہ دینِ اسلام کے دائرہ سے خارج قادیانی ٹولے کے اس دعوے کے بعد تو ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ محمد رسول اللہؐ اور ان کے صحابہؓ تو نعوذ باللہ محض مقدمۃ الجیش کی حیثیت رکھتے تھے اور مرکزِ رسالت بعد میں قائم ہونے والا تھا اور وہ مرزا غلام احمد قادیانی تھا:

منم مسیح زماں و منم کلیم خدا منم محمد و احمد کہ مجتبیٰ باشد دلفوظ مرزا غلام احمد قادیانی



اس موقع پر مجھے اسی سلسلہ کا ایک واقعہ یاد آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اسلام کے عمرانی نظام "پر علی گڑھ محمد بن کالج میں لیکچر دیتے ہوئے یہ اظہار کیا تھا کہ اگر آج کوئی فرقہ اسلام کی موثر خدمت کر رہا ہے تو وہ قادیانی فرقہ ہے۔" پھر جب اس فرقہ کی مقتولین طاہرہ بیوی گئیں تو پھر یہی ملت پرورشاعر تھا جس نے پورے بیس برس بعد ۱۹۳۳ء میں قادیانیت کو خارج از اسلام قرار دینے کی مہم چلائی اور الشریاک نے اسے اس مہم میں کامیاب کیا۔

**افادیت** خارجی افادیت ہر وقت اور ہر ماحول میں بدلتے رہنے والا ایک سایہ ہے جسے وہ کسی صورت دین کے غیر متبدل اور ابدی اصولوں کی طرح بنائے دعوت ہرگز نہیں بنایا جاسکتا اور اگر کسی گروہ نے یہ حرکت کی تو وہ فوراً دین کے دائرے سے باہر ہو کر جبل و تلیس کے دائرے میں داخل ہو گیا لہذا اس افادیت کو بنائے دعوت بنانا حرام ہے۔

بنائے دعوت تو صرف غیر متبدل محکمت و بینات و اصول دین ہیں۔ یہی وہ ابدی بنیادیں ہیں جن کی طرف ہر ماحول اور ہر زمانے میں دعوت دیتے رہنا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی کل حقیقت ہے۔ وہ بنیاد و اساس دین کو ہر دم طاقت پہنچاتی ہے، اسے مستحکم و پائیدار رکھتی ہے اور اسی مشن کے لئے ہر فرد مسلم اپنی اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق مامور من الشریعہ۔ گنتہ خیر امتہ اخراجت للناس تأمرهم بالمعروف و تنہون عن المنکر۔ تم سب امتوں سے بہتر امت ہو تمہیں کائنات انسانی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر تمہارا واحد مشن ہے۔

اب اپنی قوت فیصلہ کو بحال کرتے ہوئے تمام علمائے قوم اور صلحائے امت کو فیصلہ کرنا پڑیگا کہ جماعت اسلامی اور ان کے بانی مسلمات دین اور وحدت دین و امت کے داعی ہیں یا وہ ملت کے اندر رنگ رنگ کے تفرقے کو رائج کرنے والا ایک نیا بدعتی ٹولہ ہے جو ہر نئے محاذ پر نیا رنگ و روپ اختیار کرتا ہوا اوہام و شکوک و تفرقہ فی الدین کی مہم میں مشغول ہے۔

”مثل کلمۃ خبیثۃ کشجۃ خبیثۃ اجتثت من فوق الارض ما لہا من قرار یشیت اللہ الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا و فی الآخرۃ و یصل اللہ الظالمین و یفعل اللہ ما یشاء۔“ دیکھتے ہیں کہ کلمہ خبیثہ کی مثال اس شجرہ خبیثہ کی مثال ہے جو زمین کے اوپر اوپر دکھائی دیتا رہتا ہے جس کی پائیدار بنیاد نہیں ہے، الشریاک مومنوں کو پائیدار قول (غیر متبدل اصول و مبادی دین) سے دنیا میں اور عاقبت میں ثابت قدم رکھتا ہے، اور ظالموں کو



گمراہ کرتا ہے، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ”لاتزال طائفة من امتی ظاہرین علی الحق لایضمہ من خذلہم“ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر ثابت قدم رہے گا۔

”اسلام کی ساری روح خدائے واحد القہار کی حاکمیت ہے۔“ (تجدید و احیاء دین ص ۳) یہ اعتقاد قطعاً موجودہ دور کی کلی ریاست کا جریہ ہے جسے دین

سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ سارا تصور یورپ کے اپنے سب اجتماعی کاروبار کو لادینیت کی بنیاد پر چلانے سے ابھرا ہے، یورپ کا یہ لادینی تصور ریاست جو ریاست کی قاہریت پر مبنی ہے۔ دین و دنیا کی کلی نفی پر مبنی ہے۔ وہ آج تک کی تاریخ انسانی میں لاشریک لادینیت کا کامل ترین مظہر ہے اور موجودہ دور کے اس لادینیت کے مظہر کامل یعنی کلی ریاست کو جماعت اسلامی کے بانی نے دین کا مترادف

قرار دیکر اس کے لئے ایک شریعت کاملہ گھڑی ہے اس میں اس نے کتاب دین کے پرسنل لاکے بعض اجزاء کو بھی شامل کر لیا ہے تاکہ دین و مذہب کے ماننے والوں کو وہ باور کر سکے مگر حقیقت میں وہ ریاست کی قاہریت کا پجاری ہے اس نے موجودہ دور کی ریاست قاہرہ کو دین کا مترادف قرار دیکر اور اپنے من گھڑت اسلام کی روح خدائے واحد القہار کی حاکمیت کو اعلان کرنے کے بعد بنی نوع انسان کی تاریخ سے انقطاع کرتے ہوئے موجودہ دور کے ملاحدہ مفکرین کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے، اس نے اپنی کتاب تجدید و احیائے دین میں جس مقام پر موجودہ یورپ کے ملحد مفکرین کا ذکر کیا ہے اور دو درجن ملحد کے نام لیکر بتایا ہے کہ انھوں نے کس طرح مختلف مکاتب فکر کو جنم دے کر دنیا کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

وہاں وہ یاس و قنوطیت کا مجسمہ بن کر یہ بات کہتا ہے کہ یہ کام مسلم اقوام سے نہ ہو سکا اور وہ ناکامی کے گڑھے میں گر گئے۔ اور اب وہ یہی خدمت انجام دینے کی فکر کر رہا ہے اور اس کی تیاری کرنے کے لئے اس نے سارے کے سارے مبادیات و اصول دین کے تمام حقیقی معانی کو بدل دیا ہے، اس لئے کہ جب تک مسلم اقوام یورپ کے ملحدین کی طرح اپنی اساس فکر کو انہیں بدلیں تب تک وہ کسی صورت غیر مسلم اقوام عالم پر اپنی فوقیت قائم نہیں کر سکتیں۔ اس لئے یہ کہنا حق ہے کہ اس نے طریق انبیاء پر کام کرنے کا جو پیرا پاگندہ کیا ہے وہ یکسر فریب ہے حقیقت میں اس کے ماڈل آزاد و ملحد مفکرین ہیں، جنھوں نے مختلف پہلوؤں سے کائنات کو ایک منطقیانہ نظام کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ راقم علمائے امت کو اس

گو رکھ دھند سے میں ہرگز الجھانا نہیں چاہتا ہے یہ بات — دینی مقصد کے خلاف ہوگی۔ مگر ہر دینی طالب علم سے یہ درخواست کرتا ہے کہ وہ اس شخص کی دو باتوں کو زیر کرے۔ ایک یہ کہ دین کا لفظ اپنے حقیقی معنی میں موجودہ دور کے کلی و قاہرانہ ریاست کے ہم معنی ہے۔ دوسری یہ کہ اس کے نزدیک



اسلام کی ساری روح خدائے واحد القہار کی حاکمیت ہے۔ گویا اس کے واحد القہار خدا نے نوع انسان کے لئے جو دین مقرر کیا ہے وہ ریاستِ قاصرہ ہے، آگے چل کر جو تہذیب و تمدن اور جو معاشرہ جنم لے گا وہ تہذیبِ تمدن اور معاشرے میں قہرِ خداوندی کا مظہر ہوگا۔ اس نظامِ فکر کے ماتحت وہ اور کچھ ہو نہیں سکتا۔

**سُنّت و بدعت کا امتیاز** | جس بات نے تیرہ سو برس سے زیادہ عرصے کی روحانی سُنّت کو کاملہ خاتم الانبیاء کی تابانی و سادگی و عام فہمی کو بحال رکھا ہے وہ حضرت سرورِ کائنات کا ذیل کا اعلانِ عام ہے جسے آج بھی تمام مساجد و مناہر سے ایک اجتماعی عمل کی حیثیت سے دہرایا جاتا ہے: **الا ان خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الہدی ہدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم** وشر الامور محدثاتہا۔ کل محدثہ بدعة وکل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار۔

اس خطبہِ مسنونہ نے تمام خیر و فلاح کو کتاب اللہ اور اسوۂ محمد رسول اللہ میں اثباتی رنگ میں جمع کرتے ہوئے سب شر و فساد کو دین کے نام پر نئی نئی پیدا ہونے والی رسوم میں محدود کر دیا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جس وقت بھی علمائے ملتِ اسلامیہ حضرت خاتم الانبیاء کی ان معین کردہ حدودِ دین کو پوری ذمہ داری سے تسلیم کرتے ہوئے اُمتِ عالمگیر کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا وہ دن وحدتِ ملتِ اسلامیہ سے گذر کر عالمگیر اتحادِ انسانی کا کامیاب آغاز ہوگا۔

۱۹۷۱ء کے پاکستانی الیکشن میں جماعتِ اسلامی کی شکست کے بعد بانی جماعتِ اسلامی نے اپنی شکست کی یہ توجیہ پیش کی کہ

عین الیکشن کے دوران علماء و مشائخ نے جماعت پر یہ اتہام و بہتان باندھا اور اسے عوام کے سامنے پیش کیا کہ دیکھو اگر یہ جماعت کامیاب ہو گئی تو پھر وہ نجد و حجاز کے وہابیوں کی طرح تیجے، چوتھے، عرس و قوٹلی و شبِ برات و شبِ معراج کی ساری رسوم کو ختم کر دے گی۔ اونچی قبروں کو اور قبوتوں کو مسمار کر دیں جماعتِ اسلامی کے بانی کا یہ اعلان تھا کہ یہ سب باتیں جماعت پر ایک بہتان تھا، انھوں نے مزید انکشاف یہ بھی کیا کہ ان کی جماعت میں اہلِ بدعت و اہلِ سُنّت و آثارِ سمجھی قسم کے لوگ ہیں اور ان پر یہ شرط لاگو ہے کہ جماعت کے اندر داخل ہونے کے بعد بدعت و سُنّت قسم کے مسائل میں ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کر سکتے۔ وہ بجائے خود اپنے اپنے مسلک پر عمل کرنے پر آمادہ ہوں گے، مگر وہ



انہام و فقہیم کے ذریعے ایک دوسرے کو ہم خیال کرنے کا حق نہیں رکھتے۔

حقیقت میں یہ پابندی اہل سنت و آثار پر تھی کہ دیکھو اب وقت آگیا ہے کہ سنت و بدعت کے امتیاز کو ایک طرف کرتے ہوئے اقتدار حکومت پر قبضہ کیا جائے اس لئے کہ دین کی کل غرض صرف یہی ہے جو کہ یہ ٹولہ دین کو ریاست کے ہم معنی قرار دے چکا تھا لہذا جماعت اسلامی کے بانی کا یہ اعلان عین اس کے مطابق تھا ان لوگوں کے دین کو قہار ریاست کے ہم معنی قرار دینے میں آپ کذاب کہہ سکتے ہیں اور یہ صحیح بھی ہے اس لئے کہ تمام انبیاء و صدیقین و شہداء و صالحین میں سے کہ سے کم سو میں سے شانوسے کو ہمہ گیر ریاست تو کیا مطلق ریاست قائم کرنے کا موقعہ بھی نہیں ملا لہذا جامع ریاست کو دین کا ہم معنی بتانا ان تمام انبیاء و صدیقین و شہداء و صالحین کو حقیقی مقصد کے حصول میں ناکام ترین گروہ قرار دینے کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہتا لہذا جو گروہ دین کی کل غایت سیاسی اقتدار اعلیٰ کا حصول بتاتا ہے اسے کذابوں کا گروہ قرار دینے کے سوائے کوئی چارہ نہیں ہے لیکن اگر آپ انھیں اصل مقصد میں صحیح مان لیں تو پھر وہ اس مقصد کے حصول کے لئے دین کے سارے مسئلہ شعائر کے ساتھ جو سلوک و تفاوتا ضروری سمجھیں کر سکتے ہیں۔

**ایک مثال** وہ حقیقت میں موجودہ مادی تہذیب کے سب تغیرات و تضادوں کا مجموعہ ہیں موجودہ مادی تہذیب جس کا سب سے کامل مظہر موجودہ دور کی ہمہ گیر ریاست ہے اور جسے بانی جماعت اسلامی ”الذین الکامل“ کا مظہر اتم قرار دے کر ساری کتاب دین کی تشریح اس مفروضے کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ ماضی کی باطنیت آفریدہ تہذیبوں کا مکمل تاریخی رد عمل ہے باطنیہ تہذیبوں کی نمایاں ترین خصوصیت جمود و زمین گیری تھی تو موجودہ مادی تہذیب کی خصوصیت حرکت مسلسل اور آسمان پر دازی ہے۔

۳ شکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں اس تہذیب کی کوئی پائدار اساس نہیں ہے اس کا مذہب تجدد (MODERNITY) ہے اسے سیاسی زبان میں رنگ بدلی، دل بدلی اور موقعہ پرستی کہا جاتا ہے اور ہمارے ہاں اس کے ماہر خصوصی بانی جماعت اسلامی اور ان کی جماعت ہے اور چونکہ وہ یہ ڈرامہ مذہب کی سر زمین پر سٹیج کر رہے ہیں اور دین و مذہب کی ساری بنیاد وہ اخلاقی اور روحانی قدریں ہیں جو پائیدار وابدی ہیں لہذا پھٹکار، رسوائی، ناکامی ان کا مقدر ہے اور ہو گا اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔



وَأَقَرَّ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔ اے نبی اپنی پوری ہستی کو پوری سکونتی کے ساتھ دین کی طرف متوجہ کر دے یہ وہ فطرتِ انسانی ہے جس پر اللہ پاک نے انسانوں کو پیدا کیا ہے جو ناقابلِ تغیر ہے اور جو تنہا دینِ قیّم ہے مگر اسے بہت سے لوگ رسا رہے منطقی، سارے فلسفی اور سارے وہ اُنناد مفکرین اس میں شامل ہیں جن کی گرفت اخلاقی و روحانی غیر متبدل اقدار پر نہیں ہے، نہیں جانتے، نسا انسان کے بانی یہی ائمہ ضلالت ہیں۔

بانی جماعتِ اسلامی نے اپنی کتاب ”تجدید و احیائے دین“ میں ان محدّ مفکرین کا نام لے لے کر جہاں ان کا ذکر کیا ہے وہاں وہ ایک یاس و قنوطیت زدہ انداز میں چلا اٹھے ہیں کہ یہی آزاد و مکاتبِ فکر کا ابھرنا مغرب کی ساری کامیابیوں کی بنیاد تھی اور افسوس کہ یہی کام مسلمانوں سے نہ ہو سکا۔ انسانی معاشرے کی پائیدار بنیادوں کا انکار کر کے یا انھیں نظر انداز کر کے گزشتہ چند صدیوں میں یورپ میں جو فکری و ملی حرکت پیدا ہوئی ہے موجودہ مغربی تہذیب اسی کا نتیجہ ہے اس کا سرِ پاؤں سے اور دماغِ دل سے ہر وقت ایک تصادم کی حالت میں رہتا ہے یہ بے بنیادی اور یہ تصادم مسلسل اُسے کسی وقت بھی پیوندز کر سکتا ہے۔ جماعتِ اسلامی کے بانی نے اسی بے بنیاد اور ہر وقت ایک مسلسل تغیر میں رہنے والی تہذیب کی دینی تعبیر کی ہے اور سر سے پاؤں تک وہ بدترین نفاق کا مجسمہ بن گئے ہیں۔

بلاشبہ بانی جماعتِ اسلامی کی تحریرات میں بھی نماز، روزے، زکوٰۃ و حج وغیرہ کا بار بار ذکر آتا ہے مگر ان کے نظامِ فکر میں ان چیزوں کو قراردادِ مقاصد کی فہرست میں نہیں بلکہ ذرائعِ دین کی فہرست میں جگہ دی گئی۔ ان کے ہاں نماز کی صرف یہ حیثیت ہے کہ وہ اس سکون و سکونتی کو پیدا کرتی ہے جس سے قیامِ حکومت میں مدد ملتی ہے (اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوئی ص ۲)۔ اگر ان مرکزی شعائرِ دین کا جو جماعت کے دین میں صرف ذرائع کی فہرست میں دیئے گئے ہیں، قیامِ حکومت کی کشمکش سے شعوری تعلق نہیں ہے تو عند اللہ ان کا کوئی اجر نہیں ہے۔ (رودادِ جماعتِ اسلامی حصہ سوم)

**بنیادی کجی** | جماعتِ اسلامی کے بانی کی بنیادی کج فکری و اتحادیہ ہے کہ انھوں نے دین کو کلی سیاست کا مترادف قرار دیکر باقی سب اصول و مبادیات و شعائرِ دین کی قدر و قیمت اسی دین کی روشنی میں مقرر کی ہے اور تمام حقیقی مقاصد کو ذرائع کا اور ذرائع کو مقصد کا درجہ دیکر ساری کتابِ دین کے شیرازے کو ادھیڑ کر اس کے اوراق کو منتشر کر دیا ہے۔



## ریاست

ریاست کو کتاب دین میں اگر کوئی حیثیت حاصل ہے تو وہ صرف اس قدر ہے کہ وہ دینی معاشرے کے لئے ایک خارجی شہر بنیاد و تفصیل ہے۔ تاریخ میں ہزاروں بلکہ لاکھوں انبیاء و صدیقین، شہداء و صالحین ایسے گزرے ہیں جنہیں یہ شہر بنیاد بنانے کا موقع ہی نہیں آیا، اس کے باوجود وہ انسانی معاشرے کے لاریب مصلحین قرار پائے ہیں۔ دنیا میں لاکھوں جبارین و قہارین ایسے گزرے ہیں کہ انہوں نے بڑی بڑی قہار و منظم ریاستوں کو قائم کیا ہے مگر انہیں کسی صورت مصلحین انسانیت میں شمار کرنے کا کوئی امکان نہیں، لہذا اگر ریاست دین کا مرکزی جزو ہوتی تو نعوذ باللہ انبیاء و صدیقین کو تو تاریخ کے ناکام افراد اور جبارین تاریخ کو کامیاب گروہ قرار دیا جاتا، لہذا فی الجملہ قسم کی ریاست کو دین کے ذرائع بعیدہ میں شمار کرنے کی تو گنجائش ہے مگر اسے مرکز دین یا کل دین قرار دینا جیسا کہ عجم اسلامی کے بانی نے کیا ہے اور جیسا کہ ان کے اس ذاتی دریافت کردہ دین کو تسلیم کرنے والی جماعت کریم ہے قطعاً بے دینی ہے۔ اور اسے طریق انبیاء بتانا ایک فریب ہے۔ وہ دین و حیات طیبہ کے نام پر اُمت کو اور انسانیت کو ایک ہلاکت انگیز سراب میں لے جا رہے ہیں وہ سہل و سادہ روشن اور تمام عام و خواص کو سمجھ آ جانے والے دین کو ایک چیتاں خیال بنا کر تاریخ دین کے ساتھ ایک غظیم عیاں غداری کر رہے ہیں۔ وہ صحابہ تابعین و تبع تابعین و تمام مسلمات صالحین کو نظر انداز کرتے ہوئے دین کو لفظی کج بحثیوں کے ذریعے پھر سے جھلٹے عرب سے مربوط کر رہے ہیں اور دوسری طرف سنت و بدعت کے امتیاز کو ختم کر کے تاریخ کی سب مشرکانہ رسوم و بدعات کو زندہ کر رہے ہیں۔ وہ یہ اعلان کر کے کہ دین ایک ناقابل تقسیم کل ہے جسے یا تو سب کا سب لینا ہو گا یا سب کا سب رد کرنا ہو گا۔ مبلغین حق کی راہنہی کر رہے ہیں اور ”يَلْعَوْنَ عَنِّي وَلَوْ اِيَةً“ اور ”فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ“ کی تکذیب کر رہے ہیں۔

اب اس موقع پر میں بانی جماعت اسلامی کے ابتدائی دعوے کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک وقت تھا کہ وہ خود بھی نسلی اور روایتی دین پر عمل پیرا تھے۔ پھر جب ہوش آیا تو انہیں محسوس ہوا کہ یہ تو آباد اجداد کی رسوم کی نقالی ہے، اس کے بعد انہوں نے بطور خود کتاب سنت پر غور شروع کیا اور دین کی حقیقت کو دریافت کیا۔ اس پر خود ایمان لائے اور پھر دین کے تفصیلی نظام کو سمجھا اور جب وہ اس حیثیت سے بھی مطمئن ہو گئے تو پھر انہوں نے اپنے خود دریافت کردہ دینی نظام کی طرف دوسروں کو بھی دعوت دینے کا آغاز کیا۔



## محض جھوٹ اور افتراء

یہ محض جھوٹ و افتراء ہے کہ روایتی و نسلی دین میں رسوم آبار کی بھر  
ایمان باللہ، ایمان بالکتاب اور نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج اور تمام اخلاقی اصول و اقدار اُس وقت میں پیدا  
ہی جانی پہچانی ہوئی حقیقتیں تھیں جس طرح وہ زمانہ رسالت و زمانہ صحابہ و تابعین و تبع تابعین میں تھیں  
اور اس کا ایک ایک حرف محفوظ تھا۔ رہا علی تسلسل دین تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ تاقیامت صالحین  
امت کے ذریعہ جاری رہے گا۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا ہے اور پورے تو اتر کے ساتھ وہ محفوظ ہے  
کہ ”لا تزل طائفتہ من امتی ظاہرین علی الحق۔ لا یضرمہم من خذلہم۔“ میری امت کا  
ایک گروہ ہمیشہ حق پر پورے ظہور کے ساتھ ثابت قدم رہے گا، ان سے کنارہ کشی کرنے والا کوئی شخص  
اور گروہ انہیں ضرر نہیں پہنچا سکے گا۔“ اُس روایتی حفاظت اور اس علی تسلسل کے ہوتے ہوئے  
کسی کا یہ دعویٰ کہ روایتی و نسلی دین میں اُسے کچھ بھی نہیں ملا کتاب دین و تسلسل دین پر ایک جھوٹی  
تہمت ہے جس سے ہزاروں سے گزر کر لاکھوں کے ایمان متزلزل ہو سکتے ہیں جسے دین کی طرف اپنی  
ہدایت جونی کے لئے توجہ کرنا ہے۔ اس کے لئے تو یہ دین بینات و معروفات کا ایک لاریب مجموعہ ہے  
اور جس کے سامنے ایمان و عملی استواری ہی نہ ہو بلکہ دین کو ایک منطقیانہ نظام کی صورت میں دیکھنا  
اور دکھانا ہو وہ بلاشبہ سنتِ انبیاء کا دشمن ہے اگرچہ وہ اتباعِ انبیاء کے سلوگن کو رات دن دہراتا ہے  
بلکہ وہ اس طرح سچ مچ اتباع کرنے والوں سے لوگوں کی توجہ ہٹا کر اپنے اوہام و خرافات کو ان سے  
منوانا چاہتا ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی میں سامری نے کیا تھا۔ بانی جماعت اسلامی  
ایمان کامل فی الجملہ ایمان اور ایمانِ ضعیف میں، اسلام کامل فی الجملہ اسلام اور کم سے کم اسلام کی  
حدود کو سمہار کر رہا ہو، دین، ایک منطقیانہ کلیت کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور جو لوگ اُسے اس  
باطل معیار پر صحیح اترتے دکھائی نہیں دیتے انہیں بدترین منافق کا لقب دیتا ہے اور انہیں اپنے  
تخیلات سے ہم آہنگ ہونے کی دعوت دیتا ہے اور بصورتِ عدم انہیں مغضوب یہود کا مقام  
دے کر دائرہ دین و امت سے یکسر باہر کر دیتا ہے۔ تاکہ وہ خدا کی حجت کی حیثیت سے بنی نوع انسانی  
کے سامنے شہد آء علی الناس رہے۔



بلی من کسب سیمۃً وَاَحْلَظْتُ بِہِ خَطِیئَتَہٗ فَاَوَّلَئِکَ اَصْحَبُ النَّارِ هُمْ فِہِہَا  
خالدون۔“ بلا شک جس نے ہدی کا کاروبار کیا جہاں تک کہ ہدی نے اس کا احاطہ کر لیا، یہ لوگ  
اصحاب النار میں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

یہ لوگ ریاست کی قاہریت کے خیمہ کے اندر بیٹھ کر بالکل اس اجتماعی منافقت کا کاروبار کرتے  
ہیں جسے میکاوی ازم کے سوانے اور کوئی لفظ پوری طرح ظاہر نہیں کر سکتا۔ اس قاہریت کا اس  
اجتماعی منافقت میں مقام کا حاصل کر لینے کے بعد یہ گروہ رحمت خداوندی سے اُتنا ہی دُور ہو گیا  
جس حد تک بنی نوع انسان کو پہنچانے کا ابلیس لعین نے خدا کے سامنے دعویٰ کیا تھا اور جس کے  
جواب میں اللہ پاک نے اُسے جواب دیا تھا کہ ”میرے بندوں پر تجھے کوئی غلبہ حاصل نہ ہو گا۔“

بانی جماعت اسلامی نے ”اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے“ کے عنوان پر ۱۹۴۱ء میں  
مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک لیکچر دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم لیگ نے کانگریس کے قومیت متحد  
کے اصول کو رد کرتے ہوئے تمام مسلمانان ہند خاص کر ان کے تعلیم یافتہ گروہ کو اپنے جھنڈے تلے  
جمع کر لیا تھا۔ اس سال مسلم لیگ نے قیام پاکستان کو مسلمانان ہند کا واحد نصب العین قرار دیا  
اور بانی جماعت اسلامی مسلمانوں کی اس اجتماعیت سے پریشان تھے۔ وہ نہ معلوم کب سے اسلام  
کے نام پر مسلمانوں میں اپنے افکارِ باطلہ کو رواج دینے کی آس لگاتے بیٹھے تھے اور جب انھوں  
نے یہ دیکھا کہ اسلام کے نام پر مسلمانوں کی ایک مضبوط تنظیم بن گئی ہے تو وہ اسے ختم کرنے پر تیار  
ہو گئے۔ ان کا کھلا اعلان تھا کہ اگر ایسا کوئی ملک بن گیا تو وہ اسلام کے لئے کفار کی حکومت سے زیادہ  
مضر ہو گا۔ (اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے) ص ۲۵-۲۶

اس لیکچر میں انھوں نے اعلان کر دیا کہ اسلامی حکومت صرف طریقِ انبیاء پر قائم ہوتی ہے  
اور ساتھ ہی حضرت خاتم الانبیاء کی کئی زندگی کا خلاصہ دیتے ہوئے مرنی زندگی کو بطور منطقی نتیجے  
کے پیش کر دیا اور کہا کہ یہ ہے حکومتِ اسلامی کے قیام کی واحد راہ۔

اس نے اس بات کی طرف اشارہ تک نہیں کیا کہ ایک نبی ایک فلاسفر کی طرح کوئی  
**نرالی منطق** طے شدہ منصوبہ سامنے نہیں رکھتا بلکہ اللہ پاک بلا اس کی تمنا اور کوشش کے  
اُسے بطور خود دُنیا کے سامنے اپنا پیغام پہنچانے کے لئے منتخب کرتا ہے اور اس کے مخاطبین کو حکم بتا  
ہے کہ وہ اس کی شخصی سماعت و اطاعت کریں۔ اس شخصی سماعت و اطاعت سے ایک اُمت



وجود میں آتی ہے لیکن اُمتوں کے دوسرے درجہ کے مصلحین و مجددین کے لئے تاسیس اُمت کا یہ حصہ ہرگز مجاز نہیں۔ وہ اپنی سماعت و اطاعت کی دعوت دینے کے ہرگز مجاز نہیں ہوتے۔ وہ اُمت سازی کرنے کے ہرگز مجاز نہیں ہوتے۔ وہ زیادہ سے زیادہ تجدید اُمت کرنے کے مجاز ہیں۔

اُمتِ اسلامی کے مجددِ اوّل حضرت عمر بن عبد العزیزؓ نے یہی کیا کہ صالحین اُمت کے مشورے سے معاشرۂ اسلامی کو پھر وہ صورت دینے کی کامیاب کوشش کی جو صورت خلافتِ راشدہ کے زمانے سے حاصل تھی۔ اس میں وہ جس قدر کامیاب ہوئے اس کی مثال مشکل ہی سے تاریخ میں ملے گی۔

لیکن بانیِ جماعتِ اسلامی نے اسی لیکچر میں حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کو ایک خطا کا فرد قرار دیکر انہیں ایک ناکام انسان بتایا۔ خطا کار کا لفظ استعمال کرنے سے اس نے اجتناب کیا۔ صرف انہیں ایک ناکام انسان بتایا، حالانکہ بحیثیت ایک حکمران کے اڑھائی برس کے عرصے میں انہوں نے جو کامیابی حاصل کی اس کی کوئی مثال تاریخ کے اوراق میں موجود نہیں ہے لہذا انہیں ناکام کہنا تو محض ایک غلط بیانی ہے لیکن بانیِ جماعتِ اسلامی یہ کہنا چاہتے تھے کہ عمر بن عبد العزیزؓ غلط کار آدمی تھے اس لئے کہ انہوں نے تاسیس اُمت کے حصے میں حضرت خاتم الانبیاءؐ کی کئی زندگی کا اتباع نہیں کیا۔

یہ صاحبِ فرطِ غضب و تحاسد میں تاریخ کی مسلمہ صداقتوں کا انکار کر رہے تھے اور اس طرح وہ غیر نبی افراد کے لئے شخصی سماعت و اطاعت کو اختیار کرتے ہوئے تفرقہ اُمت و دین کی راہ کھول رہے تھے، اس لئے کہ آگے چل کر وہ خود اپنے شخصی مزعومات کو لوگوں کے سامنے ”الدین الکامل“ کا نام دیکر دنیا کو اس کی سماعت و اطاعت کی دعوت دینے والے تھے وہ اپنے زندگی بھر کے بطلانوں کے لئے ایک بنائے باطل تیار کر رہے تھے۔

چونکہ ۱۹۴۱ء جب کہ انہوں نے یہ لیکچر دیا تھا، سے ۱۹۴۵ء کے عرصے میں پاکستان محض نصیبین کے درجے سے گزر کر ایک مادی حقیقت بننے کے قریب ہو چکا تھا لہذا ان حضرت نے اپنی جماعت کا ہندوستان میں آخری اجلاس کیا۔ یہ اجلاس تین دن تک جاری رہا۔ اس کی ساری غرض یہ تھی کہ اپنے سابقہ تاسیسی موقف کو جماعت کے ذہنوں سے دھو کر انہیں کوئی نیا اور ممکن الحصول نصیبین دیں۔



تین دن کی دماغ شوی

”کے آخر پر انھوں نے ”تحریک اسلامی کی

اخلاقی بنیادیں“ کے عنوان سے ایک مفصل لیکچر دیا۔ نام سے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ سچ مچ دینی اخلاقیات کی بنیاد کا کوئی واضح خاکہ جماعت کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں تاکہ جماعت بے بنیاد ہو کر کہیں کی کہیں نہ نکل جا کر حقیقت میں وہ دینی کتاب الاخلاق کو ایک طرف پھینک کر میکیاولی کی اجتماعی منافقت کا راستہ کھول رہے تھے، وہ آنے والے حالات میں دینی اخلاقیات کی پابندی کرتے ہوئے اپنے کسی منصوبے کو پورا کرنا تو درکنار زندہ بھی نہ رکھ سکتے ہیں۔ لہذا وہ اسی گمراہ کن عنوان کے ماتحت دینی اخلاق کو میکیاولی ازم سے بدلنے کی راہ صاف کر رہے تھے۔ لہذا انھوں نے تین دن کی دماغ شوی کے بعد آخری اجلاس میں یہ اعلان کر دیا کہ ان کا اور ان کی جماعت کا ابتداء سے ایک ہی مقصد رہا ہے۔ اور وہ ہے اُمت میں قیادتِ صالحہ کا قیام تاسیس اُمت و کئی زندگی کے طریقِ انبیاء کے سابقہ سب دعائی کی اس لیکچر میں بھنک تک محسوس نہیں ہوتی۔ نا حضرت عمر بن عبد العزیز کی قیادتِ صالحہ کے ماڈل کو اختیار کرنے کا اس میں پوری طرح پتہ چلتا ہے۔ بلکہ بلا اعتراف گناہ سابق وہ اس موقف کو اختیار کر رہے تھے، ان کی یہ اخلاقیات میکیاولی ازم کا ماحول آغاز تھا اور دینی اخلاقیات سے گریز کر کے مصلحت پرستی کی طرف قدم اول تھا۔

**ان کے دین کی کل حقیقت** | ان کے دین کا اوپری ڈھانچہ اگر جبار و قہار کئی ریت ہے جسے وہ دین کا مترادف قرار دے چکے ہیں تو

ان کے دین کی رُوح جسے نعوذ باللہ وہ اسلام کی رُوح قرار دیتے ہیں (خدا نے واحد القہار کی حاکمیت ہے) تجدیدِ احیائے دین ص ۳) وہ غضبِ قہر خداوندی کے ان دو کھمبوں کے درمیان بندھی ہوئی رستی پر کب تک ناچ کر سکتے ہیں۔

**الامام المہدی** | اس آخری مجددِ اُمت کی جو تصویر بانی جماعت اسلامی نے کھینچی ہے۔

در تجدیدِ دین و احیائے دین ص ۵۴/۵۵/۵۶) وہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے سب علوم و فنون اور سائنسوں پر مجتہدانہ دسترس رکھتا ہو گا اور وہ نہایت درجہ جدید الوضع انسان ہو گا یہاں تک کہ اس کا صاف امکان ہے کہ اس کے وقت کے تمام علماء و صوفیاء اس کے مخالف ہو جائیں، وہ اپنی تنظیمی مہارت اور سب اسبابِ ظاہری کو ہمہ جہتی طور پر استعمال کرتا ہو گا



فَاحِ عَالَمٌ هُوَ كَاشَفٌ وَكَرَامَاتٍ اَوْ كَهْلِيْ هُوَ اَسْمَانِيْ بُرْهَانٌ وَتَايِيْدَاتٍ كَا اِسْ كَے مَعَالِے مِیں كُوْنِيْ اَثَرُ نَہُوْگا۔

اب اس مقام پر آپ خاتم الانبیاء اور ان کے رفقاء کا حلیہ بھی سامنے رکھ کر دیکھئے قرآن مجید میں اس حلیہ کو دو لفظوں میں بیان کیا گیا ہے ”نبی امی“ اور ”امت امیون“۔ گویا بانی جماعت اسلامی کے تختل کا گھڑا ہوا یہ امام حضرت خاتم الانبیاء اور ان کی اُمّی اُمت کی پوری پوری ضد ہوگا اور اس کا سارا تمسک اسباب کی تنظیم سے ہوگا نہ کہ دُعا و مناجات و قنوتِ نازلہ پر۔ اس کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ ایک نئے مکتب فکر کا بانی ہوگا گویا قرآن و اُسوۃ خاتم الانبیاء و اُسوۃ صحابہ نبوی کوئی قابلِ ذکر مکتب فکر نہیں ہے کہ جماعت اسلامی اس سے تمسک اور اس پر عمل پیرا ہونے کو فلاحِ انسانی کے لئے کافی جانیں۔ اس شخص کو دین نام کی کسی چیز پر کوئی یقین نہیں ہے، وہ یورپ کے جدید ملاحظہ کی طرح تازہ تازہ اور نوبہ نو نظام فکر گڑھنے اور ان کے نوبہ نو تجربے کرنے کا قائل ہے، یہی اس کے دینِ کامل کا تصور ہے وہ :

مَثَلُ کَلِمَةِ خَبِيْثَةٍ کَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ اَجْتَنَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ۔ (دین خبیث کی مثال ایک ایسے خبیث درخت کی ہے جو زمین کے اوپر اوپر دکھائی دیتا ہے جسے کوئی پائیداری نہیں حاصل ہے، کا مصداق ہے۔ شیطانی وساوس کی جتنی ممکنہ شکلیں ہیں وہ ابو زید سروج کی طرح ان سب کی کامیاب ایکٹنگ کرتا ہے اور ہر موقعہ پر عوام سے داد لیتا ہوا اگلے اسٹیج کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

جو لوگ مذہبی طریقِ ایمان و صلح کے بجائے اسلام بحیثیت ایک نظام فکر و عمل دین کو ایک فکری نظام کی حیثیت سے سمجھتے

کے عادی ہو چکے ہیں۔ انشاء اللہ اس مختصر بیان میں انھیں مطمئن کرنے اور حدودِ الہی میں اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر محبوس رکھنے کا کافی سامان موجود ہے اور جن لوگوں کی غرض ذہنی عیاشی و رازجوئی ہے ان کے لئے قرآن مجید کا اعلان ہے کہ : لَا تَغْنِي الْاَيَاتُ وَالنَّذْرُ عَنْ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ ”جس قوم کے پاس ایمان کی دولت نہیں ہے انھیں آیاتِ ارض و سماوی اور انبیاء کا انداز و تنبیہ کوئی نفع نہیں دیتا۔“ جنھیں دولتِ ایمان حاصل ہے ناقابلِ ادراک و سمعوتوں پر پھیلی ہوئی



یہ کائنات انھیں رحمت و عدلِ خداوندی کا ایک کارخانہ حکمت و تدبیر محسوس ہوتا ہے اور جو لوگ دولتِ ایمان سے محروم ہیں انھیں یہی کائنات مرگ و یاس کا ایک جلتا ہوا صحرا محسوس ہوتا ہے وہ اس کی ہم آہنگی کے بجائے اس میں ایک ابدی جنگِ اضداد کا سلسلہ محسوس کرتے ہیں۔ موجودہ لادینی مغربی فکر نے مذہبی روایت سے آزاد ہو کر جو تہذیب تعمیر کی ہے وہ کائنات کے اسی جنگِ اضداد کے تصور پر تعمیر ہوئی ہے۔ اس میں امن و سلامتی تعاون و باہمی خیراندیشی کا نام و نشان نہیں ملتا۔ اس لادینی فکر و اور اس لادینی تہذیب کا جو اثر مسلم معاشرے پر پڑا ہے اس کا ایک واضح نمونہ مودودی کا نظریہ ہے وہ سیاسی اقتدار پر قابض ہونے یا اس میں حصہ رسانی کرنے کے لئے تمام اخلاقی معیارات کو توڑ پھوڑ کر کچھ کا کچھ کرنے کو نہ صرف جائز بلکہ وقت پڑنے پر ضروری جانتے ہیں اور ظاہر و باطن کو ایک رکھنے والے جس خشک ملا کو دل بدلی، نگ بدلی او موقع پرستی کا فن نہ آتا ہو اس کی گنجائش اس تحریک میں مطلق نہیں ہے،

**تلخیص** اس گروہ کے دین کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے خدا کا بنیادی تعارف حاکمیت و اقدار ہے، ان کے دین کا مرکزی مفہوم یہ ہے کہ وہ حکومتِ قاہرہ ہے۔ اس حکومت کی نس نس میں جو روح خونِ حیات بن کر جاری و ساری رہتی ہے وہ خدائے واحد القہار کی حاکمیت کی روح ہے اور اس کا مظہرِ کامل ریاستِ قاہرہ ہے۔ کائنات اور اس کے خالق کے اس تصور کو تسلیم کر لینے کے بعد کتابِ دین کے تمام وہ اصول و محکمات کہ جو کتابِ دین میں قرارداد مقاصد میں مرکزی و کلیدی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج اور تمام غیر متبادل اخلاقی و روحانی قدریں، قراردادِ مقاصد سے خارج ہو کر ذرائع کی فہرست میں آجاتے ہیں۔ ذرائع کا درجہ بھی انھیں محض رکھ رکھاؤ کی حیثیت میں دیا گیا ہے۔ یہ مذہبی دنیا کی اشکِ شوئی کا معاملہ ہے، ورنہ ان لوگوں کے دین (قاہرانہ ریاست) میں ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے کہ قاہرانہ ریاست کی اقامت کا ذریعہ محض تنظیم و انقلاب ہے۔ وہاں نماز، روزے، زکوٰۃ و حج جیسی ملکوتی الاصل چیزوں کو گھسیٹنا محض نمود و نمائش و نفاق ہے، اس کے لٹریچر میں آپ کو تحریکِ نظامِ انقلاب کے الفاظ کی بے حد تکرار ملے گی، لیکن سارے دینی ذرائع مثلاً انذار و تہذیب ترغیب و ترغیب، تبلیغ و تذکر، نصیحت و صدق و اخلاص کا شاذ و نادر ہی پتہ چلے گا۔ حالانکہ انسان کی اخلاقی فطرت کو بیدار کرنے، اس کی تربیت کرنے اور اسے کمالِ مقدس تک پہنچانے کے ذرائع صرف یہی ہیں۔ جبر و قہر و اکراہ سے اس اخلاقی فطرت کو دبا یا توھا سکتا ہے اسے پروان نہیں



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# جماعت اسلامی اور اُس کے بانی

از: حکیم ابوالحسن عبید اللہ خاں رحمانی

۱۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی و رسول ہیں اور آپ کے بعد قیامت تک کوئی دوسرا نبی یا رسول نہ آئے گا۔

۲۔ اُمّتِ مسلمہ جسے قرآن میں ”خیر اُمت“ و ”امتٌ وسطاً اور ”شہداء علی الناس“ قرار دیا گیا ہے یہ آخری نبی کی آخری اُمت ہے جس کے بعد قیامت تک کوئی دینی اُمت بھی نہ ہوگی۔ کیونکہ کسی نئی اُمت کی تشکیل کوئی نیا نبی ہی کر سکتا ہے اور وہ چونکہ آنحضرتؐ کے بعد دوسرا کوئی نہیں سکتا لہذا کوئی دوسری دینی اُمت بھی اب قیامت تک قائم نہیں ہو سکتی۔

۳۔ قرآن پاک لفظاً و معنی ہمیشہ کے لئے تحریف و تبدیل سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ ”إِنَّا خُنُّ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ“ بے شک ہمیں ہیں اس نصیحت کو نازل کرنے والے اور قیاماً ہم ہی رہیں گے اس کی حفاظت کرتے رہیں گے۔

۴۔ جس طرح قرآن پاک کے الفاظ و معانی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ پاک نے لے رکھی ہے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل و تقریر سے قرآن کی تشریح و توضیح کی ذمہ داری بھی خود حق تعالیٰ نے لے لی ہے۔ ”ثُمَّ نَزَّلْنَا بَيِّنَاتٍ لِّهِ“ پھر اس قرآن کے شرح و بیان کی ذمہ داری بھی ہمیں پر ہے۔

۵۔ تا قیام قیامت، آنحضرتؐ کی نبوت و رسالت کے تسلسل کے ساتھ اُمتِ مسلمہ اور اسلام کے تسلسل کو مربوط کر دیا گیا ہے یعنی جس طرح آپؐ کی نبوت و رسالت، وقت بعثت سے صبح قیامت تک پورے تسلسل کے ساتھ باقی رہے گی۔ اسی طرح آپؐ کا لایا ہوا دین اور آپؐ کی قائم کردہ اُمتِ مسلمہ بھی ہر دور میں ہمہ وقت پورے تسلسل کے ساتھ قائم رہے گی تاکہ ”شہداء علی الناس“ کے مقصد کی انجام دہی ہو سکے۔



”لا يزال من امتي امة قائمة بامر الله لا يضرم من خذلهم حتى ياتي امر الله وهم على ذلك“ (بخاری و مسلم) برابر میری اُمت کا ایک طبقہ اللہ کے دین پر قائم رہے گا جو لوگ ان کا ساتھ چھوڑیں گے وہ انہیں کچھ نقصان نہ پہونچا سکیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے اور وہ جماعت برابر اسی دین پر قائم رہے گی۔“

”لا يزال ناس من امتي ظاهرين حتى ياتيهم امر الله وهو ظاهرون“ (بخاری و میری اُمت کے کچھ لوگ برابر غالب اور سر بلند رہیں گے اور اللہ کے حکم یعنی قیامت آنے تک ان کی فتحیابی و سر بلندی قائم رہے گی۔“

”لا تزال طائفة من امتي منصورين لا يضرم من خذلهم حتى تقوم الساعة“ (ترمذی) میری اُمت میں ایک گروہ برابر کامیاب و پامراد رہے گا اور ان کا ساتھ نہ دینے والے ان کو کچھ نقصان نہ پہونچا سکیں گے اور یہ صورت حال برابر قیامت تک جاری رہے گی۔“

”لا تزال طائفة من امتي قوامه على امر الله لا يضرمها من خالفها“ (ابن ماجہ) میری اُمت میں ایک گروہ برابر پوری شدت کے ساتھ دین پر قائم رہے گا اور اس کے مخالف اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔“

”لا تزال طائفة من امتي ظاهرين على الحق حتى تقوم الساعة“ (مسند حاکم) میری اُمت کا ایک گروہ حق کے سلسلے میں ہمیشہ کامیاب و فتحیاب رہے گا۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔“

”يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتأويل الجاهلين۔“ (بیہقی) ہر کچھلے دور کے لوگوں میں سے اس کے عادل لوگ ہوتے رہیں گے جو دین میں غلو کرنے والوں کی تحریف اہل باطل کی دروغ گوئی اور جاہلوں کی جاہلانہ تاویلات کو دین سے برابر دور کرتے رہیں گے۔“

۶۔ آنحضرتؐ کی نبوت کے ظہور کے بعد صرف آپ کے اتباع کا راستہ کھلا رکھا گیا ہے۔ باقی بنیادین گڑھنے، نئی شریعتیں ایجاد کرنے اور نئی نئی اُمتیں بنانے کی تمام راہیں قیامت تک کے لئے مسدود کر دی گئی ہیں جیسا کہ ملت اسلامیہ کے مسجدوں و منبروں سے



آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تاریخی اعلان چودہ سو سال<sup>۱۴۰۰</sup> سے دہرایا جا رہا ہے ”الاوان خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الہدیٰ ہدیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وشر الامور محدثاتہا وکل محدثہ بدعة وکل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار۔ آگاہ رہو! سب سے بہتر کتاب اللہ کی کتاب ہے اور سب سے بہتر سیرت واسوہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور سب سے بُری چیز وہ ہے جو دین میں نئی نکالی گئی ہو اور دین کی ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے“

”لو کان موسیٰ حیاً ما وسعه الا اتباعی (الحديث) اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری پیروی کے بغیر چارہ کار نہ تھا“

”والذی نفسی بیدہ لوید الکم موسیٰ فاتبعتموہ وترکتونی لضللتکم عن سواء السبیل (الحديث)۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تمہارے لئے موسیٰ ظاہر ہوں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرنے لگ جاؤ تو یقیناً تم راہ راست سے بھٹک جاؤ گے۔“

مذکورہ بالاچھ نکات مسئلہ ختم رسالت ونبوت سے قریبی تعلق رکھتے ہیں بلکہ ان کی حیثیت ختم رسالت کے لئے مبنی اور موقوف علیہ کی ہے لہذا ان نکات پر مکمل اتفاق کے بعد اب کیا فرماتے ہیں علمائے امت اس مسئلہ میں کہ اگر اس امت کا کوئی فرد یا جماعت کھلے بندوں اس بات کا اعلان کر دے کہ قرآن حکیم اپنے نزول کے تھوڑے ہی عرصہ بعد (خلافت راشدہ کے بعد) دنیا بھر کے لئے ناقابلِ فہم بن گیا تھا اور ”الہ“، ”رب“، ”دین“، ”عبادت“، جیسے کلیدی الفاظ کے صحیح مفہوم سے ناآشنائی کی وجہ سے تقریباً تین چوتھائی قرآن معطل اور ناقابلِ فہم ہو کر رہ گیا تھا اور مسلسل بارہ تیرہ صدیوں تک یہی حالت قائم رہ گئی کہ دین اور عبادت کا صحیح مفہوم تک سمجھانہ جاسکا۔ پھر شخص مذکور نے پورے تیرہ سو سال بعد ظاہر ہو کر دنیا کے سامنے قرآن کے ان کلیدی الفاظ کے حقیقی مفہوم کو پیش کر دیا جیسا کہ نزولِ قرآن کے وقت ان الفاظ سے یہ معانی مراد لئے جاتے تھے (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، مصنفہ ابو الاعلیٰ مودودی) پھر یہی شخص امتِ مسلمہ کے متوارث و متداول دین کو ”مَا الْفَيْنَا عَلَیْهِ اَبَانًا“ کا مصداق قرار دیتے ہوئے، اپنے شخصی و ذاتی فہم قرآن کی بنیاد پر دین کا ایک نیا مفہوم متعین کرتا



ہے کہ دین موجودہ دور کی ریاست کلی کا نام ہے اور پھر اسی مفروضہ کی بنیاد پر.....  
 .... ایک نئی اسلامی اُمت کی تشکیل کرتا ہے۔ اور پھر اپنے خود ساختہ دین و اُمت کے استقلال کا دعویٰ کرتے ہوئے پوری اُمتِ مسلمہ کو یہ چیلنج کرتا ہے کہ یا تو وہ اس کے پیش کردہ دین و اُمت سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے یا پھر اسے رد کر کے وہی پوزیشن اختیار کر لے جس پر مغضوبِ علیہم یہود و محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو رد کر کے پہونچ گئے تھے۔ اب اس مدعی کا دعویٰ خود اس کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں :-

”ایک وقت تھا کہ میں خود بھی روایتی و نسلی مذہبیت کا قائل تھا اور اس پر عمل پیرا تھا۔ پھر جب ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ اس طرح محض ”مَا الْفَيْنَا عَلَيْهِ اَبَا نَسَا“ کی پیروی ایک بے معنی چیز ہے۔ آخر میں نے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی طرف توجہ کی۔ اسلام کو سمجھا اور اس پر ایمان لایا۔ پھر آہستہ آہستہ اسلام کے مجموعی اور تفصیلی نظام کو سمجھنے اور معلوم کرنے کی کوشش کی جب اس طرف سے اللہ پاک نے دل کو مطمئن کر دیا تو جس حق پر خود ایمان لایا تھا اس کی طرف دوسروں کو بھی دعوت کا سلسلہ شروع کر دیا۔“

(رودادِ جماعت اسلامی حصہ اول ص ۷۵)

شخصِ مذکور کا صاف اعتراف ہے کہ اس کا اختیار کردہ مذہب قرآن و سنت میں اس کی ذاتی فکر کا نتیجہ ہے اور جس مذہبیت کو ”مَا الْفَيْنَا عَلَيْهِ اَبَا نَسَا“ کا مصداق قرار دے کر ترک کر دیا ہے وہ اُمتِ مسلمہ کا متواتر اور متداول دین ہے جس کی پیروی قرآن کے بموجب ”اتباع سبیل المؤمنین“ کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔ گویا قرآن کی تفسیر بالرائے کرنے والے اس شخص کے نزدیک اُمتِ مسلمہ کا متداول و متواتر دین اور کفار و مشرکین کا متواتر دین دونوں ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔

اُمتِ مسلمہ کا متواتر و متداول دین جو دور رسالت، دورِ صحابہ، دورِ تابعین اور دورِ ائمہ سلف، فقہاء و محدثین و مجتہدین سے لے کر آج تک پوری اُمتِ مسلمہ کے مابین بالکل یکساں طور پر مسلم و معتمد ہے اور انشاء اللہ قیامت تک اسی طرح مسلم و متفق علیہ رہے گا وہ توحیدِ خدا (کلمہ شہادت)، روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ، ایمان باللہ، ایمان بالرسالت، ایمان بالکتاب، ایمان بالملائکہ اور ایمان بالآخرت کے سوا کچھ نہیں ہے اور اس متواتر دین کو



رد کر کے شخص مذکور نے جس دین کو بطور خود دریافت کیا ہے اس کی حقیقت اس کے نزدیک ریاست کلی اور حکومت قاہرہ کا قیام ہے اور امت مسلمہ کا متواتر و متداول دین اس کی نظر و تحقیق میں صرف اصل دین (ان کے مخترع دین) کے قیام کا ایک ذریعہ ہے۔ اس سلسلہ میں بھی اس کا ایک دعویٰ ملاحظہ فرمائیں:-

”کہ اگر یہ جملہ عبادات جو صرف ذرائع کی حیثیت میں ہیں“ ”اگر اصول قیام حکومت کے واحد نصب العین سے علیحدہ ہو کر کام کرتے ہیں تو عند اللہ ان کا کوئی اجر نہ ہوگا۔“

(تجدید و احیاء دین ص ۲۷۲ و ردود جماعت اسلامی حصہ سوم ص ۳۷)

اب اپنے نئے دریافت کردہ دین اور اس کی بنیاد پر نئی تشکیل کردہ امت کے استقلال کا دعویٰ کرتے ہوئے یہ مدعی امت مسلمہ کو ان الفاظ میں چیلنج کرتا ہے:-

”اس موقع پر میں نہایت وضاحت کے ساتھ ایک بات کہہ دینا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس قسم کی دعوت کا، جیسے کہ ہماری دعوت ہے، کسی مسلمان قوم میں اٹھنا اس کو ایک بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیتا ہے جب تک حق کے بعض منتشر اجزاء باطل کی آمیزش کے ساتھ سامنے آتے ہیں، ایک مسلمان قوم کے لئے اسے قبول نہ کرنے اور اس کا ساتھ نہ دینے کا ایک معقول عذر موجود ہوتا رہتا ہے۔ مگر جب پورا حق بے نقاب ہو کر اپنی خالص صورت میں اس کے سامنے رکھ دیا جائے اور اس کی طرف اسلام کا دعویٰ رکھنے والی قوم کو دعوت دی جائے تو اس کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا تو اس کا ساتھ دے اور اس خدمت کو انجام دینے کے لئے کھڑی ہو جائے، جو اس امت مسلمہ کی پیدائش کی ایک ہی غرض ہے، یا نہیں تو اسے رد کر کے وہی پوزیشن اختیار کر لے جو اس سے پہلے قوم یہود اختیار کر چکی ہے۔ اس صورت میں ان دورا ہوں کے سوا کسی تیسری راہ کی گنجائش اس کے لئے باقی نہیں رہتی۔“

(ردود جماعت اسلامی حصہ دوم ص ۱۷)

معلوم ہوا کہ اس سے قبل مجددین و مصلحین دین و امت نے تیرہ صدیوں تک جو دینی تحریکیں چلائی ہیں وہ حق صریح پر مبنی نہ تھیں بلکہ حق و باطل کا آمیزہ تھیں ”جیسا کہ ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کی آمد سے قبل حق و باطل کا باہمی اختلاط ہو جایا کرتا ہے اور پھر دوسرا نبی اگر حق کو بے نقاب اور باطل کی آمیزش سے پاک و صاف کر دیتا ہے“ اسی لئے امت ان سابقہ



دینی تحریکوں کو رد کرنے کے باعث مواخذۂ خداوندی سے اب تک بچتی چلی گئی لیکن آج جبکہ شخص مذکور نے حق کو باطل کی آمیزش سے بالکل پاک و صاف کر دیا اور اسے حجابِ باطل ہٹا کر بے نقاب کر دیا ہے تو اب اُمت اسے رد کرنے کے بعد مواخذۂ خداوندی سے اسی طرح نہیں بچ سکتی جس طرح قوم یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو رد کر کے نہ بچ سکی۔ آگے چند سطروں بعد مزید لکھتا ہے :-

”اب چونکہ یہ دعوت ہندوستان میں اُٹھ چکی ہے اس لئے ہندی مسلمانوں کے لئے آزمائش کا وہ لمحہ آہی گیا۔ رہے دوسرے ممالک کے مسلمان تو ہم ان تک اپنی دعوت کو پہونچانے کی تیاری کر رہے ہیں، اگر ہمیں اس کوشش میں کامیابی ہو گئی تو جہاں جہاں یہ پہونچے گی تو وہاں کے مسلمان بھی اس آزمائش میں پڑ جائیں گے۔“ (روداد جماعت اسلامی حصہ دوم ص ۱۸)

مندرجہ بالا سطور میں آزمائش کے لفظ سے اس ”سنۃ اللہ“ کی طرف اشارہ ہے کہ جو عذابِ اُمت دعوت پر انبیاء کی دعوت کو رد کرنے سے آجاتا ہے وہی عذاب اس مدعی کی دعوت کو رد کرنے سے آجاتا ہے وہی عذاب اس مدعی کی دعوت کو رد کرنے سے اُمتِ مسلمہ پر آجائے گا۔

اس شخص کی اُمتِ مسلمہ کو یہ وعید مرزا غلام احمد قادیانی اور بہار اللہ ایرانی کی اس وعید سے ذرہ برابر مختلف نہیں ہے جس میں ان دونوں نے اُمتِ مسلمہ کو یہ دھمکی دی تھی کہ اگر ان کی دینی تشریحات کو وہ حرفِ بحرف قبول نہ کرے گی تو خدا کے دین سے اسے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو تو خدا نے کافر و مشرک اُمت کے لئے عذاب کی تمنا سے یہ کہہ کر

روک دیا تھا ”لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ تَتُوبَ عَلَیْہِمَا وَاَعِذْ بِہِمَا فَاِنَّہُمْ ظَالِمُوْنَ۔“ آپ کو ان کے عذاب کے سلسلے میں کوئی اختیار نہیں۔ خدا ان پر رجوع بالرحمۃ ہو یا انھیں عذاب کرے کہ وہ ظالم ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مدعی کو خدا کی طرف سے عذاب کی وحی پہنچ گئی ہے۔

شخص مذکور نے صرف رسالت و نبوت کے کھلے دعویٰ سے احتراز کیا ہے ورنہ ایسی وعیدیں سُناتے وقت وہ کس مقام سے گفتگو کرتا ہے یہ بالکل عیاں ہے۔ ایک مقام پر یہ شخص تحریر کرتا ہے :-

”اس وقت ہمیں خاص طور پر ایسے لوگوں کی تلاش ہے جو خدیجۃ الکبریٰؓ اور صدیق اکبرؓ کی



طرح اس دعوتِ حق کو سنیں اور سرتاپا اس میں شریک ہو جائیں گویا وہ اب تک اسی کی  
تلاش میں تھے۔

(رودادِ جماعتِ اسلامی حصہ سوم ص ۲۲)

غور کریں کہ جو حضرت خدیجہؓ اور صدیق اکبرؓ جیسے متبعین اپنی جماعت کے لئے تلاش  
کر رہا ہو خود اس کی نظر میں اس کا مقام کیا ہو گا ؟۔

اب چونکہ دنیا بھر میں پچاس کروڑ سے زائد اُمتِ اسلامیہ اس شخص کے حلقہٴ عقیدت سے  
باہر ہے لہذا وہ بالکل مغضوبِ یہود کا مقام رکھتی ہے اور اس کے چند ہزار متبعین منعمِ عظیم  
گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس شخص نے قطعی طور پر اپنی مٹھی بھر جماعت اور اُمتِ اسلامیہ  
کے درمیان وہی فرق رکھا ہے جو یہود و نصاریٰ اور اُمتِ محمدیہ کے درمیان ہے۔

*Imam Jamini*



حکیم اہل خان

## جماعت اسلامی اور بانی جماعت اسلامی

جماعت اسلامی، جو اب برصغیر کے باہر بھی ایک اسلامی تنظیم کے نام سے مشہور ہے، جناب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی قائم کردہ ہے جو انھوں نے ۱۹۲۶ء میں اپنے چند ساتھیوں کی محبت میں پٹھان کوٹ (پنجاب) انڈیا، کے ایک گھاؤں جہال پور میں قائم کی تھی، جو بعد میں لاہور منتقل ہوئی۔

**بانی جماعت** | بانی جماعت اسلامی مولانا مودودی صاحب اور ننگ آباد (مرہٹوڑہ) سابق ریاست حیدرآباد کے رہنے والے تھے، ان کی تعلیمی صلاحیت کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ وہ اگرچہ کسی بانسابطہ دینی درس گاہ یا عالم سے نہیں پڑھے تھے مگر اردو عربی فارسی کی صلاحیت رکھتے تھے، اور اردو کے اچھے انشا پرداز تھے، اس صلاحیت کی بنا پر انھوں نے متعدد اردو اخبارات تاج، الجمعۃ وغیرہ میں کام کیا اور اسی توسط سے وہ بعض دینی تحریکات میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔

حیدرآباد دکن سے کسی صاحب نے ترجمان القرآن کے نام سے رسالہ جاری کیا تھا۔ مگر وہ اسے کامیابی کے ساتھ چلانے میں ناکام رہے، مولانا مودودی صاحب چونکہ اچھے انشا پرداز و مضمون نگار اور پھر صحافتی ذوق رکھتے تھے، اس لئے ۱۹۵۲ء میں کسی معاہدے کے تحت یہ رسالہ مودودی صاحب کی ادارت میں نکلنے لگا۔ اس رسالے میں مودودی صاحب نے اسلام اور اسلامی مسائل پر جدید انداز سے لکھنا شروع کیا۔ جس سے وہ ہندوستان کے دینی علمی حلقوں میں بہت جلد ایک اسلامی قلم کار کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔

ایک مرحلے پر اس زمانے کے مشہور مسلم لیڈر رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے دہلی کی جامع مسجد شاہجہانی میں اسلامی جہاد پر تقریر فرمائی، ساتھ ہی جہاد پر



ایک مبسوط کتاب لکھنے کی دعوت عامہ بھی دی۔ جس سے متاثر ہو کر مولانا مودودی صاحب نے اپنی مشہور ”الجهاد في الاسلام“ مرتب کی۔ جو اپنے موضوع پر ایک مبسوط کتاب تسلیم کی گئی۔ کتاب ”الجهاد في الاسلام“ اور رسالہ ترجمان القرآن کے جدید مضامین مولانا مودودی صاحب کے بطور داعی اسلام تعارف کے لئے کافی ہو گئے تھے۔

مولانا ترجمان القرآن میں صرف دینی مضامین لکھتے تھے، مگر ان دنوں آزادی کی مختلف تحریکات سے یہ یقین ہو چکا تھا۔ کہ اب ہندوستان آزاد ہونے میں بہت دیر نہیں ہے۔ بلکہ مسلم لیگ کی ایک آواز پر ایک آزاد مسلم ریاست کے وجود میں آنے کے امکانات بھی واضح ہو گئے ہیں۔ اس لئے موصوف نے اسلامی سیاسیات پر بھی لکھنا شروع کر دیا۔ جس سے وہ مذہبی کے ساتھ سیاسی و ملی میدان میں بھی پہنچ گئے۔

مولانا کی دُورس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا۔ کہ نئی تحریکات و تنظیمات کے لئے پنجاب کی زمین بہت سازگار اور زرخیز رہتی ہے جیسا کہ اس کی موزونیت کا علامہ اقبالؒ نے بھی ذکر خیر فرمایا ہے ع

مذہب میں بہت تازہ پسند اسکی طبیعت  
تحقیق کی بازی ہو شرکت نہیں کرتا  
کر لے کہیں منزل تو گذرتا ہے بہت جلد  
ہو کھیل مریدی کا تو لہر تا بہت جلد  
تاویل کا پھندا کوئی نصیب اد لگا دے  
یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد  
مولانا بھی اسکی زرخیزی دیکھ کر حیدرآباد سے پنجاب منتقل ہو گئے۔ اور ایک نئی بستی آباد کی۔ مگر چونکہ ان کے پاس پیری مریدی کا کوئی کھیل یا سامان نہیں تھا، بلکہ سیاسی مقاصد تھے، اس لئے ان کی تحریک کے لئے یہاں کا ماحول راس نہیں آیا۔ پنجاب کے جاگیردارانہ ماحول میں جہاں خود تحریک آزادی ہند، اور کانگریس ہی کے لئے لالے پڑے رہے۔  
مولانا تاحیات صدا بہ صحرا بنے رہے۔ اور ان کی تحریک پنجاب میں کتابوں اخبارات و رسائل سے آگے قبولیت حاصل نہ کر سکی۔

جماعت اسلامی کے قیام کا پس منظر | مغل حکومت کے خاتمے، تحریک مجاہدین کی ناکامی اور ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد مسلمانوں



میں تعلیمی و تحریر کی رجحانات شدت سے ابھرے۔ جن کی داغ بیل حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان نے ڈالی تھی۔ انھوں نے دہلی میں متعدد دینی درس گاہیں قائم کیں، جن میں برصغیر کی ممتاز دینی شخصیتوں نے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ سرکاری سرپرستی میں چلنے والا تعلیمی ادارہ اینگلو عربک سکول اجیری گیٹ پر قائم ہوا۔ جس سے ہندوستانی ملت اسلامیہ کی کشتی کے متعدد نگہبان فیض یاب ہوئے۔ علمائے کرام نے تو بڑی بڑی دینی درس گاہیں بنائیں۔ مگر جدید تعلیم یافتہ اور انگریز حکومت سے تعلق رکھنے والوں نے سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی بنیادیں ڈالیں۔ علمائے کرام انگریزی حکومت اور انگریز تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ جبکہ سرسید احمد خاں مرحوم اور ان کے ساتھی انگریزی تعلیم کے حصول کو مسلمانوں کی ترقی کے لئے ضروری سمجھتے تھے، یہ بڑی کشمکش کا دور تھا۔ تاہم دونوں تحریکیں پروان چڑھتی رہیں۔ اور درجنوں تنظیمیں ادارے، تحریکات مثلاً سائنسی فک سوسائٹی علی گڑھ، مدرستہ العلوم علی گڑھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن حمایت اسلام لاہور، خلافت کیٹی، جمعیت علمائے ہند، حزب اللہ، مسلم لیگ، مجلس احرار اسلام، شیعہ پولیٹیکل کانفرنس، خاکسار تحریک، تبلیغی جماعت وغیرہ وجود میں آتی چلی گئیں۔ علاقائی تنظیمیں اور ادارے ان کے علاوہ تھے، اخبارات و رسائل کا دور بھی شروع ہوا، کتابیں چھپنے لگیں۔ ان تمام چیزوں سے مسلمانوں میں نہ صرف روشن خیالی پیدا ہوئی بلکہ گہرا اقتصادی، تعلیمی سیاسی اور سماجی شعور بھی بیدار ہوا۔ کانگریس نے ملک کی آزادی کی آواز بلند کی، تو مسلمانوں نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کی ایک معقول تعداد تو آزادی وطن کے سلسلے میں کانگریس کی معاون بنی رہی، مگر بہت سے مسلمانوں نے مسٹر محمد علی جناح کی قیادت میں ایک علیحدہ آزاد مسلم ریاست کی مانگ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے شروع کر دی۔

مولانا مودودی صاحب عین اسی دور کی پیداوار ہیں۔ مسٹر جناح اور ان کے ساتھیوں نے علیحدہ مسلم قومی حکومت کی مانگ کی، مگر مولانا مودودی صاحب نے جن کی تحریک ابھی صرف سالہ ترجمان القرآن اور اس کے چند قارئین تک محدود تھی، اسلامی حکومت یا حکومت الہیہ کا نیا



تصور پیش کیا۔ مولانا صاحب نے اپنے موقف کی حمایت میں نہ صرف مضامین ہی لکھے بلکہ مسلمان اور سیاسی کشمکش کے عنوان سے کتاب بھی مرتب کی، جس میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قوم پرستی کی بنیادوں پر حاصل کی گئی حکومت، اسلام کے لئے مفید نہیں ہو سکتی۔ اور یہ کہ اسلام میں قوم پرستی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وغیرہ اس مشن کی حمایت میں انھوں نے تقریری سلسلہ بھی شروع کیا جیسا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کے سامنے قومی طرز حکومت کے خلاف ان کی تقریر بہت مشہور ہے،

مسلم قومی حکومت کے قیام کا نسخہ تو بہت آسان اور سہل تھا۔ اس کے لئے زمین ہموار ہو چکی تھی، چنانچہ بعض جغرافیائی و سیاسی عوامل کی وجہ سے یہ نسخہ کارگر ثابت ہوا۔ مگر مودودی صاحب کی مجوزہ حکومت الہیہ جان جو کھوں کی بات تھی، جسے مولانا صاحب سیاسی تحریکوں کے طرز پر محض نعرے، اخبارات، کتابوں، اور تنظیم کے ذریعے سے قائم کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ اسلامی حکومت اصلح عقیدہ و معاشرہ، اور طریق علی منہاج النبوت کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی تھی۔

مولانا مودودی صاحب چونکہ اسلام کے فطری تقاضوں اور علی منہاج النبوت طریق پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

## ضرورت ایجاد کی مان ہے

اور اس سے بے نیاز ہو کر اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے مغربی طرز پر الگ پارٹی یا تحریک چلانے کا انداز اختیار فرمایا۔ اور سیاسی پارٹیوں کی طرح مسلم لیگ کے بجائے جماعت اسلامی قائم کی۔ اور اس کی دعوت 'پروگرام'، اور دستور کو اسلام، اسلامی تحریک، اسلامی انقلاب، حکومت الہیہ، نظام حیات، ضابطہ حیات، اسلامی قانون، اسلامی سٹیٹ یا نظام، اقامت دین، اسلامک اسکول آف تھاٹ وغیرہ اپنی وضع کردہ جدید اصطلاحات سے سمجایا تاکہ سیاست و اقتصادیت پسند مسلمانوں کے لئے اس میں کشش اور جاذبیت پیدا ہو سکے اور لوگ ان کے اسلامی حکومت کے نعرے کو قبول کر کے ان کے حامی بن جائیں۔

مولانا صاحب نے اپنی تحریک کو مقبول عام بنانے کے لئے نہ صرف نئی اصطلاحات و الفاظ کی وضع فرمائے بلکہ ضرورتاً مستقل شرعی اصطلاحات و الفاظ کے معانی و مفہیم بھی بدل دیئے تاکہ ان کی دعوت کی پسندیدگی میں کوئی چیز بھی حارج نہ ہو، اور اس کی عوامیت اور ہر دلعزیزی یقینی



بن جائے اور ہر مسلمان آنکھ میٹھ کر ان کی مجوزہ اسلامی حکومت کے حصول میں لگ جائے۔  
 اس ضمن میں موصوف نے سب سے بڑی جسارت یہ کی، کہ ”قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات“  
 الہ، رب، عبادت، اور دین کے معنی و مفہوم کو بدل دیا۔ پھر یہ فرمایا کہ ان بنیادی اصطلاحات  
 کا معنی و مفہوم چونکہ مسلمانوں کی نگاہوں سے ۴۰۰ سال تک مستور رہا۔ اس لئے قرآن کریم کی  
 تین چوتھائی تعلیم ہی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اب انھوں نے صحیح مفہوم بتایا ہے۔ جو  
 شخص ان کے بتائے ہوئے کل دین پر نہیں چلے گا۔ وہ یہود کی راہ اختیار کر لگا۔

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)

مولانا مودودی صاحب نے ہر مرحلے پر حتیٰ کہ اپنے دستور میں دینی احکام و مسائل  
 کو قرآن و حدیث سے اخذ کرنے کا وعدہ فرمایا مگر عملاً اس کے خلاف کیا۔ اور مسلک اعتدال  
 یا ”اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ“ وغیرہ کتابچے یا مضامین لکھے، جن میں ایک طرف  
 تو ”سب اچھا ہے“ کا طریقہ اختیار کیا، اور دوسری طرف تقلیدِ ائمہ کی حمایت فرمائی۔  
 اور خود بطور حنفی مقلد زندگی گزارتے رہے، نیز جماعت کے تمام عہدیداران اور کارکنان کو چھوٹ  
 دیئے رکھی کہ وہ شیعہ، بدعتی، مقلد وغیرہ رہتے ہوئے بھی ان کی جماعت میں حکومتِ الہیہ کے  
 قیام کے لئے رہ سکتے ہیں، صحتِ عقیدہ کی تو مولانا کے ہاں کوئی اہمیت ہی  
 نہیں وہ تفہیمات میں فرماتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ عقائد کے باب میں قیاسات و تاویلات سے جو  
 راہیں اختیار کی گئی ہیں ان میں سے بہت سی راہیں غلط ہیں لیکن  
 ہر غلطی لازماً کفر ہی نہیں ہے۔ غلطی کو غلطی کہنا اور اس کے ارتکاب  
 کرنے والے کو گمراہ اور غلط سمجھنا اور اس کو راہِ راست پر لانے  
 کی کوشش کرنا بلاشبہ جائز ہے۔ لیکن جب تک کوئی شخص اس نفس  
 حقیقت کا انکار نہیں کرتا جس پر اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کا حکم دیا ہے  
 اس کو کافر کہنا کسی طرح بھی جائز نہیں، خواہ اس کی گمراہی کتنی ہی بڑھ  
 گئی ہو۔



حکومت قائم کرنے کے لئے چونکہ عوامی حمایت حاصل ہونا ضروری ہوتا ہے اسلئے مولانا صاحب نے اعتدال کا مسلک اپنایا۔ مگر اس میں یہاں تک بڑھ گئے کہ جب کتاب ”خلافت و ملوکیت“ لکھی، تو — صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اہانت سے بھی گریز نہیں کیا۔ اور حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ حضرت امیر معاویہؓ کی غلطیاں نکال ڈالیں تاکہ شیعہ، سنی کے اصولی اختلاف کو بھی اعتدال کے راستے پر لا کر بالآخر شیعوں کی حمایت حاصل ہو جائے، سیاسی زندگی خصوصاً مغربی طرز حکومت نے انسانی معاشرہ کو جو ذہنی و سماجی آسودگی و آزادی کی نعمت بخشی ہے، اس کی موجودگی میں شریعت اسلامیہ کے عبادتی، اخلاقی اور معاملاتی احکام و مسائل پر عمل کرنا جدت پسند طبائع پر گراں گذرتا ہے، اور حکومت الہیہ کے علمبرداروں کے لئے ان پر عمل کرنا مشکل ہو گا۔

اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی تخفیف کا راستہ بھی اپنایا۔ اور حدیث کی صحت پر اعتراضات وارد کرنا شروع کئے، کہیں اسے طغی قرار دیا، کہیں صرف عقل کی کسوٹی پر بیٹھنے والی حدیث کو لینے کی حمایت کی، روایت کے مروجہ اسلامی اصولوں کو باطل قرار دیا، اور اصح الکتاب بعد کتاب اللہ بخاری شریف کی صحت پر شبہات وارد کئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات مبارکہ کو سنت سے جدا قرار دیا۔ غرض تخفیف حدیث کے لئے جو جتن بھی کر سکتے تھے، بڑی جسارت کے ساتھ مولانا صاحب اختیار فرماتے رہے۔ اور جو چیزیں مناسب حال اور جدید انسانی عقل و فہم پر فٹ بیٹھنے والی و مزاج کے مطابق تھیں دین میں انھیں شامل رکھنے کی اجازت بخشی، اور جو فٹ نہیں تھے، انھیں تعبیر اور تخفیف حدیث کے راستے سے غلط قرار دیا۔ اسلامی عبادات خصوصاً نماز و روزہ کو بھی ٹریننگ کورس سے تعبیر کیا۔

دینی تعلیم و تربیت کے کام سے مولانا روزِ اوّل ہی سے بیزار تھے۔ وہ مروجہ دینی عربی مدارس کی تعلیم کو لوٹا، مسواک، مصلے اور استنجار کی تعلیم سمجھتے تھے۔ اور خود چونکہ جدید دور کے مجدد اسلام تھے۔ وہ محض کتابوں و رسالوں اور اخبارات کے ذریعے ذہنوں کو سدھارنے کا طریقہ کافی سمجھتے تھے۔ اسی لئے موصوف نے اپنی زندگی میں ایک بھی



دینی درس گاہ قائم نہیں کی۔ اور پاکستان میں جماعت اسلامی کی ایک بھی تعلیمی درس گاہ نہیں، جس میں مسلمان بچے دینی و دنیاوی تعلیم حاصل کر سکتے ہوں۔ موصوف نے کبھی یہ بھی محسوس نہیں کیا کہ جب حکومت ان کے ہاتھ میں آئے گی تو وہ بغیر دینی عمال و حکام کے اسے الہیہ کیسے بنائیں گے، اور یہ انگریز کی پروردہ یا مغربی طرز پر تربیت یافتہ سرکاری مشینری ان کی مجوزہ حکومت الہیہ کو کیسے چلائے گی۔

مصلحت اور حکمت عملی کے نام پر مولانا زندگی بھر چولے بدلتے رہے۔ شروع میں تو انھوں نے مسلم قومی حکومت کے نظریے کی مخالفت فرمائی مگر جب پاکستان وجود میں آگیا اور وہاں منتقل ہو گئے تو صالح قیادت کی تبدیلی کے نام پر پاکستان کے مغربی طرز جمہوریت والے الیکشن میں ہی کود پڑے۔ مصلحتاً صدر ایوب کے مقابلے میں ایک ناتواں بوڑھی خاتون مس فاطمہ جناح کی حمایت فرمائی۔

عوامی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے غلافِ کعبہ کی جو پاکستان میں تیار ہوا تھا، اور ابھی اسے کعبہ کی ہوا بھی نہیں لگی تھی، تقدس کے نام پر گشتی نمائش کروائی اور عوام کی ضعیف الاعتقادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ گھومتے رہے۔ استغفر اللہ غرض مولانا کے دینی افکار خیالات اور تعبیرات میں جابجا، تجدد، اعتزال، تحقیف حدیث، تشیع، اہانت صحابہ، دینی تعلیم و تربیت سے بیزاری اور موقعہ پرستی و مصلحت بینی کے پہلو نمایاں رہے ہیں۔ جو کسی طرح بھی ایک حقیقی داعی اسلام کی زندگی میں نہیں ہو سکتے۔ اب ذرا ایک ایک کر کے ہم ان کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

تجدد و اعتزال کا راستہ اور

اسلام کی بنیادی اصطلاحات کے معنی و مفہوم میں تبدیلی | مولانا صاحب نے حکومت الہیہ

کے حصول اور قیام کے لئے اسلام کو سیاسیانے کا عمل بڑی سنجیدگی سے شروع کیا۔ اور اس ضمن میں دونی باتیں انھوں نے سلف صالحین کے طریقے سے بالکل الگ ہٹ کر اختیار کیں۔



۱۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات کے مفہوم کی نئی تشریح۔

۲۔ مکمل دین کا نعرہ

ظاہر ہے کہ ان دونوں راستوں کو اختیار کئے بغیر وہ اسلام کو کیونکر سوشلزم جیسی تحریک کا لباس نہیں پہنا سکتے تھے چنانچہ اسی مقصد کیلئے انھوں نے قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

نامی کتاب لکھی جس میں اللہ، رب، عبادت اور دین کے معنی و مفہوم کو بدل دیا۔

ذیل میں ہم ان کے معتقدات کو ذرا اختصار کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

اس کی ایک وجہ تو خالص عربیت کے ذوق کی کمی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ

اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے ان کے لئے اللہ اور رب، اور دین

اور عبادت کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے جو نزول کے وقت غیر مسلم سوسائٹی

میں رائج تھے۔ (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)

پس حقیقت یہ ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ

پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح ننگا ہوں

سے مستور ہو گئی۔ (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)

مندرجہ حوالوں میں تو مفہوم کی تبدیلی کا جواز بیان کیا گیا ہے۔ مگر اس کے بعد موصوف نے

اللہ کا مفہوم اقتدار

رب کا مطلب مرکز اجتماع

عبادت کا معنی اطاعت

دین کا ترجمہ سٹیٹ یا نظام فرما دیا

اللہ کے مفہوم کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ان تمام آیات میں اول و آخر تک ایک ہی مرکزی خیال پایا جاتا ہے۔

اور وہ یہ ہے، کہ الہیت اور اقتدار لازم ملزوم ہیں۔ اور اپنی روح اور معنی کے

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)

اعتبار سے دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

اور علیٰ ہذا القیاس وہ شخص جو کسی کے حکم کو قانون اور کسی کے امر و نہی کو اپنے



لئے واجب الاطاعت قرار دیتا ہے، وہ بھی اس کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کرتا ہے پس  
(حوالہ مذکور)

الوہیت کی اصل روح اقتدار ہے۔  
اقتدار اعلیٰ کی وحدانیت کا اقتضایہ ہے کہ حاکمیت و فرمانروائی کی  
جتنی قسمیں ہیں سب ایک مقتدر اعلیٰ کی ذات میں مرکوز ہوں، اور حاکمیت  
کا کوئی جزو بھی کسی دوسرے کی طرف منتقل نہ ہو۔  
(حوالہ مذکور)

اس لفظ کا مادہ رب ب ہے، جس کا ابتدائی و اساسی مفہوم  
پرورش ہے پھر اس سے تصرف، خبر گیری، اصلاح حال اور  
**رب کا مطلب**  
اتمام و تکمیل کا مفہوم پیدا ہوا پھر اسی بنیاد پر فوقیت، سیادت، مالکیت، آقائی کے مفہومات  
اس میں پیدا ہو گئے۔

اور رب کا یہ مفہوم کہ وہ امر و نہی کا مختار، اقتدار اعلیٰ کا مالک، ہدایت و رہنمائی  
کا منبع، قانون کا ماخذ، مملکت کا رئیس، اور اجتماع کا مرکز ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک  
بالکل ہی ایک دوسری حیثیت رکھتا تھا اور اس مفہوم کے اعتبار سے وہ یا تو  
اللہ کے بجائے صرف انسانوں ہی کو رب مانتے تھے، یا فطری طور پر اللہ کے رب  
ماننے کے باوجود عملاً انسانوں کی اخلاقی و تمدنی، اور سیاسی ربوبیت کے آگے  
سراطاعت خم کئے رکھتے تھے۔  
(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مادہ عبد  
کا اساسی مفہوم کسی کی بالادستی و برتری تسلیم کر کے اس کے

## عبادت کے معنی

مقابلے میں اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جانا، سرتابی و مزاحمت  
چھوڑ دینا، اور اس کے لئے رام ہو جانا ہے۔ یہی حقیقت بندگی اور غلامی کی  
ہے۔ لہذا اس لفظ سے اولین تصور جو ایک عرب کے ذہن میں پیدا ہے وہ  
بندگی اور غلامی ہی کا تصور ہے۔ پھر چونکہ غلام کا اصلی کام اپنے آقا کی اطاعت  
و فرمانبرداری ہے اس لئے لازماً اس کے ساتھ اطاعت ہی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)



**دین کا ترجمہ** | قرآنی زبان میں دین ایک پورے نظام کی نمائندگی کرتا ہے۔  
جس کی ترکیب چار اجزاء سے ہوتی ہے۔

- ۱۔ حاکمیت و اقتدار اعلیٰ
- ۲۔ حاکمیت کے مقابلے میں تسلیم و اطاعت
- ۳۔ وہ نظام فکر و عمل جو اس حاکمیت کے زیر اثر ہے۔
- ۴۔ مکافات، جو اقتدار اعلیٰ کی طرف سے اس نظام کی وفاداری و اطاعت یا سرکشی و بغاوت کے صلے میں دی جائے۔

قرآن کبھی لفظ دین کا اطلاق معنی اول و دوم پر کرتا ہے، کبھی معنی سوم پر، کبھی چہارم پر، اور کہیں الدین کہہ کر پورا نظام اپنے چاروں اجزاء سمیت سمیٹ لیتا ہے (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)

غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے مفہوم پر حاوی، موجودہ زمانے کا لفظ سٹیٹ کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے۔ لیکن اس کو دنیا کے پورے معنوی حدود پر حاوی ہونے کے لئے مزید وسعت درکار ہے۔ (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)

مولانا مودودی صاحب کی اہم ترین کتاب ”قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں“ کے مندرجہ اقتباسات کے مطالعہ کے بعد اسلام سے روشناس ایک مسلمان کو یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ کہ مولانا صاحب نے ان اصطلاحات کے معنی و مفہوم میں تبدیلیاں کر کے کس طرح اپنی مطلب برآری کی ہے۔ اور شریعت اسلامیہ کے مابعد الطبعی اور اخلاقی تصورات کو مادہ اور سیاست کی چادر میں لپیٹ کر اسلام کو سیاست محض بنا دیا ہے۔ اسی لئے وہ بار بار مکمل دین مکمل دین کی رٹ لگاتے ہیں تاکہ لوگ اسلام میں سیاست کو اولین پوزیشن اور اسے دین کا مقصود قرار دیکر ان کے سیاسی فحشے کی حمایت کرنے لگیں۔

حضرت مولانا کی اس تفہیم و تشریح کے بعد ۱۴۰۰ھ سالہ اسلامی عہد، جس میں خلافت راشدہ کے تیس سال جمع قرآن مجید، تدوین حدیث، تابعین، فقہاء، محدثین کے تمام ادوار



کارنامے، اور تاریخ شامل ہیں، دفتر بے معنی ہے، کیونکہ مولانا کا خیال کے مطابق ۱۴ سو سال تک بنیادی اصطلاحات کا مفہوم کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ تو منطقی طور پر اس عرصے میں جو کچھ مسلمان کرتے رہے۔ وہ گمراہی تھا،

مولانا صاحب کی اس جسارت سے مسلمان تو کیا غیر مسلم بھی حیران ہوں گے، کہ کس طرح ایک شخص نے ۱۴ سو سال کے بعد اسلام کی نئی تفسیر پیش کی ہے۔

جو، مغربی مفکرین، ناقدین اور مستشرقین اسلامی تعلیمات اخلاق و معاملات، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے حسین لمحات، حرکات، سکنت، اقوال، کردار، اور اقرار حتیٰ کہ اشارات کی حفاظت، ترتیب و تدوین پر ملت اسلامیہ کے ضبط و احتیاط کے قائل اور مداح تھے، مولانا کی اس تشریح کے بعد کیا سوچتے ہوں گے۔

”کو اچلا، منس کی چال اپنی بھی بھول گیا“

مولانا مودودی صاحب نے جس انداز سے دین اسلام کی تفہیم و تشریح کی ہے، وہ کوئی جزوی غلطی نہیں، بلکہ اس تشریح سے وہ دین کے مجموعی فکریں غلطی کر گئے ہیں۔ اور اس کے بعد جس قدر باتیں، تحریریں، خیالات، کتابیں، تقریریں موصوف نے تحریر فرمائی ہیں۔ وہ تمام کی تمام یقینی طور پر ان تشریحات کے تابع ہیں۔ جو کھلا ہوا اعتزال و تجدد ہے۔

مولانا مودودی صاحب نے ”خالص عربیت کے ذوق کی کمی“

کا طعنہ دے کر تو یہ فرما دیا ہے کہ چودہ سو سال عرصے میں قرآن

**تخفیف حدیث**

کی تین چوتھائی تفہیم و تشریح مستور ہو گئی مگر ذخیرہ حدیث اور تاریخ اسلام کا پورا دفتر تو خود عربوں اور عربی جاننے والوں نے مرتب فرمایا ہے۔ ایک عجبیٰ ان کے ذخیرہ حدیث صحاح ستہ، سیر اور تاریخ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں، ذرا ملاحظہ فرمائیے۔

محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا۔ جو بلاشبہ نہایت بیش قیمت ہے۔ مگر ان میں کونسی چیز ہے، جس میں غلطی کا احتمال

نہ ہو۔

(تفہیمات)

احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچی ہیں۔ جن سے کوئی



چیز حد سے ثابت ہو سکتی ہے۔ تو وہ گمانِ صحت ہے نا علم یقین۔

(رسالہ ترجمان القرآن، ربیع الاول ۱۳۶۹ھ)

اور محدثین صحیح احادیث سے استنباط احکام و مسائل میں وہ توازن و اعتدال ملحوظ نہیں رکھ سکتے ہیں۔ جو فقہاء و مجتہدین نے رکھا ہے۔ (تفہیمات)  
احادیث کسی معاملے میں حجت نہیں قرار پا سکتیں۔

(ترجمان القرآن فروری ۱۳۶۹ھ)

بخاری شریف کے بارے میں فرماتے ہیں۔

کوئی شریف آدمی یہ نہیں کہہ سکتا، کہ حدیث کا مجموعہ ہم تک پہنچا ہے، وہ قطعی طور پر صحیح ہے، مثلاً بخاری جس کے بارے میں اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے، کوئی بڑے سے بڑا غلو کرنے والا بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں جو چھ سات ہزار احادیث درج ہیں وہ ساری کی ساری صحیح ہیں۔

(اقتباس تقریر لاہور اخبار الاعتصام)

مولانا مودودی صاحب نے قرآنی اصطلاحات و الفاظ کا تو معنی و مفہوم بدل دیا۔ اور اپنی مرضی کی تشریح کر ڈالی، اس کے بعد ذخیرہ حدیث کو مشکوک، ظنی، اور غیر معتبر قرار دے دیا، تو اب دین کو نساہہ گیا۔ وہی جو مودودی صاحب کی کتب دینیات، خطبات تفہیمات، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، تجدید و احیائے دین، وغیرہ میں لکھا ہے خود ان کے مطابق عربی کے ذوق کمیابی والا شخص دینی اصطلاحات کا صحیح مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ مگر وہ یہ کلیہ خود اپنے اوپر لاگو نہیں کرتے۔ جبکہ موصوف نے عربی یا علم دین کی تعلیم کسی مستند عربی درس گاہ اور مستند استاد سے حاصل ہی نہیں کی۔ آخر پھر انہیں یہ تشریحات اور شک و ارتباب پیدا کرنے کا حق کیسے پہنچ گیا۔ فیاللعجب

اس میدان میں بھی مولانا نے خوب ہاتھ دکھائے

ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے

اہانت صحابہ و علمائے کرام

لیکر آج تک کے علمائے کرام اور دانشورانِ ملت کی خبر لے ڈالی ہے۔ اور سب کی اہانت و تنقیص



فرمائی ہے۔

خلافت و ملوکیت میں تحریر فرماتے ہیں:-

لیکن ان (حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ) کے بعد جب حضرت عثمانؓ نشین ہوئے تو رفتہ رفتہ اس پالیسی سے ہٹتے چلے گئے۔ (خلافت و ملوکیت)

حضرت عثمانؓ کی پالیسی کا ایک پہلو بلاشبہ غلط تھا۔ اور غلط کام بہر حال غلط ہے۔ خواہ کسی نے کیا ہو، اس کی خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضہ ہے، اور نادین ہی کا یہ مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ مانا جائے۔

(خلافت و ملوکیت)

حضرت علیؓ نے پورے فتنے کے زمانے میں جس طرح کام کیا۔ وہ ٹھیک ٹھاک ایک خلیفہ راشد کے شایان شان تھا۔ البتہ صرف ایک چیز ہے، جس کی مدافعت میں مشکل ہی سے کوئی بات کہی جاسکتی ہے، وہ یہ کہ جنگِ جمل کے بعد انھوں نے قاتلین عثمانؓ کے بارے میں اپنا رویہ بدل لیا۔

حضرت علیؓ کے پورے زمانہ خلافت میں ہم کو صرف یہی ایک کام ایسا نظر آتا ہے، جس کو غلط کہنے کے سوا چارہ نہیں۔

(خلافت و ملوکیت)

پہلے فریق نے غیر آئینی طریق کا اختیار کیا ہے۔ جسے شریعتِ الہی تو درکنار دنیا کے کسی آئین و قانون کی رو سے بھی ایک جائز کارروائی نہیں مانا جاسکتا۔ اس سے بدرجہا زیادہ غیر آئینی طرزِ عمل دوسرے فریق کا یعنی حضرت معاویہؓ کا تھا۔ انھوں نے ٹھیٹ جاہلیتِ قدیمہ کے طریق پر عمل کیا۔ (خلافت و ملوکیت)

مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرہ برابر تامل نہیں ہے کہ انھوں نے یہ غلطی نیک نیتی کے ساتھ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہوئے کی تھی۔ مگر میں اسے غلطی سمجھتا ہوں، اس کو اجتہادی غلطی ماننے میں مجھے سخت تامل ہے۔ (خلافت و ملوکیت)



اسلام کے پہلے مجدد عمر بن عبدالعزیزؒ کے لئے اموی اقتدار کی جڑوں کو اجتماعی زندگی سے اکھاڑنا اور عام مسلمانوں کی ذہنی و اخلاقی حالت کو خلافت کا بار سنبھالنے کے لئے تیار کرنا اتنا آسان کام نہ تھا، کہ ڈھائی برس کے اندر انجام پاسکتا۔  
(تجدید و احیائے دین)

امام غزالیؒ کے تجدیدی کام میں علمی و فکری حیثیت سے چند نقائص بھی تھے، اور وہ تین عنوانات پر تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ ایک قسم ان نقائص کی جو حدیث کے علم میں کمزور ہونے کی وجہ سے ان کے کام میں پیدا ہوئے دوسری قسم ان نقائص کی جو ان کے ذہن پر عقلیات کے غلبے کی وجہ سے تھے، اور تیسری قسم ان نقائص کی جو تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہونے کی وجہ سے تھے۔

(تجدید و احیائے دین)

امام غزالیؒ کی کمزوریوں سے بچ کر ان کا اصلی کام جس شخص نے انجام دیا، وہ ابن تیمیہؒ تھا، تاہم یہ واقعہ ہے، کہ وہ بھی کوئی ایسی سیاسی تحریک نہ اٹھا سکے جس سے نظام حکومت میں انقلاب برپا ہوتا۔

(تجدید و احیائے دین)

شیخ احمد سرہندیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سید احمد بریلویؒ، اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اپنے اپنے وقت میں تجدیدی کام کیا، مگر یہ لوگ بھی چند اسباب کی بنا پر ناکام رہے۔  
(تجدید و احیائے دین)

جو لوگ مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے اُٹھتے ہیں۔ ان کی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ادنیٰ جھلک تک نظر نہیں آئی، کہیں مکمل فرنگیت ہے کہیں جتوں اور عماموں میں سیاہ دلی اور گندے اخلاق پلٹے ہوئے ہیں۔ زبان سے وعظ اور عمل میں بدکاریاں، ظاہر میں خدمتِ دین اور باطن میں خیانتیں، غداریاں نفسانی اغراض کی بندگیاں۔

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش اول)



شریعتِ اسلامیہ کا اصول اور حدیث ہے۔ کہ  
 ”اپنے مژدوں کی خوبیاں بیان کرو، اور ان کی خامیوں کے ذکر سے باز رہو۔“  
 (ابوداؤد و ترمذی)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ ”العقیدۃ الواسطیۃ“ میں فرماتے ہیں:-  
 ”اس طرح ہمارا ایمان ہے۔ کہ صحابہ میں جو اختلاف ہوا اس کے بیان کرنے  
 سے باز رہیں، ہم جانتے ہیں۔ کہ اس بارے میں منقول ہے۔ اس میں سے بعض چیزیں  
 بالکل جھوٹ ہیں، پر وہ لوگ مجتہد تھے، جن کا اجتہاد صحیح ہوا، ان کو دوہرا ثواب،  
 اور جن سے اجتہادی غلطی ہوئی، نیک کوشش کا ثواب انھیں بھی ملے گا۔“  
 حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔

”ہم بھلائی کے بغیر صحابہؓ کا نام لینے سے زبانوں کو روک رکھیں، وہ  
 دین میں ہمارے امام اور پیشوا ہیں۔ انھیں بُرا بھلا کہنا حرام ہے۔ اور ان کی تعظیم  
 کرنا واجب ہے۔“  
 (تفہیمات الہیہ)

اہانت صحابہ کرام، اور تنقیص علمائے امت کا پہلو بہت ہی افسوسناک ہے، جو مولانا مودودی  
 صاحب کی خود سری اور علوفنسی پر دال ہے۔

خلافت و ملکیت میں موصوف نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے۔ اس کا صاف مطلب شیعوں  
 کی ہمدردی اور حمایت حاصل کرنا ہے۔ مگر وہ اس تنقید و تنقیص کے بعد بھی مقصد حاصل نہ کر سکے۔  
 اسی طرح بعض علمائے امت پر تنقید کا منشا اپنے آپ کو مجدد ثابت کرنا ہے۔ مگر مولانا  
 مجدد تو نہیں متحد و ضرور تھے۔

مولانا کی تشیع پسندی ان کی کتاب ”خلافت و ملکیت“ نے پوری طرح نمایاں  
 کر دی ہے۔ ویسے بھی انھوں نے کبھی اپنی کسی کتاب یا مضمون میں صاف طور  
 پر شیعہ عقائد کا رد نہیں فرمایا۔ کیونکہ موصوف ہر شخص کو اس کے غلط عقائد پر قائم رہتے ہوئے بھی صحیح  
 مسلمان سمجھتے تھے اور صحتِ عقیدہ و عمل کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ بلکہ اصولی اختلافات  
 کو بھی فروغی مانتے ہیں۔



مولانا صاحب کے حواری برابر اس کوشش میں ہیں کہ انھیں مسلمانوں کے ہر طبقہ فکر کی حمایت حاصل ہوتی رہے حتیٰ کہ کشمیریوں کی تائید بھی وہ اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے کئی برسوں سے وہ برابر ایرانی انقلاب اور خمینی کی قیادت و سیادت کی تعریفیں کر رہے ہیں۔ خمینی نوازوں کیساتھ ملے اور میٹنگیں کرتے ہیں۔ ان کے لٹریچر و کتابوں کی تقسیم کا انتظام کرتے ہیں۔ نمائشیں لگواتے ہیں۔ اپنے اخبارات میں ایرانی انقلاب کی تعریف اور خمینی کی قیادت کی تعریفیں کرتے ہیں۔ اور ان کا مقابلہ سعودی عرب اور دوسری مسلم حکومتوں سے کرتے ہیں۔ ایرانی انقلاب کو حقیقی اسلامی انقلاب تصور کرتے ہیں۔

ہندوستان میں سب سے پہلے ہم نے اپنے اخبار مجلہ اہل حدیث اور ترجمان میں اس اتحاد کا پردہ چاک کیا اور یہ ثابت کیا، کہ جماعت اسلامی، روافض اور خمینی کے ساتھ گٹھ جوڑ میں مصروف ہے وہ پردہ اسلامی حکومتوں کے خلاف سازش میں شریک ہے اور اس ملامت کے عوض مادی فوائد حاصل کر رہی ہے۔ اتحاد بین المسلمین کے نام پر جماعت اسلامی، روافض، اور بریلوی متعدد اجتماعات برصغیر، بلکہ بیرون ہند و پاک کر چکے ہیں۔ جن میں وہ اسلامی حکومتوں خصوصاً سعودی عرب کے خلاف پروپیگنڈا کرتے رہے ہیں۔ کئی سالوں سے خمینی ایجنٹ جماعت اسلامی کے تعاون سے مختلف شہروں اور ملکوں میں حج سمینار کے نام سے پروگرام رکھتے ہیں۔ جن کا مقصد سعودی حکومت کے خلاف پروپیگنڈا ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی ہند کی ذیلی تنظیمیں S.I.M وغیرہ ایرانی خمینی نوازوں کے ساتھ پورا تال میل رکھتی ہیں اور ان سے تعاون حاصل کر رہی ہیں۔ ان تمام حقائق کا انکشاف مجلہ اہل حدیث کی متعدد اشاعتوں میں کیا گیا ہے۔

شیعہ، خوارج، روافض بالاتفاق صحابہ کرام تابعین، تبع تابعین، ائمہ کرام، محدثین، اور جمیع علمائے اہل سنت والجماعت گمراہ فرقہ ہیں۔ مگر مودودی صاحب اور ان کی جماعت کی ملامت حسب ذیل اقتباسات میں ملاحظہ فرمائیے۔

مولانا مودودی صاحب اور چودھری طفیل محمد اپنے مبارک بادی کے خط میں رقم طراز ہیں جو ایرانی انقلاب پر خمینی صاحب کو بھیجا گیا تھا۔

خمینی کو مولانا مودودی و میاں طفیل کا پیغام | ایران کے مسلمانوں نے قربانی و ایثار کی نئی



مشعل روشن کی ہے۔

لاہور ۱۳ فروری (نمائندہ جسارت) جماعت اسلامی پاکستان کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی اور امیر جماعت اسلامی پاکستان میاں طفیل محمد نے عالم اسلام کے ممتاز رہنما آیت اللہ روح اللہ الخمینہ کو مبارک باد کا پیغام بھیجا ہے۔ اور ایرانی عوام کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ ایک مشترکہ برقیے میں انھوں نے کہا ہے۔ کہ اس عظیم الشان کامیابی پر جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی ہے، ہم تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اور خدائے بزرگ و برتر سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ایرانی بھائیوں کو اپنے ہر دلعزیز ملک ایران کو صحیح معنوں میں اسلامی جمہوریہ کی شکل میں تعمیر کرنے میں ان کی مدد اور رہنمائی فرمائے۔ اور اس سلسلے میں انکی کوششوں میں خیر و برکت عطا فرمائے، جماعت اسلامی پاکستان کے سکریٹری جنرل قاضی حسین احمد نے ایران کے نو منتخب وزیر اعظم ڈاکٹر مہدی بازرگان کے نام جنرل ضیاء الحق کے مبارکباد کے پیغام پر دلی مسرت کا اظہار فرمایا ہے۔ اور کہا ہے کہ ایران کے مسلمان عوام نے قربانی و ایثار کی نئی مشعل روشن کی ہے۔ جس سے جدید دور میں جہاد اسلامی کا راستہ روشن ہو گیا ہے قاضی حسین احمد نے ایرانی عوام کے جذبہ اسلامی کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایران کے ہزاروں نوجوانوں نے اسلامی جمہوریہ کے قیام کے لئے جو قربانیاں دی ہیں۔ وہ پورے عالم اسلام کیلئے مشعل راہ ہیں۔

(روزنامہ جسارت کراچی ۱۳ فروری ۱۹۷۹ء)

اسی طرح جماعت اسلامی کے آفیشیل آرگن دعوت دہلی میں اس کے مدیر فرماتے ہیں۔

اس وقت شریعت اسلامیہ کے نفاذ کے چار تجربے اپنی مکمل یا ادھوری شکل میں عالم اسلام کے سامنے ہیں۔ ایک تجربہ سعودی عرب کا ہے، جہاں ملوکیت کے زیر سایہ شریعت کو ملکی قانون کے قالب میں ڈھال کر اس کے توسط سے ایک خاص دائرے میں اسلام کے نفاذ کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ سب سے پرانا تجربہ ہے۔ اسے نہ تو مزید پھیلا یا جاسکتا ہے، اور نہ ہی اپنی محدود شکل میں یہ ان تبدیلیوں کو روبہ کار لانے کا وسیلہ بن سکتا ہے جو اسلام کو صحیح معنوں میں سماج اور ریاست دونوں ہی میں سب سے موثر اور رہنما قوت بنانے کے لئے ضروری ہیں، یہ جس شکل



اور جس حد تک ہے، اسے بس گوارا کیا جاسکتا ہے، یہ تجربہ نہ تو اسلام پسندوں کے بلند عزائم کا ساتھ دے سکتا ہے اور نہ ہی اس کے سہائے اسلامی ریاست کے خاکے میں وہ رنگ بھرے جاسکتے ہیں جو اسے جلتی جاگتی حقیقت کے روپ میں عصری سیاسی منظر پر لاکھڑا کریں،

دوسرا تجربہ ایران کا ہے، جہاں عوامی طاقت کے سہائے انقلاب برپا کر کے پرانے نظام کو یکسر ملیا میٹ کر دیا گیا — اور بالکل نئے سرے سے اسلامی نظام حیات کی بساط بچھا رہے ہیں۔ یہ تجربہ اصلاح اور تدریجی تبدیلی کے بجائے انقلاب اور اس کی کوکھ سے جنم لینے والی دو ٹوک تبدیلیوں کی راہ دکھاتا ہے۔ جو موجودہ حالات میں سب سے زیادہ پُر اثر اور پُرکشش نظر آتا ہے — تاہم اس نے پوری دُنیا میں اسلام پسندوں کے دلوں کی امید کی جو جوت جلائی ہے اور اسلامی انقلاب کے امکانات کو جس طرح پوری قوت کے ساتھ ابھارا ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

تیسرا تجربہ پاکستان کا ہے۔ جہاں فوج بیوروکریسی کی مدد سے محدود پیمانے پر نفاذِ اسلام کی کوشش کر رہی ہے۔

چوتھا اور نسبتاً کم عمر تجربہ سوڈان کا ہے، جہاں اسلام کو ایک تدریج کے ذریعے نافذ کرنے کا عمل اپنی تندہی و تیزی کے سبب انقلاب جیسا تاثر پیدا کر رہا ہے۔ ایرانی تجربے کے بعد، یہ تجربہ سب سے زیادہ جاندار اثر انگیز اور خوش آئند امکانات کا حامل نظر آتا ہے۔

(از دعوت ہفتہ وار یکم جنوری ۱۹۸۲ء)

گزشتہ سال جماعت اسلامی کی ایک ذیلی تنظیم ایس آئی ایم (سٹوڈنٹس مومنٹ آف انڈیا) نے دہلی کے رام لیلہ گراؤنڈ میں اپنی کانفرنس منعقد کی، کانفرنس کے انعقاد سے چند دن پہلے اس تنظیم کے صدر ڈاکٹر الیاس رسول صاحب نے پریس کانفرنس منعقد کی، جس میں انھوں نے اپنے پروگرام اور منزل کی نشاندہی فرمائی، موصوف



نے فرمایا، کہ اجلاس میں :

ہندوستانی سماجی بحران اور اسلامی تحریک کے موضوع پر بحث ہوگی۔  
 ایس آئی ایم اسلامی تحریک کا ایک حصہ ہے، لیکن اسلامی تحریک کسی تنظیم  
 رقبہ یا گروپ کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک نظریہ، ایک طرز زندگی اور ایک انقلابی  
 پیغام کا نام ہے۔ ہمارے ملک نے مغربی طرز جمہوریت سیکولرزم، سوشلزم، کے  
 طریقے اپنائے ہوئے ہیں۔ جو لوگوں کی نفسیات سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتے۔  
 جس کی وجہ سے سماج میں تنزل و گراؤٹ آگئی اور بحران پیدا ہو گیا۔ اس وقت  
 ایران کو چھوڑ کر کسی بھی ملک میں صحیح اسلامی نظام نہیں ہے، ان میں پاکستان  
 اور سعودی عرب شامل ہیں۔

اسلامی سیاسی نظام کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے بتایا :  
 کہ اصل حاکمیت صرف اللہ کی ہے، اس کے حکم کے مطابق ایک خلیفہ  
 چلتے ہیں۔ جو قرآن و سنت کی بنیاد پر حکومت کا نظام چلاتا ہے۔

( از قومی آواز - ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۷ء )

مداہنت پسندی کی ایک واضح مثال اس تبصرے میں ملاحظہ فرمائیے، جو جماعت اسلامی  
 کے انگریزی اخبار ریڈینس دہلی کے مدیر جناب امین الحسن رضوی صاحب نے مولانا  
 منظور نعمانی صاحب کی کتاب ”ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت“ پر رسالہ کر سینٹ  
 میں شائع کرایا ہے۔ جس کا ترجمہ سفارت خانہ ایران کے رسالہ ”راہ اسلام اردو“ میں شائع  
 ہوا ہے۔

مگر سوال یہ ہے، کہ یہ کس طرف رہنمائی کی جا رہی ہے، مزید براں یہ موضوع  
 کتاب کے ساتھ کہاں تک انصاف ہے؟ امام خمینی شیعہ ہیں۔ انھوں نے اس  
 کو کبھی نہیں چھپایا اور جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ ایران میں شیعوں کی  
 اکثریت ہے۔ اور یہ وہی تھے جنہوں نے شاہ کی طاغوتی جیم سے جنگ کی،  
 عظیم قربانیاں پیش کیں۔ نتیجتاً کامیاب ہوئے، یہ سب کچھ ان علماء کی رہبری



مگرانی میں ہوا۔ جو شیعہ تھے، لیکن اس تمام عرصے میں کبھی بھی یا اس کے بعد بھی کبھی انھوں نے اس کو شیعہ جہاد یا شیعہ انقلاب نہیں کہا، اور نہ اب اسے وہ شیعہ جمہوریہ کہتے ہیں، ان کا دعویٰ ہے، کہ یہ اسلامی انقلاب ہے، اور ایران اب اسلامی جمہوری ایران کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔

یہ تو فطری بات ہے، کہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ وہ ہی حقیقی اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے سنیوں کا عقیدہ ہے، کہ بس وہ ہی سچے مسلمان ہیں۔ ایک شیعہ اس وقت شیعہ نہیں رہے گا جب اس کا عقیدہ یہ ہو جائے کہ شیعیت حقیقی اسلام کی نمائندگی نہیں کرتی۔ اسی طرح سنی بھی بالمثل ہے۔ (راہ اسلام دہلی)

مندرجہ اقتباسات سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جماعت اسلامی اور بانی جماعت اسلامی تشیع، اور ایرانی انقلاب کے بارے میں مدد اہنت پسندانہ رائے رکھتے ہیں یہاں یہ چند حوالے بطور اختصار درج کئے ہیں۔ ورنہ ان کے اخبارات کی فائل کی فائل رطب اللسانی سے بھری پڑی ہیں۔

جہانگیر شیعہ عقائد کا تعلق ہے۔ ائمہ کرام، محدثین اور علمائے امت ان کے رد میں سینکڑوں کتابیں لکھ چکے ہیں، اور ثابت کر چکے ہیں کہ اہل تشیع کا عقیدہ امامت، غیبت صغریٰ، کبریٰ، ولایت فقیہ، تقیہ کتمان وغیرہ سراسر گمراہی ہیں۔ ان کے خیال میں خلفائے اربعہ بجز حضرت علیؓ ملعون (معاذ اللہ) ہیں، قرآن کریم اور ذخیرہ احادیث چونکہ منافق صحابہ کرام (معاذ اللہ) نے جو دل سے ایمان نہیں لائے تھے، جمع کئے ہیں، اس لئے وہ محرف ہیں، وہ صرف فقہ جعفریہ کو مانتے ہیں، اور سنی ائمہ کرام، علمائے عظام و محدثین کے جمع کردہ ذخیرہ حدیث، تاریخ و آثار کو مشکوک قرار دیتے ہیں، تقیہ کتمان اور منہ ان کے نزدیک عبادت ہیں۔ مندرجہ تمام عقائد ان کی کتب الجامع الکافی، الشافی، کتاب الروضہ، اور خمینی صاحب کی کتب کشف الاسرار، اور تحریر الوسیلہ وغیرہ میں درج ہیں۔ اس لئے ایسے گمراہ فرقے کی حکومت کو اسلامی حکومت قرار دینا خود گمراہی اور اپنے نفس کو دھوکہ دینا ہے، اور دوسرے مسلمانوں



میں گمراہی پھیلانا ہے۔

**اتحاد بین المسلمین کا فلسفہ** | اتحاد بین المسلمین کی اہمیت سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے، لیکن اتحاد بین المسلمین بھی عقائد کی

صحت کی بنیاد پر ہی ممکن ہے مسلمانوں میں متعدد جماعتیں اور مسلک ہیں یہ سارے ہی اتحاد بین المسلمین کی دعوت دیتے ہیں۔ جماعت اسلامی بھی اس بات کی مدعی ہے کہ وہ اتحاد بین المسلمین کی حامی ہے، مگر اس نے اس کے لئے جو راستہ دکھایا ہے، وہ صحیح نہیں۔ اس بنیاد پر اتحاد ممکن نہیں، کہ ہر آدمی اپنے مروجہ عقیدے پر بھی چلتا رہے۔ اور وہ گمراہی ہو، اور پھر اتحاد بین المسلمین کی دعوت بھی دینے لگے۔ کوئی بھی اجتماع، اتحاد، اور اتفاق مرکزیت، مرکزی اصولوں پر چلنے سے ہی ممکن ہے۔ اور وہ مرکزی نقطے اسلام میں توحید اور کتاب و سنت ہیں، انھیں نقطوں پر اتحاد ہو سکتا ہے، کوئی شخص اپنے بنائے ہوئے دین یا شریعت پر مسلمانوں کو جمع نہیں کر سکتا۔ اس لئے اتحاد بین المسلمین کی دعوت دینے والا مسلمان سب سے پہلے خود اپنے تئیں اس بات کو دیکھے کہ وہ ان اصولوں پر کہاں تک عامل ہے، مروجہ زمانہ کے ساتھ ساتھ شخصیتیں جنم لیتی رہیں گی، اور وہ ہر دن اسلام کی نئی نئی تاویلات و تعبیرات پیش کرتی رہیں گی، تنظیم سازی بھی برابر ہوگی، اور ہر ایک اتحاد بین المسلمین کا نعرہ لگائے گا۔ آخر کس کے ساتھ مسلمان اتحاد کریں گے۔

**دینی تعلیم و تربیت سے گریز** | مولانا مودودی صاحب نے چونکہ خود بھی کسی دینی درس گاہ کے توسط سے دینی تعلیم حاصل نہیں کی تھی

اس لئے انہیں دینی تعلیم کے فروغ میں کوئی دلچسپی نہ تھی، بلکہ دینی تعلیم تو کیا غیر دینی میں بھی نہ تھی، ان کا خیال تھا کہ وہ اپنی کتابوں کے ذریعے ہی پورا انقلاب لے آئیں گے اور مسلمانوں کے ذہن بدل ڈالیں گے۔ اس مقصد کے لئے درجنوں اردو کتابیں لکھیں، پھر انھیں میں سے بعض کتب کے ترجمے عربی و انگریزی زبانوں میں دوسرے حضرات سے کرائے اس لئے موصوف کسی بھی دینی درس گاہ کے قیام اور مسلمان بچوں کی دینی و دنیاوی تعلیم و تربیت کے بنیادی اسلامی فریضے سے برگشتہ اور بیزار رہے ہیں اس بیزاری کا ثبوت



موصوف کی درج ذیل تحریروں سے ملتا ہے، علمائے کرام کے خلاف اظہارِ ناراضگی فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

کہیں جبوں اور عماموں میں سیاہ دلی اور گندے اخلاق لپٹے ہوئے ہیں،  
زبان سے وعظ اور عمل میں بدکاریاں، ظاہر میں خدمتِ دین، اور باطن میں  
خیانتیں، غداریاں، نفسانی اغراض کی بندگیاں۔  
(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش امل)

دینی تعلیم گاہوں کے خلاف اظہارِ نفرت فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔  
یہ غریب تعلیم کے لئے جدید درسگاہوں میں جاتے ہیں، تو وہاں زیادہ تر  
مخلص و مکار ملاحدہ یا نیم مسلم و نیم ملحد حضرات سے ان کا پالا پڑتا ہے۔ قدیم مدارس  
کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اکثر مذہبی سوداگروں کے ہتے چڑھ جاتے ہیں۔ دینی  
معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو خطیبوں، واعظوں کی عظیم اکثریت انھیں گمراہ  
کرتی ہے۔

(جماعتِ اسلامی کا مقصد اور لائحہ عمل)

بڑے حیرت کی بات ہے، کہ مرحوم نے تنقید تو دونوں نظام ہائے تعلیم پر فرمادی، مگر خود  
ایک سکول یا مکتب ہی قائم کرنے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی، آخر اللہ تعالیٰ کے ہاں کیا جواب  
دیں گے۔ جب یہ سوال ہوگا، کہ آپ اتنے بڑے داعیِ اسلام تھے؛ دینی تعلیم کی اشاعت کیلئے  
آپ نے کیا کیا!

بہر حال جماعتِ اسلامی ہند تو شاید اس کا تھوڑا بہت جواب دے دے مگر بانیِ جماعت  
اور جماعتِ اسلامی پاکستان تو اس کا کوئی جواب نہ دے سکے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دے گی  
کہ ملتان روڈ لاہور میں منصورہ تعمیر کرایا ہے آخر جس دین اور نظام کے مولانا داعی ہیں بلکہ  
اس کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی تعلیم و تربیت کے کام سے کیوں گریز فرمائے ہیں۔  
یہ ایک اہم ترین سوال ہے، جس کا جواب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اور ان کے  
ہمنوا شاید ہی دے سکیں۔



## مصلحت پسندی اور ابن الوقتی

مولانا مودودی صاحب چونکہ خالق کائنات

کا ترجمہ، اقتدار اعلیٰ فرماتے ہیں۔ اس لئے وہ دین کا مقصد اقتدار کا حصول بتاتے ہیں۔ اور یہی ان کے دینی تصورات و تعبیرات کا محور ہے۔ اقتدار کے حصول کے لئے چونکہ کوئی اصول نہیں ہوتا ہے اور نہ آدمی اس کی پابندی کر سکتا ہے اس لئے مولانا صاحب بھی وقت کے دھاروں کے ساتھ حکمت عملی کا فائدہ اٹھاتے رہے جماعت اسلامی کے دستور کی دفعہ ۵ میں صفِ اول کے اراکین کے بارے میں لکھا تھا۔

ان لوگوں کے لئے احکام شریعت کی پابندی کے معاملے میں کوئی رعایت نہ ہوگی۔ ان کو مسلمانوں کی زندگی کا پورا نمونہ پیش کرنا ہوگا اور ان کے لئے رخصت کے بجائے عہدیت کا طریقہ ہی قانون ہوگا۔

مولانا موصوف مزید تحریر فرماتے ہیں:

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا کوئی اسٹیٹ تو قائم ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی سٹیٹ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ سیاسیات و اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں۔

(از مقالہ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے)

مگر جب ملکی تقسیم کا فیصلہ ہو گیا۔ اور پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا۔ تو یہاں پہنچ کر مولانا کا عمل بدلنے لگا۔ آپ نے گزشتہ سالوں میں مسلم قوم پرستانہ حکومت کی جس قدر مخالفت کی تھی، اور کتابوں و رسالوں کے صفحات سیاہ کئے تھے۔ وہ سب یکسر فراموش کر دیا اور صالح قیادت لانے کے نام پر اپنے ہمناؤں کو الیکشن میں کھڑا کر دیا۔ تاکہ اسمبلی میں کامیاب ہو کر اسلامی حکومت بنائی جاسکے۔ مگر ان الیکشنوں میں جماعت اسلامی کو حیرت انگیز ناکامیاں ہوئیں۔

اس کے بعد صدارتی انتخاب میں صدر ایوب کے خلاف امیدوار کھڑے کرنے کا سلسلہ



آیا۔ اپوزیشن پارٹیوں نے طے کیا کہ صدر ایوب کے مقابلے کے لئے مس فاطمہ جناح کو کھڑا کیا جائے، چنانچہ جماعت اسلامی نے اس بوڑھی ناتواں خاتون کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے بیان جاری کیا۔

شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں ان میں سے بعض کی حرمت تو ابدی ہے جو کسی حالت میں حلت سے تبدیل نہیں ہو سکتی، اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقع پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اب یہ واضح ہے کہ عورت کو امیر بنانے کی ممانعت ان حرمتوں میں سے نہیں ہے جو ابدی اور قطعی ہیں، بلکہ دوسری قسم کی حرمتوں ہی میں اس کا شمار ہو سکتا ہے، اس لئے ہمیں ان حالات کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہئے۔ جن میں یہ مسئلہ پیش آیا ہے۔

(از تجاویز اجلاس شوریٰ)

چنانچہ کارپردازان جماعت اسلامی نے مس فاطمہ جناح کی کامیابی کے لئے سر دھڑکی بازی لگائی۔ جس میں مس فاطمہ جناح ہار گئیں۔

**ابتداء کی حوصلہ افزائی** | ۱۹۶۳ء میں سعودی حکومت نے غلاف کعبہ کی تیاری کے بارے میں فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان میں مولانا صاحب

کے زیر نگرانی تیار کرایا جائے۔ چنانچہ جماعت اسلامی نے اخبارات کے ذریعہ اس کی خوب تشہیر کی، اور عوام الناس کی ضعیف الاعتقادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اعلان کر دیا کہ اس غلاف کی نمائش بذریعہ ٹرین کرائی جائے گی۔ چنانچہ جب یہ غلاف تیار ہو گیا تو اس کو ٹرین میں رکھ کر مختلف شہروں سے گزارا گیا۔ دین سے جاہل عوام مولانا مودودی صاحب اور عہد اسلامی کے زیر نگرانی تیار کرائے ہوئے غلاف کی زیارت کے لئے ٹوٹ پڑے، مولانا صاحب خود بھی بنفس نفیس ٹرین کے ساتھ گھومتے رہے، اس سب کا مقصد آنے والے انتخابات کیلئے زمین ہموار کرنا تھا۔ اس گشتی نمائش کے سلسلے میں جماعت اسلامی کے اخبار الیشیا لاہور کا ادارہ ملاحظہ فرمائیں :



آجکل مغربی پاکستان کے ریلوے سٹیشنوں پر دو سڈیشل ٹرینیں غلاف کعبہ کی زیارت کر رہی ہیں۔ ایک ٹرین لاہور سے پشاور کی طرف منزل بہ منزل ڈال دوں ہے دوسری خاص ٹرین اوکاڑہ منٹگمری کی جانب تشنگان دیدار غلاف کو سیر کر رہی ہیں۔ ہر سٹیشن پر عوام کے ذوق و شوق اور عقیدت و محبت کا عجیب عالم ہے، چھوٹے چھوٹے سٹیشنوں پر لاکھوں کا ہجوم ہوتا ہے، مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے، جسے دیکھے بس ایک نظر دیکھ لینے کی سعادت حاصل کر لینے کو بے تاب ہیں، خواتین غلاف کعبہ پر پھول پھانچاؤں کرتی ہیں۔ بڑے بڑے افسر اور معززین عقیدت سے اس کے حضور دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ چونکہ غلاف کعبہ کو چھونے چومنے کی اجازت نہیں ہے، اس لئے بعض مقامات پر لوگوں نے فرط عقیدت میں ٹرین ہی کو بوسہ دینا شروع کر دیا۔

(ایشیالاہور ۲۸ مارچ ۱۹۶۳ء)

جن حضرات نے مولانا مودودی صاحب کی کتابیں مطالعہ کی تھیں وہ حیرت میں پڑ گئے کہ قرآن و حدیث کی تبلیغ کرنے والا یہ داعی اسلام آخر کیا کر رہا ہے۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ مولانا مودودی ایسے بدعی کام میں ملوث ہو سکتے ہیں۔

فقہی اختلافی مسائل میں مولانا صاحب ہمیشہ سے **”سب اچھا ہے“** کا فارمولہ سب اچھا ہے کا قائل رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اصولی معاملات میں بھی ان کی یہی روش رہی ہے، اور وہ ان سب کو فروغ کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ وہ ایک طرف تقلید کا شدت سے رد کرتے ہیں، اور کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتے کی تبلیغ فرماتے ہیں مگر دوسری طرف تقلید کے بغیر ان کا گزارہ بھی نہیں ہوا، خود حنفی تھے، حنفیت کی تعریف کرتے تھے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

میں خود حنفی طریقے پر نماز پڑھتا ہوں، اگرچہ اہل حدیث، شافعی، مالکی، حنبلی سب کی نماز کو درست سمجھتا ہوں اور سب کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتا ہوں۔

(رسائل و مسائل حصہ دوم)



چاروں فقہ میں سے کسی ایک تقلید کی ترغیب، اور مسلک اہل حدیث کا غلط تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس لئے تمام مسلمان ان چاروں فقہوں کو برحق مانتے ہیں۔ البتہ ظاہر ہے کہ ایک معاملے میں ایک ہی طریقے کی پیروی کی جاسکتی ہے، چار مختلف طریقوں کی پیروی نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے اکثر علما کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ کسی خاص فقہ کی پیروی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ علم والے آدمی کو براہ راست قرآن و حدیث سے احکام معلوم کرنے چاہئیں۔ اور جو لوگ علم نہ رکھتے ہوں، انھیں چاہئے کہ جس عالم پر بھی اطمینان ہو، اس کی پیروی کریں، یہ اہل حدیث کہلاتے ہیں۔ اور اوپر کے گروہوں کی طرح یہ بھی حق پر ہیں۔  
(رسالہ دینیات)

مولانا صاحب کا تضاد ملاحظہ فرمائیے، اوپر تو فرمایا کہ ایک معاملے میں ایک ہی طریقے کی پیروی کی جاسکتی ہے۔ مگر نیچے امام طحاوی کے قول المتنقل من مذہب الی مذہب باجتماعہما و برہان آئندہ مستوجب التغییر پر محکم فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

میرے نزدیک ایک صاحب علم کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے کچھ شدید تر چیز ہے، مگر یاد رہے کہ اپنی تحقیق کی بنا پر کسی ایک سکول کے طریقے اور اصول کا اتباع کرنا اور چیز ہے۔ اور تقلید کی قسم کھا بیٹھنا بالکل دوسری چیز! اور یہی آخری چیز ہے، جسے میں صحیح نہیں سمجھتا، رہا طحاوی کا وہ فتویٰ جو آپ نے نقل کیا ہے۔ تو وہ خواہ کتنے ہی بڑے عالم کا لکھا ہو، میں اس کو تابل تسلیم نہیں سمجھتا، میرے نزدیک ایک فقہی مذہب سے دوسرے مذہب فقہی میں انتقال صرف اس صورت میں گناہ ہے، جبکہ یہ نقل خواہش نفس کی بنا پر ہو، نہ کہ تحقیق کی بنا پر۔  
(رسائل و مسائل حصہ اول)

مندرجہ تقابل میں مولانا صاحب نے تاویل کی حد کر دی ہے، مولانا خود عالم اور مفسر قرآن ہیں پھر بھی حنفی مذہب کی تقلید کرتے رہے، جبکہ عالم کے لئے تقلید کو خود ہی ناجائز اور



گناہ لکھتے ہیں۔ تاویل کے ذریعے اسے اپنے لئے جائز بھی کر گئے۔  
 احناف و اہل حدیث دونوں کو خراب مگر بالآخر تقلید کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔  
 امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام مالک کے مذہب میں بہت سے ایسے  
 مسائل ہیں جن پر اہل حدیث کی طرف سے اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ حدیث کے  
 خلاف ہیں، اور ان ائمہ کے پیروؤں کی طرف سے ان اعتراضات کے جوابات  
 بھی دیئے گئے ہیں جو شخص خود علم رکھتا ہو، اور جس میں خود اجتہاد کی صلاحیت  
 موجود ہو، وہ فریقین کے درمیان محاکمہ کر سکتا ہے۔ اور اسے حق ہے، کہ حدیث سے  
 جس طریق کو ثابت پائے اسے اختیار کرے، لیکن یہ عام اہل حدیث جو ان  
 مسائل پر بحث کرتے پھرتے ہیں، انکا حال عام حنفیوں سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے  
 ان کا علم بھی ویسا ہی تقلیدی ہے جیسا حنفیوں کا ہے۔ یہ اپنے ائمہ و علماء پر اعتماد  
 کرتے ہیں۔ اور حنفی اپنے ائمہ و علماء پر، ان میں خود اجتہادی قابلیت نہیں، نہ یہ  
 احادیث کا اتنا علم اور اصول میں اتنی بصیرت رکھتے ہیں کہ احکام کی تحقیق کر سکیں  
 ان کا یہ کہنا ہے کہ فاتحہ خلف الامام، یا رفع الیدین، یا آمین بالجہر حدیث سے  
 ثابت ہے اور اس کے خلاف ثابت نہیں ہے۔ دراصل تقلید کی بنیاد پر ہے،  
 نہ کہ اجتہاد کی بنیاد پر، لہذا ان کے جواب میں خاموشی بہتر ہے، البتہ جو علم رکھتے  
 ہیں۔ وہ ان مسائل پر بول سکتے ہیں۔

(رسائل و مسائل حصہ اول)

ویسے تو مولانا صاحب کا یہ پورا ہی اقتباس بہت دلچسپ ہے، مگر یہ جملہ خوب ہے۔  
 ”در اصل تقلید کی بنیاد پر ہے، نہ کہ اجتہاد کی بنیاد پر“ خدا جانے مولانا کے نزدیک  
 تقلید و اجتہاد کی کیا تعریف ہے۔

سب اچھا ہے۔ کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔ تراویح کے بارے میں فرماتے ہیں :  
 ان امور پر اگر غور کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے، کہ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم  
 نے آٹھ رکعتیں ہی پڑھی ہیں۔ لیکن صحابہ و تابعین نے بالعموم حضور کے اس



فعل کا مطلب یہ نہیں لیا، کہ آٹھ رکعت پڑھنا ہی سنت ہے، اور اس سے زائد پڑھنا خلاف سنت یا بدعت ہے، آخر یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے۔ کہ صحابہ کرام اور تابعین اور ائمہ مجتہدین سنت اور بدعت کے درمیان تمیز کرنے کی اہلیت سے اس درجہ محروم تھے۔ یا جان بوجھ کر وہ سنت کو چھوڑ کر ایک بدعت کو اختیار کر سکتے تھے۔ بہر حال اگر کوئی شخص حضور کے اس فعل کو اس معنی میں لیتا ہو، کہ آپ کا منشا آٹھ رکعت ہی کی سنت کی حیثیت سے جاری کرنے کا تھا، تو شوق سے اس پر عمل کرے، اور جو اس معاملے میں اس کے ہنجیال ہیں وہ اس کی پیروی کریں، لیکن بین رکعت کے دلائل اتنے کمزور نہیں ہیں، کہ اسے خلاف سنت قرار دینا اتنا آسان ہو جتنا سمجھ لیا گیا ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ سوم)

سنا آپ نے حضرت والا کا فرمان مبارک! یعنی ایک طرف تو خود یہ تسلیم کرتے ہیں۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ ہی رکعتیں پڑھی ہیں۔ دوسری طرف اس کی بے جاتا و بلیس کر رہے ہیں۔ کہ یہ مطلب نہیں تھا اور وہ نہیں تھا۔ پھر آخر میں یہ بھی کہہ دیا کہ ۲۰ رکعت کے اتنے کمزور دلائل نہیں کہ اسے خلاف سنت قرار دینا اتنا آسان ہو جتنا سمجھ لیا گیا ہے۔

مولانا کے اس تجزیے کے بعد تو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہی پڑھ لینا چاہیے۔ جب اتنے بڑے مفکر اسلام کی وسعت نظری کا یہ حال ہے، تو بیچارے ضدی کٹھ ملا جنہوں نے فقہ اور بزرگوں کے اقوال کے علاوہ کچھ پڑھا اور سنا ہی نہیں ہے۔ وہ کیا کریں اور کہیں گے۔ وہ تو یقیناً ۲۰ کی تعداد کو غیر مسنون کہنے اور سننے پر آگ بگولہ ہو جائیں گے اور لٹھ لیکر مارنے کو دوڑیں گے۔ دو سال پہلے بہار میں (بلسلہ تراویح) ایک حامی سنت کی شہادت ہو چکی ہے۔ تراویح کے سلسلے میں مولانا مودودی صاحب کے موقف کو دیکھ لینے کے بعد ان کی ”سب اچھا ہے“ کی پالیسی پوری سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور پختہ یقین ہو جاتا ہے کہ موصوف کتاب و سنت کا محض نعرہ دیتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے، جو کھلی ہوئی مداخلت و منافقت ہے۔ اصول اپنی جگہ اصول ہے، اسے تسلیم



کیا جانا چاہیئے اور اس پر عمل بھی ہونا چاہیئے۔

تراویح نفل نماز ہے۔ ایک مسلمان اس کی چاہے جتنی رکعتیں ادا کرے، جیسا کہ بعض ائمہ کرام اور علمائے سلف ادا کرتے رہے ہیں۔ مگر اس بات کا تو اقرار کرے، کہ نبی اکرم صلی اللہ وسلم سے صرف آٹھ، گیارہ، تیرہ رکعت ہی ثابت ہیں۔ اور سنت وہی ہے جو آپ سے ثابت ہو۔

اس مختصر جائزے کے بعد ہر متبع کتاب و سنت مسلمان کی سمجھ میں آ جانا چاہیئے کہ مودودی صاحب نے جماعت سازی اور اس کے لئے مصنفات کا ایک عظیم دفتر تو ضرور قائم کیا ہے۔ مگر ان کی دینی تفہیم و تشریح اور طریق کار، سلف صالحین (صحابہ کرام، تابعین، ائمہ، محدثین) سے قطعاً مختلف ہے۔ اس میں تجدّد، اعتزال، تخفیف حدیث وغیرہ کے جراثیم بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس لئے اس سے حقیقی اسلامی معاشرہ تشکیل نہیں پاسکتا۔ جب اسلامی معاشرہ تشکیل نہیں پائے گا تو حکومت الہیہ کس طرح وجود میں آجائے گی۔

Irfaan Jani  
Sarfina Bani 123@gmail.com